بانو قدسیہ کے ناولوں میں اقدار کی شکست و ریخت کا تحقیقی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

نادیہ جلیل

اسسٹنٹ پروفیسر

ایف جی پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین،

کشمیر روڈ، راولپنڈی

نگرانِ کار:

ڈاکٹر رشید امجد

شعبۂ اُردو

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،

اسلام آباد

شعبۂ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۰۹ء

بسم الله الرحمن الرحيم

بانو قدسیہ کے ناولوں میں
اقدار کی شکست و ریخت کا تحقیقی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

نادیہ جلیل

اسسٹنٹ پروفیسر

ایف جی پوسٹ گریجوایٹ کالج برائے خواتین،

کشمیر روڈ، راولپنڈی

نگرانِ کار:

ڈاکٹر رشید امجد

شعبۂ اُردو

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،

اسلام آباد

شعبۂ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۰۹ء

انتساب

اُن رشتوں کے نام
جن کے حصے کا وقت
میں نے تحقیق پر صَرف کیا

فہرست

پیش لفظ

میں نے اپنے مقالے کے پہلے باب میں فرد، معاشرے اور اِقدار کے باہمی رشتے کو موضوع بنایا ہے۔ ہر چند یہ عمرانیات اور نفسیات کے دائرۂ کار میں آتا ہے، لیکن ادب تو زندگی کا ہمزاد ہے اور زندگی ہر سطح اور انسان ہر زاویے سے اس کا موضوع رہا ہے۔ جبکہ فرد اور معاشرے کی زندگی میں اقدار خون کی گردش کی طرح رواں دواں رہتی ہیں۔ خواہ یہ مادی اقدار ہوں یا اخلاقی، منفی اور مثبت دونوں صورتوں میں ان کی اثر پذیری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے کردار، اقدار و روایات، رسم و رواج اور مذہب و فلسفہ کی مٹی سے فکر و نظر کا خمیر اٹھاتے ہیں۔ انسانی قلب و ذہن کے رجحانات اقدار کے بیج سے نمو پاتے ہیں۔ انسان کے جذباتی رویے، طرزِ احساس اور طرزِ خیال، اس کے عمل اور ردّ عمل، اس کی پسند و ناپسند نہ صرف اقدار سے زندگی اخذ کرتے ہیں بلکہ اقدار ہی کی ذرہ بکتر پہن کر زندگی کے معرکوں میں نبرد آزما رہتے ہیں۔ معاشرے میں اقدار کی اہمیت کے پیشِ نظر تحقیق کا بنیادی نکتہ اقدار کا مطالعہ بھی ہے۔

بانو قدسیہ مخصوص افکار و خیالات کی حامل فنکارہ ہیں۔ ان کے ناول زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور ذہنی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مقالہ میں تحقیق کا بنیادی سوال یہ ہے کہ آج کل فرد اور معاشرہ جس ذہنی و جذباتی انتشار اور اخلاقی زوال کا شکار ہے، کیا ایک حسّاس فنکارہ کی حیثیت سے بانو قدسیہ اس المیے کو تخلیقی سطح پر محسوس کرتی ہوئی نظر آتی ہیں؟ عصری انتشار کی نوعیت ان کے ہاں کیا ہے اور فکری سطح پر زندگی کے تئیں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

بانو قدسیہ اپنے ناولوں میں اقدار کی شکست و ریخت اور فرد اور معاشرے پر اس کے اثرات کا احاطہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ انسان کی فکری و جذباتی کج روی کو عصری انتشار اور معاشرتی زوال کے تناظر میں دیکھتی ہیں۔ ایک طرف وہ عہدِ حاضر کے انسان کے کرداری زوال کو اخلاقی و مذہبی اقدار کی شکست و ریخت کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں تو دوسری طرف اخلاقی اقدار سے عاری مادہ پرست معاشرے کے روحانی زوال کو رزقِ حرام کے فروغ پانے کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں مردار خوری انسان کی فطرت بن چکی ہے۔ وہ مادی ترقی کے مقابلے میں فلاح کا نظریہ پیش

کرتے ہوئے اس میں انسان کے روحانی اور مادی مسائل کا حل تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ کے تینوں ناولوں کا تحقیقاتی مطالعہ ان کے فکری ارتقاء کو بتدریج ہمارے سامنے لاتا ہے۔ ''شہرِ بے مثال'' سے چل کر ''راجہ گدھ'' سے گزرتے ہوئے وہ ''حاصل گھاٹ'' تک پہنچتے پہنچتے فکر و نظر کی کئی منزلیں طے کرتی ہیں۔

''شہرِ بے مثال'' سے انہیں بدلتی ہوئی سماجی اقدار اور اس سے پیدا ہونے والے نئے طرزِ احساس اور طرزِ فکر کے منفی اثرات کا ادراک ہو چکا تھا۔ وہ اپنے فکری تجربے کو زندگی کے واقعات میں سمو کر ہمیں آنے والے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک دیہاتی لڑکی کی سرگذشت بیان کرتی ہیں۔ زندگی کا گہرا شعور رکھنے کے باوصف وہ اپنی باریک بینی اور دور اندیشی سے آنے والے معاشرتی اور اخلاقی زوال کو پیش از وقت دیکھ رہی تھیں۔ رشیدہ میر کی داستان کو مادہ پرستی اور اِقدار کی شکست و ریخت کا استعارہ بنا کر خبر دار کیا گیا تھا کہ اخلاقی قدروں سے کٹ کر مادی اقدار اپنا لینے سے انسان کبھی بھی سکونِ قلب اور حقیقی مسرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

''راجہ گدھ'' تک پہنچ کر اُن کا خیال پختہ یقین میں بدل چکا تھا کہ مادی قدر کو اپنا کر انسان فکری و جذباتی اور جسمانی و روحانی شکستگی سے نہیں بچ سکتا۔ وہ فرد اور معاشرے کے اخلاقی و روحانی زوال کے محرکات میں سے رزقِ حرام کو سب سے بڑا سبب قرار دیتی ہیں۔ وہ آگاہ کرتی ہیں کہ اگر انسان اور معاشرہ اخلاقی و روحانی اقدار کی سچائی اور اُن کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کر کے زندگی میں مناسب جگہ نہیں دیتا تو پھر ایسے معاشرے کو اِنتشار اور زوال پذیری سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے کے افراد تضادات، ذہنی و جسمانی ابتری اور جذباتی شکستگی کا شکار ہو کر تنہائی کے خلاؤں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔ وہ منشیات اور جنس کا سہارا لے کر اس تنہائی سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسے افراد کا مقدر پاگل پن اور خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

بانو قدسیہ ایک منضبط شخصیت کے طور پر ابھرتی ہیں جو اپنے فکری، قلبی اور باطنی تجربات کو ایک ہی نگاہ سے دیکھ سکتی ہیں۔ آخری ناول ''حاصل گھاٹ'' میں وہ خوش اعتمادی اور پختہ یقین کے ساتھ اس خیال کو پیش کرتی ہیں کہ شعوری ناپختگی ہجرت کے عمل کو پچھتاوے سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ''شہرِ بے مثال'' میں بھی ہجرت کے اس پہلو کو بیان کیا گیا تھا لیکن اب ان کی بڑھتی ہوئی ژرف نگاہی، زندگی کے گہرے شعور، مذہب سے قلبی لگاؤ، تصوف سے بڑھتی ہوئی دلچسپی اور مشرقی اقدار و روایات سے وابستگی ان کے نقطۂ نظر کو قطعیت عطا کرتی ہے۔

بانو قدسیہ کے نزدیک ہجرت کا ثمر، اقدار و روایات اور مذہب کے خون سے زہرناک ہو جاتا ہے۔ اپنی شناخت

کھو کر اور مذہب سے ہاتھ دھو کر جو مادی ترقی حاصل ہو گی وہ اطمینان، سکونِ قلب اور شانتی کے بغیر ہو گی۔ ایسی ہجرت صرف خسارہ اور تنہائی کا روگ لے کر آئے گی۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ صرف وہی انسان خود کو عصری انتشار اور جدّتِ شہر کے فتنے سے بچا سکتے ہیں جو مادہ پرستی سے منہ موڑ کر مذہبی اور روحانی اقدار سے رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ یہی انسان ہیں جنھیں اس دنیا میں ہی اطمینان، سکونِ قلب اور شانتی کی منزل حاصل ہو جاتی ہے۔

مقالہ لکھنے کا عرصہ بہت طوالت اختیار کر گیا، اس کی وجہ میری یہ کوشش تھی کہ اپنی ذمہ داریوں اور علمی شوق کے درمیان توازن قائم رکھ سکوں۔ دورانِ تحقیق بہت سے نازک مرحلے آئے جہاں تحقیقی کام بوجھ محسوس ہونے لگا۔ لیکن صرف خدا کے سہارے کی رسّی تھام کر میں یہاں تک آ پہنچی۔ اس کی شکر گزاری تو ہر لمحے کے ساتھ ہے۔

میں اپنی خاندانی اور نجی زندگی کے اس ماحول اور اس کے پرورش کرنے والوں کی احسان مند ہوں جس نے میرے لیے یہ گنجائش پیدا کی کہ میں اپنا وقت اور توجہ تحقیق کے کام پر صَرف کر سکوں۔

اپنی استاد محترمہ ڈاکٹر شاہین مفتی صاحبہ کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کے ابتدائی مراحل میں میری ذہنی تربیت کی۔ جناب ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی فکری رہنمائی نے میرے لیے تحقیقی کام کی دشواریوں کو بے حد آسان بنا دیا۔ میں اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں اپنے شعبۂ اُردو، شعبۂ نفسیات اور کالج لائبریری کے سٹاف کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے تعاون سے نوازا۔ سب سے بڑھ کر دوستوں کی پُر خلوص دعاؤں کا شکریہ جو دورانِ تحقیق میرے ساتھ رہیں۔

مقالہ نگار

نادیہ جلیل

بابِ اوّل

اقدار

اقدار کی تعریف

معاشرے میں رہتے ہوئے انسان کو قدم قدم پر اپنے رویوں کو متعیّن کرنے کے لیے انتخاب اور فیصلے کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم اپنے اِردگرد کے ماحول کے مطابق انتخاب، فیصلے اور ردِّ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اقدار صحیح اور غلط کو پَرکھنے کے وہ پیمانے ہیں جو ہمارے انتخاب اور فیصلوں کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ قدر وہ عمومی تصور ہے جو کسی معاشرے کے افراد میں اچھائی اور بُرائی کے مشترکہ معیار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی تصور پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے درمیان حدّ فاصل قائم کرتا ہے۔ معیار کے اسی عمومی تصور کی بنا پر کوئی صورتِ حال اعلیٰ و ارفع قرار پاتی ہے اور کوئی پستی کی حامل نظر آتی ہے۔

رابن. ایم ولیمز اپنے مضمون ''Individual and Group Values'' میں لکھتے ہیں:

"We have define values as those conceptions of desirable states of affairs that are utilized in elective conduct as criteria for reference or choice or as justifications for proposed or actual behaviour."(۱)

''Individual in Society'' کے مصنّفین اقدار کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Beliefs about what is a desirable or a "good" (e.g. free speech) and what in an undesirable or a "bad" (e.g. dishonesty)."(۲)

معاشرے میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ کا تصور موجود ہونے کے باوجود ضروری نہیں کہ افراد پسندیدہ اقدار کو اپناتے بھی ہوں، وہ اصولی طور پر بعض اقدار کو مثبت اور پسندیدہ تو سمجھتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثلاً ایمانداری اور مساوات کی مثبت اقدار پر یقین رکھنے کے باوجود افراد اِن اقدار کو اپنی زندگیوں میں اپنا نہیں سکتے۔ گویا اقدار پر یقین رکھنا الگ بات ہے اور اُن کو اپنی روزمرّہ زندگی کا حصہ بنانا دوسری بات۔ ایسی اقدار کو ہم مثالی اقدار کہہ سکتے ہیں۔

یہ بات مدّنظر رہے کہ کوئی بھی قدر ہر طرح کی صورتِ حال میں قابلِ عمل نہیں ہوتی۔

دنیا کے مختلف سوشیالوجسٹ اور ماہرینِ نفسیات اقدار کے بارے میں کیا کہتے ہیں، فروا داؤد کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے:

"According to Murray (1938), values can be regarded as the cognitive representation of the internal "needs" medicated by external presses." Hull (1945) like some other ... behaviourist psychologists argued values to be predictable and evenly observable, and believe if science of moral judgment or behaviour could be originated. Values serve as basis for determining right and wrong. Supported this view also by Hartmann (1940) and Cattle (1940) … Williams (1970) regarded values as "learned standards" that are employed to guide action; to guide us to positions taken on religious issues. According to Goffiman (1950) values guide us for self-preparation. Values as viewed Fastener (1954) are to judge others and evaluate us from others; not only with respect to competence but also with respect to morality."(۳)

اقدار لچک پذیر ہیں، وقت اور حالات کے ساتھ ان میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔ اقدار منفی اور مثبت دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔

اقدار کی درجہ بندی

اقدار اِنفرادی، گروہی اور خاندانی ہوتی ہیں۔

انفرادی اقدار (Personal Values)

معاشرے میں اچھائی اور بُرائی کے عمومی تصورات پر یقین رکھنے کے باوجود انہیں اپنی روزمرّہ زندگی کا حصہ بنانا فرد کی صوابدید پر ہے۔ وہ معاشرے کی بعض اقدار کو اپناتا ہے اور بعض کو رَد کر دیتا ہے۔ وہ اپنی منتخب کردہ اقدار کو ہی اپنی زندگی کا حصہ بناتا ہے اور انہی کی روشنی میں اپنا نصب العین اور اپنے اہداف مقرر کرتا ہے۔

"Personal values evolve from circumstances with the external world and can change over time. Integrity in the application of values refers to its continuity; persons have integrity if they apply their values appropriately regardless of arguments or negative reinforcement from others. Values are applied appropriately when they are applied in the right area. For example, it would be appropriate to apply religious values in time of happiness as well as in times of despair.

Personal values are implicitly related to choice. They guide decisions by allowing for an individual's choices to be compared to each choice's associated values.

Personal values developed early in life may be

resistant to change. They may be derived from those of particular groups or system, such as culture, religion, and political party. However, personal values are not universal; one's family, nation, generation and historical environment help determine one's personal values. This is not to say that value concepts themselves are not universal, merely that each individual possess a unique conception of them i.e. a personal knowledge of the appropriate value for their own genes, feelings and experience."(۴)

گروہی اقدار (Group Values)

عام روزمرّہ زندگی میں فرد کو کئی طرح کے سوالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ان سوالوں کے جواب دینے اور فیصلوں کے لیے وہ جن پیمانوں کی مدد لیتا ہے، اُن میں سے بعض بہت انفرادی ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر یہ معاشرے کے وضع کردہ ہوتے ہیں۔ان پیمانوں کا ادراک ہم اس معاشرتی گروہ سے کرتے ہیں جن سے ہمارا تعلق ہوتا ہے یا جن سے ہم تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

"The explicit and implicit ideas shared by the group together with their relative priorities and integrating patterns. That is like beliefs, the values held by members of a social group tend to form a coherent system."(۵)

حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ افراد گروہی اقدار پر کس حد تک انحصار کرتے ہیں، لیکن ماہرینِ سوشیالوجی کی طرف

سے کیے گئے تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زیادہ تر لوگ ماہرین اور اُس معاشرتی گروہ کے لوگوں کی رائے کو بہت اہمیت دیتے ہیں جن سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔قدر و قیمت جانچنے کا یہ عمل آفاقی ہے لیکن وہ معیارات جن پر افراد، اشیاء اور واقعات کو پَرکھتے ہیں، ہر کلچر میں مختلف ہوتے ہیں۔معاشرتی گروہ سے اخذ شدہ یہ معیار اور کسوٹی گروہی اقدار (Group Values) کہلاتی ہیں۔

خاندانی اقدار (Family Values)

"The moral and social values traditionally maintained and affirmed within a family."(۶)

"Family value is the concept that most parents want to instill in their children identified with this term strong respect for others, discussing differences and helping others in need, maintaining one's personal integrity and sticking with something as maintaining loyalty while building one's character."(۷)

انسان اپنی زندگی میں جن اقدار کو اپناتا ہے اُن کا بہت بڑا حصہ وہ اپنے خاندان سے حاصل کرتا ہے۔خاندان وہ ادارہ ہے جہاں افراد کے لیے اخلاقی معیار طے کیے جاتے ہیں، مشترکہ بھلائی کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور سماجی زندگی گزارنے کا نظام وضع کیا جاتا ہے۔عام طور پر شادی بیاہ کے معاملات، بچوں کی تعلیم و تربیت، گھر میں عورت کا مقام، مذہبی نقطۂ نظر جیسے معاملات پر خاندانی طرزِ فکر پایا جاتا ہے۔یہی طرزِ فکر خاندانی طرزِ فکر کو جنم دیتا ہے۔عام طور پر بچوں میں وہی اخلاقی و سماجی اقدار پائی جاتی ہیں جن کی پیروی اُن کے والدین کر رہے ہوتے ہیں۔یہ خاندانی اقدار جہاں نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں وہاں ان میں رفتہ رفتہ تبدیلی بھی واقع ہوتی رہتی ہے۔

اقدار کی اقسام

تہذیب وثقافت اور اخلاقیات انسانی اقدار کے سرچشمے ہیں۔اسی لحاظ سے ہم انہیں دو بڑی اقسام میں بانٹ سکتے ہیں:

ا۔	معاشرتی اقدار	الف:	ثقافتی اقدار
۲۔	اخلاقی اقدار	ب:	مذہبی اقدار

معاشرتی قدار

جان.ایم شیپرڈ معاشرتی اقدار کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"General cultural principles embodying standards for thinking, feeling and behaving that evoke deep emotional commitment."(۸)

معاشرتی اقدار طرزِ فکر واحساس کے وہ عمومی تصور ہیں جنہیں مسلّمہ معاشرتی اصول اور ضابطے تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن وہ رسم ورواج اور روایات جنہیں اخلاقی ضابطوں کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے، ان کی روحِ رواں اقدار ہی ہوتی ہیں۔

معاشرتی اقدار کو افراد اپنی معاشرتی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔اس میں وہ جدید ترین اقدار شامل ہیں جنہیں ثقافتی تبدیلی کے نتیجے میں معاشرے نے قبول کیا ہو۔معاشرتی اقدار میں ہمارے ہاں روایتی اقدار کے علاوہ جدید اقدار بھی صنعتی وحرفی ترقی کے ساتھ آتی ہیں۔ان میں جدید سائنسی وفنّی علوم حاصل کرنا، معیارِ زندگی بلند کرنا، معاشی وسائل بڑھانا، بہتر مکان جس میں جدید سہولتیں موجود ہوں، بہتر لباس جس میں جدت پائی جائے، آمدورفت کے جدید ذرائع حاصل کرنا، خاندانی وقار کے لیے اونچے خاندان میں رشتہ داری، حکمران پارٹی میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنا وغیرہ۔خلاصہ یہ کہ وہ اقدار جن کا رواج ہماری معاشرتی زندگی میں پایا جائے۔

"Values emerge out of the concrete realities of day-to-day living and are shaped by the institutional

structures that organize major sphere of social activity."(۹)

شیخ محمد اکرام سماجی اقدار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کسی معاشرے میں روابط، سلوک، اخلاق و عادات، طرزِ بود و ماند، رسم و رواج، حسن و جمال اور فن و اظہارِ فن کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کے سماجی اقدار کہلاتے ہیں۔ان کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات ہوتی ہیں۔معاشرے کی کسب وجہد ہوتی ہے۔اس کے تجربے اور مشاہدے ہوتے ہیں۔اس کا جمالیاتی ذوق ہوتا ہے، اور ان سب کے قوام سے سماجی قدریں رفتہ رفتہ تشکیل پاتی ہیں۔معاشرے کے افراد اِن قدروں کی حتی الوسع پابندی کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں تو اِن قدروں پر بڑی سختی سے عمل ہوتا تھا اور اِن سے انحراف کرنے والوں کو قبیلہ ہی سے خارج کر دیا جاتا تھا۔مثلاً عربوں کی قبیلہ داری نظام کی بنیاد ''عصبیت'' یعنی قبیلہ سے وفاداری پر تھی۔اور یہ وفاداری اتنی غیر مشروط تھی کہ اگر قبیلہ کسی کو حکم دیتا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو تو وہ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا تھا......بعض سماجی قدریں اپنے عہد کی قریب قریب سبھی تہذیبوں میں مشترک ہوتی ہیں۔مثلاً جن دنوں غلامی کا رواج نہیں ہوا تھا تو جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا کیونکہ معاشرہ قیدیوں کے روٹی پانی کی کفالت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ان کو آزاد چھوڑ سکتا تھا۔اس وقت انسانوں کا یہ خونِ ناحق اخلاقی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا، بلکہ معمولات میں شامل تھا۔لیکن جب فتح مندوں کو یہ احساس ہوا کہ جنگی قیدیوں سے روٹی کپڑے کے عوض مشقت کے سخت سے سخت کام لیے جا سکتے ہیں اور اِن کی مدد سے پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے تو اُن کے قتل کرنے کا رواج ترک کر دیا گیا اور اُن کو غلام بنا لیا گیا۔اب غلام اور کنیزیں آقاؤں کی ذاتی ملکیت بن گئیں اور اُن کی خرید و فروخت معمولات میں شامل ہو گئی۔حتیٰ کہ افلاطون اور ارسطو جیسے اخلاقیات کے مبلّغین کو بھی غلامی میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔

مگر سماجی رشتوں کی بعض غیر پیداواری قدریں بھی مشترک ہوتی ہیں۔مثلاً راست بازی،

مہمان نوازی، رحمدلی، عدل وانصاف، مظلوم کے ساتھ ہمدردی، فن کاروں کی عزت، عالم فاضل بزرگوں کا احترام، شعروشاعری اور گانے بجانے کا شوق، شادی بیاہ کی تقریبوں میں خوشی اور غمی یا موت پر افسوس کا اظہار، یہ قدریں کم وبیش سب تہذیبوں میں رائج ہوتی ہیں، البتہ ان کے برتنے کے انداز اور قاعدے جداگانہ ہوتے ہیں۔

معاشرتی ماحول اور سماجی حالات میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ان کا اثر قدروں پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں عرب قوم میں مروّت کو انسانیت کا جوہر خیال کیا جاتا تھا لیکن آج آپ کو بغداد، جدہ، دمشق، قاہرہ اور بیروت میں کہ عرب تہذیب کے مراکز ہیں، احساسِ مروّت نام کو نہیں ملتا، بلکہ سود وزیاں کا وہی کاروباری اور بے مروّت ماحول جو دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی سرشت ہے، اب عرب معاشرے میں بھی سرایت کر گیا ہے۔

بسا اوقات ایک ہی معاشرے میں سماجی قدروں کے مختلف پیمانے رائج ہوتے ہیں۔ مثلاً پدری نظام میں اخلاقی پیمانہ عورتوں کے لیے مردوں سے جدا ہوتا ہے۔ چنانچہ عصمت اور پاکبازی ہمارے معاشرے میں فقط عورت کا زیور ہے۔عورت میں اگر یہ وصف نہ ہو تو ہم اسے بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں۔ البتہ مرد کا محاسبہ اس سختی سے نہیں ہوتا۔ حالانکہ جنسی تعلقات میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کی ذمہ داری مساوی ہو۔مگر مرد کنیز کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے، عورت اپنے غلام کے ساتھ مباشرت نہیں کرسکتی۔

اسی طرح طبقاتی معاشرے میں عام آدمیوں اور اونچے طبقوں کے لیے سماجی قدروں کے پیمانے جدا جدا ہوتے ہیں۔''(۱۰)

ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ تہذیب جب طبقوں میں بٹ جاتی ہے تو خیالات کی نوعیت بھی طبقاتی ہو جاتی ہے۔اور جس طبقے کا غلبہ معاشرے کی مادّی قوتوں پر ہوتا ہے، اسی طبقے کا غلبہ ذہنی قوتوں پر بھی ہوتا ہے۔یعنی معاشرے میں اسی کے خیالات وافکار کا سکّہ چلتا ہے۔مثلاً اشرافیہ تہذیب میں ایفائے عہد، شجاعت، سخاوت، مہمان نوازی اور عزت داری کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، کیونکہ اشرافیہ کی بقا کے لیے ان تصورات پر عمل کرنا بہت ضروری تھا۔لیکن صنعتی

تہذیب میں جب سرمایہ دار طبقے کا غلبہ ہوا تو اِن تصورات کی پرانی افادیت باقی نہ رہی۔ ان کی جگہ آزادی، مساوات، جمہوریت کے تصورات نے رواج پایا، کیونکہ یہ تصورات سرمایہ دار طبقے کے لیے مفید تھے اور اِن تصورات کو مقبولِ عام بنائے بغیر سرمایہ دار طبقہ اشرافیوں کو اقتدار کی کرسی سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔

مگر طبقاتی تہذیبوں میں ٹکسالی افکار و عقائد کے خلاف ''باغیانہ'' خیالات کی تبلیغ کرنے والوں کو ملک وقوم کا دشمن یا خدا کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی زبان بندی کی جاتی ہے، ان کی تحریروں کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے اور ضرورت ہو تو اِن کو جان سے مار دیا جاتا ہے۔

ثقافتی اقدار

ثقافتی اقدار وہ ہیں جو قدیم روایات کی صورت میں آباؤاجداد سے منتقل ہو کر آتی ہیں۔ ان کا تعلق ماضی کی روایات سے ہے۔ یہ اقدار نہایت دیرپا، ثقیل اور اپنے معاشرتی دباؤ میں سخت ہیں۔ ان کی پرورش قدیم رسم و رواج کی مرہونِ منت ہے۔ سابقہ نسلوں میں ان سے انحراف فرد کے لیے معاشرتی موت تھی۔ ان کی خلاف ورزی بہت مشکل ہوتی تھی۔ ان اقدار میں وہ جملہ رسومات، رواج و عقائد شامل ہیں جو آج بھی معاشرے میں پرانی ثقافت کے نام سے پکارے جاتے ہیں یا پرانے لوگوں کی روایتی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ ان اقدار کا تعلق زیادہ تر خاندان، مذہب اور تعلیم سے ہے۔ یہی وہ ادارے ہیں جو اِن اقدار کی تعلیم دیتے ہیں۔ ''ثقافتی اقدار معاشرے کے افراد کو نسل در نسل جوڑتی ہیں، جس سے مختلف دور کے افراد کا گروہوں میں تعلق قائم رہتا ہے۔''[۱۱]

ثقافتی اقدار معاشرے کے وہ معیاری اور مستند تصورات ہیں جو رسم و رواج، لوک رِیتوں اور معمولات کی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔

"The norms of a group flow from its value."[۱۲]

"Cultural values may be briefly defined as shared conceptions of what is desirable: they are ideas which the members of some social groups accept explicitly or implicitly; and which therefore influence the

behaviour of the group members. Some values relate to very specific objects or events, while other values are much more general and relate to variety of situation."(۱۳)

آج دنیا میں کم وبیش تین ہزار معاشرے پائے جاتے ہیں اور ہر معاشرہ کچھ مخصوص ثقافتی اقدار کا حامل ہے جو اُس کے ذہنی رویوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً جاپانی کلچر میں پرورش پانے والے فرد کے رویے، پنجاب کی تہذیب وتمدّن میں پروان چڑھنے والے فرد سے مختلف ہوں گے۔ انسان ہمیشہ اپنی مخصوص ثقافتی عینک سے دنیا کو دیکھتا ہے۔ یہ عینک اس کی اقدار کا وہ مجموعہ ہے جو اس نے اپنے معاشرے اور ثقافت سے حاصل کیا ہے۔ اسی لیے مختلف معاشرتی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد ایک ہی صورتِ حال میں مختلف ردّعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

"People are not just "driven" by situational pressure; they are also "pulled" by the ideals and goals of their cultures."(۱۴)

آج کے سوشیالوجسٹ کے لیے مخلوط معاشرہ خصوصی دلچسپی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان کی تحقیق کا خصوصی مرکز یہ نکتہ ہے کہ مخلوط معاشرہ میں افراد کیونکر اپنی آبائی ثقافتی ومعاشرتی اقدار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرتی گروہ جو ثقافتی بنیادوں پر دوسرے گروہ سے مختلف ہو جاتا ہے، مخلوط معاشرے کی معاشرتی اقدار کو اپنانے کے باوجود اپنی آبائی ثقافتی اقدار کو اِس طرح اپنائے رکھتا ہے کہ اپنے مخصوص طرزِ فکر وعمل کے ذریعے اپنی انفرادیت اور تشخص برقرار رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ میں نظر آنے والا معاشرتی تنوع، ثقافتی اقدار کے ٹھوس وجود کو ثابت کرتا ہے۔

اخلاقی اقدار (Moral Values)

دنیا کے ہر معاشرے میں انسانی کردار کی عظمت کو اخلاقی بنیادوں پر پَرکھا جاتا ہے۔ ہر معاشرہ اپنے لیے کچھ اخلاقی ضابطے اور معیار وضع کرتا ہے جو اس کے استحکام اور توازن کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اخلاقی معیاری ضابطے انسانیت کا طرۂ امتیاز ہیں جو اس کے اشرف المخلوقات ہونے پر مہر ثبت کرتے ہیں۔ اخلاقی ضابطوں کا یہ

تصوراخلاقی اقدار کہلاتا ہے۔

"Every culture provides a set of categories and standards to be used in evaluating human behaviour. Some of these standards are ideally the same for all persons: The Golden values ... every society has numerous particularistic standards. The most important of these are role expectation - for example, conception of how a good father should behave ... some moral principles are virtually universal, and these are presumably necessary to the continuity of organized society."(۱۵)

اخلاقی اقدار کی مزید درجہ بندی کی جاسکتی ہے:

الف: آفاقی اخلاقی اقدار

ب: مطلق آفاقی اقدار

ج: گروہی اخلاقی اقدار

الف: آفاقی اخلاقی اقدار

دنیا کے ہر معاشرے میں بہت سی ایسی اخلاقی قدروں پر یقین رکھا جاتا ہے جو آفاقیت کی حامل ہیں۔ یہ آفاقی قدریں کسی ایک ملک یا تہذیب کی میراث نہیں ہیں بلکہ یہ صدیوں اور قرنوں پر پھیلے فلسفۂ اخلاقیات کا ثمر ہیں اور بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ محبت، سچائی، دیانت داری، وفا شعاری کی قدروں پر کسی ایک معاشرے میں یقین نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ وہ سنہری اصول ہیں جنہیں اپنانا ہر تہذیب اپنی معاشرتی عظمت کی دلیل سمجھتی ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں انسانی رویے اور کردار کی عظمتوں و رفعتوں کو انہیں کی کسوٹی پر پَرکھا جاتا ہے۔

ب: مطلق آفاقی اقدار

آفاقی اقدار میں سے بعض کو مطلق آفاقی اقدار کہا جا سکتا ہے۔ آفاقی اقدار تمام انسانوں کے لیے یکساں ہیں، لیکن وقتی صورتِ حال کے تحت ان میں لچک پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ مطلق اقدار مخصوص لوگوں کے لیے ہیں۔ ہر طرح کی صورتِ حال میں بغیر کسی لچک کے مانی جاتی ہیں۔ مثلاً انسان کا قتل گناہ ہے، ایک آفاقی قدر ہے لیکن ایک سپاہی وطن کی خاطر دشمن کی جان لے سکتا ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر کے لیے جان بچانا ہر حال میں قدر ہے، خواہ وہ اس کے ملک کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ مریض کی جان بچانا ڈاکٹر کی مطلق قدر ہے، سپاہی کی مطلق قدر نہیں ہے۔

ج: گروہی اخلاقی اقدار

آفاقی اقدار کے ساتھ ساتھ ہر معاشرہ کچھ مخصوص اخلاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اخلاق کے یہ وہ تصورات ہیں جن کی بنا پر ایک معاشرتی گروہ دوسرے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ گروہی اخلاقی اقدار صرف اسی معاشرتی گروہ کے افراد پر لاگو ہوتی ہیں، مثلاً سندھ میں کاروکاری کی رسم کے پیچھے ان کا مخصوص تصورِ غیرت، اسی طرح پنجاب میں غیرت کے نام پر عورت کے قتل کو جائز قرار دینے کے پیچھے مخصوص اخلاقی سوچ ہے، جاپانی معاشرے میں خودکشی بعض حالات میں انتہائی قابلِ فخر عمل سمجھا جاتا ہے اور یہ عزت و افتخار کی علامت بن جاتی ہے، لیکن اسلامی معاشرے میں خودکشی کو کسی بھی صورت میں جائز نہیں سمجھا جاتا۔

مذہبی اقدار

ہر مذہب کچھ مخصوص اخلاقی اقدار رکھتا ہے۔ مذہبی اقدار انسانی کردار سازی، رجحانات اور رویوں کو سمت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ انسانی طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر گہرے اثرات مرتّب کرتی ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب مشترک اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ مخصوص مذہبی اقدار کے حامل ہیں۔ مثلاً اسلام میں والدین کی خدمت، پردہ، شرم و حیا، ضرورت مند کی دستگیری، ایفائے عہد وغیرہ کی اقدار پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

اخلاقی اقدار کا گہرا تعلق مذہب سے ہے۔ ہر مذہب انسانی طرزِ عمل اور رویوں کے لیے کچھ ضابطے مقرر کرتا

ہے۔ مذہب کی یہ حدود اس کے پیروکاروں کے لیے اخلاقی پیمانے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک مذہب کے ماننے والوں کی اخلاقیات دوسرے مذہب کے پیروکاروں سے متصادم اور متضاد ہوسکتی ہے۔ مثلاً مذہبِ اسلام میں شراب نوشی اور جوا حرام کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ایک شرابی اور جواری کو اسلامی معاشرے میں بدکردار اور بداخلاق سمجھا جاتا ہے، جبکہ دوسرے مذاہب میں اس کی ممانعت نہ ہونے کی وجہ سے شراب پینے والے اور نہ پینے والے میں اخلاقی لحاظ سے کوئی اونچ نیچ نہیں سمجھی جائے گی۔ اسی طرح خودکشی، جو اسلامی معاشرے میں حرام ہے، یہ جاپانی کلچر میں عزت و وقار کو ثابت کرنے کا روایتی اور مہذب طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں عورت اور مرد کا آزادانہ میل جول پسند نہیں کیا جاتا، شرم و حیا مشرقی اور اسلامی معاشرے کی قابلِ قدر اقدار میں سے ایک ہے، لیکن دوسری طرف مغربی معاشرے میں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کے میل ملاقات کو تہذیبی اور معاشرتی طور پر رَوا رکھا جاتا ہے۔

اخلاقی اقدار فرد کی شخصیت سازی اور کردار کی تشکیل میں نہایت اہم گردانی جاتی ہیں۔ ہر معاشرے میں اخلاقی اقدار کی پختگی کردار کی عظمتوں کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ بچپن سے انسان جو اخلاقی اقدار اپنے ماں باپ، خاندان اور گروہ سے حاصل کرتا ہے، وہ اس کے لاشعور کا حصہ بن کر ہمیشہ اس کے طرزِ فکر و احساس کو متعیّن کرتی ہیں۔ بچپن سے حاصل کی گئی اخلاقی اقدار اس کے ضمیر کا حصہ بن کر اچھائی اور بُرائی میں تمیز کا پیمانہ بن جاتی ہیں۔ یہی اقدار ساری زندگی اس کے عمل، ردِّعمل، رویوں اور رُجحانات کو متعیّن کرتی ہیں۔ سماجی اقدار کے چناؤ میں بھی اخلاقی اقدار ہی پسِ پشت اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔

احساسِ گناہ، جو بہت بڑی انسانی صفت سمجھی جاتی ہے، اخلاقی اقدار کے پختہ شعور ہی کا نتیجہ ہے۔ وہ شخص جو اخلاقی اقدار سے عاری ہو جائے وہ روحانی طور پر بھی بنجر اور دیوالیہ پن کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسانی ارادوں کی پختگی، بلند ہمتی، اولوالعزمی اور سچائی سے محبت اخلاقی ضابطوں سے پیدا ہونے والے وہ کرداری اوصاف ہیں جو کسی بھی معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اقدار کی اہمیت

تہذیب و ثقافت کے عناصرِ ترکیبی میں اقدار کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک طرف ثقافت کے دوسرے عناصر زبان اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ثقافتی تشخص کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں تو دوسری طرف یہ معاشرتی استحکام اور

کردار سازی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

منظّم و مستحکم معاشرے اور شخصیت کی تعمیر میں اقدار کے کردار پر روشنی ڈالی جاتی ہے، تاکہ ان کی اہمیت اُجاگر ہو سکے۔

معاشرہ اور اِقدار

معاشرہ اور اِقدار کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ معاشرتی نظام کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرے کے افراد معاشرتی اور اخلاقی اقدار پر یقین رکھتے ہوں اور اپنے معمولاتِ زندگی میں ان کا احترام کرتے ہوں۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت کا احترام، انسانی فلاح و بہبود کے کاموں کی حوصلہ افزائی، انسان کی فکری و تخلیقی صلاحیتوں کی جِلا، بھائی چارے، سچائی، رواداری اور خدا کی ہستی پر یقین رکھنے کی اقدار موجود نہ ہوں، وہ معاشرہ بالآخر بنجر پن اور اِنتشار کا شکار ہو کر ٹوٹنے پھوٹنے لگتا ہے۔

معاشرے میں اقدار کی اہمیت واضح کرتے ہوئے Elliot لکھتے ہیں:

"All societies have patterns of values. Important social behaviour is oriented with reference to them. The form and content of these patterns vary from one society to another, and the emphasis placed upon each value in likewise a function of cultural definition. Some meaningful patterns of social values, however, is a fundamental part of the heritage of every society. It determines what the society considers important and what its members will strive for and defend."[۱۶]

بہترین معاشرتی نظام وہ ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کے حصول کو اپنا مقصدِ اعلیٰ بناتا اور ایسے معاشرتی اصول وضوابط

اورقوانین وضع کرتا ہو جو معاشرے میں ان اقدار کے حصول اور فروغ کا باعث بنتے ہوں۔ معاشرہ اور اِقدار کے رشتے کو واضح کرتے ہوئے ''Society Today'' میں لکھا ہے:

"Every social system is characterized by some set of values representing conceptions of the desirable state of the society or ultimate goals towards which it should be moving - terminal values - as well as conceptions of the appropriate ways through which these terminal values should be promoted and according to which social life in general should proceed - instrumented values - In American society, ideas such as equality, individual freedom, human dignity, and affluence represent terminal values or goals toward which society should be moving, where ideas such as democracy and due process of law are important components of American instrumental values."[(۱۷)]

اقدار کے نظام میں خلل کا واقع ہونا معاشرتی عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔ ''Social Problem'' میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Social disorganization is a situation in which major institution structure are not fulfilling their intended and necessary function thus if the institution of the family fails to provide an adequate home

environment and to socialize children according to certain values. Thus a whole constellation of social problems may be generated." (۱۸)

اقدار کی اہمیت کے بارے میں شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''معاشرہ اپنی سماجی قدروں کی پاسبانی اِس وجہ سے کرتا ہے کہ سماج کی بقا کا دارومدار بڑی حد تک انہی قدروں کے تحفظ پر ہوتا ہے۔ اگر اِن قدروں کی طرف سے غفلت برتی جائے تو معاشرہ کا شیرازہ ہی بکھر جائے اور اِس کی انفرادیت باقی نہ رہے۔ مثلاً عربوں میں ظہورِ اسلام سے پیشتر ذی الحجہ کے مہینے میں خونریزی قطعاً ممنوع تھی۔ وجہ یہ تھی کہ حج کے موقع پر مکہ میں بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں سوداگروں کے قافلے دور دراز مقامات سے آ کر شریک ہوتے تھے اور ہفتوں خرید وفروخت کا بازار گرم رہتا تھا۔ اہالیانِ مکہ کی روزی کا انحصار اسی میلے اور زائرینِ حج کے اجتماع پر تھا (یہ صورتِ حال ہنوز باقی ہے)۔ اب اگر قبائلی جنگیں حج کے زمانے میں بھی جاری رہتیں تو ظاہر ہے کہ عربوں کی معیشت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

اسی طرح ہمارے ملک میں بعض خانہ بدوش بلوچ قبیلوں کی سماجی قدروں کی بنیاد ''شرکت'' پر قائم ہے۔ شرکت سے مراد یہ ہے کہ قبیلہ کے افراد کے اثاثے پر ہر شخص کا مساوی حق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ایک خاندان کے پاس نمک یا آٹا ختم ہو جائے تو وہ دوسرے خیمے سے یہ چیزیں لے آ سکتا ہے۔ اس کو خیمے والے سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ان چیزوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔'' (۱۹)

فرد اور اِقدار

اقدار انسانی رویوں کا منشور ہیں۔ یہ شخصیت کی نشوونما، کردار کی تشکیل اور ذہنی رجحانات کی سمت متعیّن کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جدید نفسیات کے باوا آدم فرائڈ کا یہ نظریہ کہ فرد کی زندگی کے ابتدائی تجربات اس کی شخصیت پر دور

رَس اثرات مرتّب کرتے ہیں، ان اقدار کا احاطہ بھی کرتا ہے جن سے بچپن میں اس کا واسطہ پڑتا ہے۔

"Values play an important role in the development and organization of the attitude of the individual."[۲۰]

یہ اقدار ہی ہیں جو انسان کی ترجیحات متعیّن کر کے اس کا نصب العین طے کرتی ہیں۔

"Both groups and persons have values. The values of the group are primary since all of us are born into a world of values. Those of the person are therefore derivate. The study of value is essential to understanding the motivation of human action."[۲۱]

یہاں ہم ایک تحقیق کا حوالہ دیتے ہیں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان کے بہت سے ذہنی رجحانات اس کی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سمتھ نے ایک تحقیقی سروے کیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت کم کی گئی تحقیقات میں شمار ہوتا ہے۔ اس تحقیقاتی سروے میں اس نے کوشش کی کہ وہ اقدار اور رویوں کے درمیان موجود رشتے کو سمجھ سکے اور ان کا مطالعہ کر سکے۔ اس نے نیو انگلینڈ میں رہنے والے ۲۵۰ لوگوں کو چُن کر اُن سے دو مرتبہ انٹرویو کیے۔ پہلے انٹرویو میں اس نے روس سے متعلق ان کے خیالات اور رویوں کو جاننے کے لیے سوالات کیے۔ دوسرے انٹرویو میں اس نے ایسے سوالات کیے جو اُن افراد کی اقدار اور کردار سے متعلق تھے۔ سمتھ اس نتیجے پر پہنچا کہ روس سے متعلق ان افراد کا رویہ ان اقدار کا پیدا کردہ ہے جنہیں وہ اپنی زندگی میں بنیادی اہمیت دیتے تھے۔

"The nature of the central values of the individual was important in determining the most salient cognitive components of his attitude towards Russia."[۲۲]

انسان کے نصب العین، زندگی میں اس کے مقاصد اور ترجیحات کے تعیّن میں اقدار کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً وہ اپنے لیے کس پیشے کا انتخاب کرتا ہے، اس کے ذریعے اور مقصد میں کیسا تعلق ہونا چاہیے۔ اس طرح کے تمام فیصلوں

میں اس کی اقدار فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر دولت کمانا ہی کسی فرد کی سب سے بڑی قدر ہے تو وہ منشیات کا بیوپار کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرے گا، لیکن اگر انسانیت سے محبت اس کی بنیادی قدر ہے تو وہ دولت کی پرواہ کیے بغیر، عبدالستار ایدھی کی طرح انسانیت کی خدمت کے رستے پر چلے گا۔

انسان کی خوشی اور سکونِ قلب کا انحصار اُس کے رویوں پر ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں بے اطمینانی، بے سکونی اور نفسیاتی الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ انسان اپنے ماحول سے اُکتایا ہوا اور مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ اس کی وجوہات میں جہاں اور اسباب بھی شامل ہیں وہاں فرد کی انفرادی اقدار بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔ مادہ پرستی، لالچ، حسد اور طاقت کی خواہش جیسی منفی قدروں نے اس کے اندر صبر و شکر، قناعت و توکل، رواداری، تحمل و برداشت اور محبت و مہربانی کے رویوں کو ختم کر دیا ہے۔

مسابقت، دولت کی خواہش اور نمود و نمائش کی قدر نے انسانیت کے عزت و وقار کو قدموں تلے روند ڈالا ہے۔ لامحدود خواہشات کی اُڑان نے نفسِ مطمئنہ کو عنقا کر دیا ہے۔ خود غرضی و خود پرستی نے معاشرے کو عدم برداشت کی راہ پر لگا کر کانٹوں کا جنگل بنا دیا ہے۔

کسی معاشرے کے افراد کا مثبت قدروں پر یقین اور عملی زندگی میں انہیں جاری و ساری کرنا اس معاشرے کو مثالی بنا دیتا ہے۔ اور اگر یہ قدریں اپنا اعتبار کھونے لگیں تو افراد اور معاشرے شکست و ریخت کا شکار ہو کر جہنم میں بدل جاتے ہیں۔

اقدار کی شکست و ریخت

اقدار جامد اور غیر متغیر نہیں ہوتیں، بلکہ یہ وقت اور حالات کی تبدیلی سے اثر پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ جب زمانے میں معاشی، سیاسی، فکری اور صنعتی انقلابات رونما ہوتے ہیں تو ایک زمانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اقدار جن کی نمود انسانی فکر و احساس اور تجربوں کے منشور سے ہوتی ہے، جیسے جیسے یہ اپنا زاویہ بدلتے ہیں اقدار میں بھی تبدیلی کے رنگ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

اقدار میں تبدیلی ایک فطری اور مثبت عمل ہے۔ متحرک اور تخلیقی معاشروں میں یہ تبدیلیاں محسوس اور غیر محسوس

طریقے سے ہوتی رہتی ہیں۔ پرانی اقدار آہستہ آہستہ دَم توڑتی رہتی ہیں اوران کی جگہ ایسی نئی اقدار جنم لیتی رہتی ہیں جو نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر معاشرتی وسماجی سرگرمیوں کو متحرک رکھتی ہیں۔ تبدیلی کا یہ مثبت عمل معاشرتی استحکام اور فرد کی سالمیت کو برقرار رکھتا ہے۔لیکن جب قدیم روایتی اقدار پر یقین اس طرح اٹھ رہا ہو کہ ان کی جگہ مثبت کی بجائے منفی اقدار جنم لے کر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہوں تو اسے ہم اقدار کی شکست وریخت کا اَلمیہ قرار دیں گے۔

یہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بدلتے ہوئے معاشرتی حالات سے ہم آہنگ فکری نظام موجود نہ ہو، جو جدید حالات کے تقاضوں کا ادراک کر کے فکر واحساس کو نئی سمت دے کر مثبت اقدار کو جنم دینے کی راہ ہموار کر سکے، ایسی اقدار، جو ایک طرف کہنہ مشق روایتی اقدار کے خلا کو پُر کر کے انفرادی سطح پر یکسوئی پیدا کر سکیں اور دوسری طرف معاشرتی نظم و استحکام کا باعث بن سکیں۔

قدیم، مستند اور روایتی اقدار پر تشکیک، بے اعتمادی اور بے یقینی کی کیفیت کا پیدا ہو جانا، ان کا فرسودہ، بے معنی اور بے وقت کی راگنی کہلائے جانا، پرانے اخلاقی سانچوں اور معیارات کو کھوکھلا گردانے کا یہ رویہ معاشرتی اقدار میں شکست و ریخت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقدار میں ٹوٹ پھوٹ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ وہ کیا اسباب ہیں جو اقدار پر بے یقینی کی صورتِ حال کو جنم دیتے ہیں اور پرانی اقدار کی جگہ کیوں نئی اقدار رواج پا جاتی ہیں؟

اس باب کا بنیادی بحث طلب نکتہ اقدار کی یہی شکست و ریخت، ان کی کشمکش اوران میں رونما ہونے والی تبدیلی کے اسباب واثرات ہے، تاکہ فرد اور معاشرے پر اس شکست و ریخت کے اثرات کا جائزہ لے کر بعدازاں بانو قدسیہ کے ناولوں میں اقدار کی شکست وریخت کا تحقیقی مطالعہ کیا جا سکے۔

اقدار کی شکست وریخت کا دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے:

۱۔ تغیرِ قدر

۲۔ تصادمِ قدر

تغیرِ قدر

اقدار معاشرتی زندگی میں عرصہ دراز تک رہن سہن سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں استحکام اور تنظیم بھی شدید ہوتی

ہے۔ چونکہ یہ ثقافت کا حصہ بھی ہوتی ہیں اس لیے ان کا بدلنا آسان نہیں ہوتا لیکن جب معاشرتی وثقافتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو ان میں بھی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے لگتی ہیں۔ نتیجتاً انسان کے گروہی کردار میں تبدیلی آجاتی ہے۔ معاشرتی اقدار باہمی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اگر کسی ادارے کی اہم اقدار کو تبدیل کر دیا جائے تو اس ادارے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو جائیں گی۔ اس ادارے سے ملحقہ دوسرے اداروں میں بھی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس طرح ایک قدر میں تبدیلی دوسری اقدار میں تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

سماجی ترقی کے لیے سماجی اقدار میں تبدیلیاں ضروری ہیں۔ نئے سماجی حالات خود بخود سماجی اقدار پیدا کرتے رہتے ہیں اور معاشرہ نئی اقدار کو پرانی اقدار کی جگہ اپناتا رہتا ہے۔ یک لخت سماجی اقدار کو تبدیل کرنا یا توڑنا سماجی مسائل کو دعوت دینا ہے۔ ہاں سماجی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان میں لچک آجاتی ہے اور معاشرہ بہت سی تبدیلیوں کو قبول کر لیتا ہے۔

اب ہم ان عوامل کا جائزہ لیں گے جن کے زیرِ اثر اقدار میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

معاشرتی حالات میں تبدیلی

ہر معاشرہ اپنے مخصوص حالات کے زیرِ اثر اقدار کی پرورش کرتا اور انہیں اپنی زندگیوں کا حصہ بناتا ہے۔ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور صنعتی معاشرہ اپنے اپنے مخصوص نظامِ اقدار کا حامل نظر آتا ہے۔ اسی طرح شہری اور دیہاتی اقدار میں اختلاف موجود ہے۔ جب معاشرہ ایک نظام سے دوسرے نظام کے دائرے میں قدم رکھتا ہے تو معاشرتی وسماجی حالات تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ ہر معاشرہ ایک کردار اور مزاج رکھتا ہے۔ معاشرتی تبدیلی کے ساتھ اس کے کردار اور فکر و احساس میں ہلچل پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی اور بُرائی کے معیار، پسند اور ناپسند کے دائرے سمٹنے اور بڑھنے لگتے ہیں۔ اس کے پرانے اعتقادات شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ نسل در نسل معتبر اقدار اپنا اعتبار کھونے لگتی ہیں، اور یہی وہ مقام ہے جہاں معاشرہ نئے حالات کے سامنے بے بس اور مجبور ہو کر تبدیلی کو قبول کر لیتا ہے۔ پرانی اقدار و روایات کو پسِ پشت ڈال کر حالات سے ہم آہنگی کی خاطر نئی اقدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

جب بھی کوئی نیا معاشی یا سیاسی نظام معاشرے پر گرفت کے لیے آگے بڑھتا ہے تو اس نے ایک ہاتھ میں تبدیلی کی تیغِ آبدار اور دوسرے میں نیا نظامِ اقدار تھام رکھا ہوتا ہے۔ وہ پرانے نظامِ اقدار کی دھجیاں بکھیر کر معاشرے کو اپنے

جدید نظامِ اقدار کا چولا پہنا دیتا ہے۔

صنعتی نظام اپنے ساتھ عقلیت، مادہ پرستی، معروضیت اور عمومیت کی صفات لے کر آتا ہے جو اخلاقی اقدار کے مروّجہ سانچوں کو توڑ مروڑ کر اُن کی ماہیت بدل کر رکھ دیتا ہے۔ نئے حالات کے نئے تقاضوں کے سامنے پرانی اقدار فرسودہ ہو جاتی ہیں اور جدید زمانہ تازہ دم اقدار کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے۔

صنعتی دور کی طرح جاگیرداری کی اپنی مخصوص اقدار و روایات ہیں۔ جاگیردارانہ اقدار کی شکست و ریخت کو قرۃ العین حیدر نے اپنے اکثر ناولوں میں پیش کیا ہے۔ خصوصی طور پر اُن کے ناول ''چاندنی بیگم'' میں مٹتی ہوئی تہذیب اور اقدار کے کھوکھلے پن کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح ان کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' میں ایک طرف پرانی اقدار کی شکست و ریخت اور دوسری طرف حالات کے جبر کے سامنے ہتھیار ڈال کر نئی اقدار کو اپناتے ہوئے کردار پیش کیے گئے ہیں۔

ہر سیاسی نظام بھی اپنا مخصوص نظامِ اقدار رکھتا ہے۔ غیر ملکی تسلّط کے زیرِ اثر پرورش پانے والا ذہن غلامانہ بھی ہو سکتا ہے اور باغیانہ بھی۔ تحریکِ آزادی کے تحت تخلیق ہونے والے ادب میں دورِ غلامی میں پرورش پانے والی اقدار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آمریت میں پنپنے والی قدروں کا مشاہدہ، ہمارے ہاں ساٹھ کی دہائی میں تخلیق کیے گئے علامتی افسانوں اور شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر

جدید علوم و فنون، نئے تجربات، سائنسی نظریات اور اختراعات و ایجادات پرانے اعتقادات اور فکر و فلسفہ پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ جدید سائنسی نقطۂ نظر پرانی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے لیے زہرِ قاتل کا کام کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی

ٹیکنالوجی کے استعمال نے معاشرتی اقدار پر سب سے قاری ضرب لگائی ہے۔ صنعتی نظام کی اپنی ضروریات، مخصوص مسائل اور ان کے حل ہیں۔ زندگی کے مشینی معمولات کی بے حسی اور مصروفیت نے اخلاقی اقدار کے تقدس، اس کی اہمیت اور انسانی رویوں میں اس کی معنی خیزی کو سخت مجروح کیا ہے۔ سادہ معاشرے کے شخصی اور گہرے جذبوں کے حامل

رویوں کی جگہ معروضی اور تجارتی ذہن نے لے لی ہے۔ یہ مشینی اور تجارتی ذہن جو اعلیٰ انسانی اقدار سے نابلد ہے۔

نظریاتی تبدیلی

نظریاتی وابستگی میں کمی بیشی بھی اقدار میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ ترقی پسند نظریے کے تحت تخلیق کیے گئے ادب میں ہمیں مخصوص نظریات اور اقدار کا پرچار نظر آتا ہے۔ نظریاتی وابستگی مخصوص مزاج اور اقدار کی حامل ہوتی ہے۔ جیسے جیسے نظریاتی وابستگی کی شدت میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے اس نظریے سے منسلک اقدار بھی ناپید ہوتی جاتی ہیں۔ بعض اقدار سے لوگوں کی عدم دلچسپی سے ان قدروں کا پھیلاؤ رُک جاتا ہے۔ انھیں تحفظ دینے والے لوگوں کی کمی ان اقدار کے خاتمے کا باعث بنتی ہے۔

حرکت پذیری

دیہاتوں سے شہروں کی طرف نقل مکانی، نئے لوگوں سے میل ملاقات کے بڑھتے ہوئے مواقع، مختلف النوع معاشروں تک رسائی، اقدار میں تیزی سے تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

غیر ملکی شہریت

آج کل دنیا بھر کے غیر ترقی یافتہ ممالک کے افراد غیر ملک کی شہریت حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف ان کی اقدار متاثر ہو رہی ہیں بلکہ ان ممالک میں بدیسی باشندوں کی آمد سے مخلوط معاشرے کی نئی اقدار جنم لے رہی ہیں۔

ذرائع ابلاغ

آج کے دور میں ذرائع ابلاغ معاشرے پر پوری طرح حاوی ہو چکے ہیں۔ وہ افراد کی رائے کا رُخ بدلنے اور رائے قائم کرنے میں موثر ترین ذریعہ بن چکا ہے۔ وہ ناپختہ ذہنوں میں نئی اقدار کے لیے پسندیدگی کا بیج بوتے اور کچے ذہنوں میں تصادم قدر سے انتشار پیدا کر دیتے ہیں۔ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نئی اقدار کے فروغ میں پیش پیش ہے۔

تصادمِ قدر (Value Conflict)

تصادمِ قدر ایک ایسی صورتِ حال ہے جس میں اقدار کے انتخاب میں کشمکش جنم لیتی ہے۔ خواہ وہ دو قدروں کے درمیان چناؤ یا انہیں جبراً رَد یا قبول کرنے کی کشمکش ہو۔ اس سے اقدار میں شکست و ریخت پیدا ہونے لگتی ہے۔

تصادمِ قدر کے بارے میں پروفیسر عبدالحمید تگہ لکھتے ہیں:

''جب دو یا دو سے زیادہ اقدار کسی ایک سماجی حالت کے لیے پائی جائیں تو اُن کے انتخاب میں جو کشمکش پیش آتی ہے اُسے تصادمِ قدر کہتے ہیں۔''(۲۳)

جدید معاشرے میں رہتے ہوئے فرد کو قدم قدم پر تصادمِ قدر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک ہی معاشرے کے اندر بہت سے ایسے گروہ رہتے ہیں جو ایک ہی سماجی حالت کے لیے مختلف اقدار پر یقین رکھتے ہیں۔ ان گروہوں کی اپنی اقدار کے ساتھ وابستگی کی جڑیں اس قدر گہری ہوتی ہیں کہ وہ ان کے اطلاق کے لیے جسمانی تشدد کا راستہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ نسلی اور لسانی فسادات اقدار کی اسی پختگی اور تصادمِ قدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اکثر معاشرے میں ایسے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں جن کی اقدار اور مفاد عوام الناس سے برعکس ہوتا ہے۔ مفادِ عامہ سے عدم مطابقت بہت سنگین حالات پیدا کر دیتی ہے۔ مختلف مافیا (منشیات، اسلحہ کا کاروبار کرنے والے) کا وجود تصادمِ قدر کو اُبھارتا ہے۔ یہ منفی اقدار کا زہر معاشرے میں اس طرح پھیلا دیتے ہیں کہ اخلاقی قدروں اور ان کے درمیان کشمکش جنم لینے لگتی ہے۔

بعض دفعہ معاشرے پر ایک ایسا طاقتور گروہ مسلّط ہو جاتا ہے جو جبراً اپنی اقدار نافذ کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں کمزور طبقہ اپنی اقدار کے چناؤ اور اُن پر عمل کرنے میں آزاد نہیں رہتا۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور مارے خوف کے اپنی اقدار چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مذہبی انتہا پسندوں کے زور پکڑنے سے جبر کی یہ فضا ہمارے معاشرے میں بھی دکھائی دے رہی ہے۔

مخلوط ثقافتی معاشروں میں تصادمِ قدر کی صورت بہت بڑھ جاتی ہے۔ متنوع معاشروں سے تعلق رکھنے والے افراد کا آپس میں میل جول جہاں نئی اقدار کو جنم دیتا ہے، وہاں پرانی اقدار کشمکش کا باعث بھی بنتی ہیں۔

معاشرے پر اقدار کی شکست وریخت کے اثرات

معاشرہ اور اقدار کا رشتہ اس قدر گہرا ہے کہ مربوط نظامِ اقدار کے بغیر معاشرتی استحکام کا تصور بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔

> "When common value definitions break down, some degree of social disorganization is therefore present. A lack of consensus is apparent in modern society and reflects the impact of social change. Social action in inconsistent and often contradictory when value conflict. The particular aspects of social disorganization - e.g. the decline in organized religion, the instability of the family, and the rise of conflicting political ideologies - reflect this situation rather than cause it. Social disorganization may therefore be conceived as a state of conflict among social values."(۲۴)

عدم توازن اور بدنظمی کے شکار معاشرے میں فرد آزادی سے اپنی اقدار پر عمل پیرا نہیں ہوسکتا۔ اسے ایک قدر کا احترام کرنے کے لیے لازماً کسی دوسری قدر کو پامال کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک کے موجودہ حالات مکمل معاشرتی بدنظمی کی عکاسی کرتے ہیں۔ عدم برداشت، متضاد سیاسی نظریات، مذہبی انتہا پسندی اور پُرتشدد کارروائیاں اقدار کے تصادم کی بدترین شکل میں ظاہر ہورہی ہیں۔

خاندان پر اثرات

خاندان معاشرے کی اکائی ہے۔ اگر یہ منظّم اور مضبوط ہے تو پورا معاشرہ منظّم و مستحکم ہوگا۔ لیکن اگر خاندان بکھرنے لگیں تو یہ مل کر پورے معاشرے کو منتشر کردیتے ہیں اس لیے معاشرتی انتشار کی وجہ خاندانی انتشار میں تلاش کرنی چاہیے۔

خاندانی طرزِ زندگی میں تبدیلی نے اس کی اقدار کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں نے روایتی خاندانی نظام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جب روایتی خاندانی نظامِ فکر موجود معاشرتی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اسے شدید تصادم اور کشمکش سے گزرنا پڑتا ہے۔ روایتی طرزِ زندگی کے حامل افرادِ خانہ تبدیل شدہ معاشرتی حالات کے تقاضوں سے ہم آہنگی کی خاطر وہ کچھ کرنے پر مجبور ہیں جو روایتی فکر کے حوالے سے انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ جدید ایجادات و اختراعات، تعلیمی مواقع اور اعلیٰ معیارِ زندگی حاصل کرنے کی خواہش میں انہیں نئے اخلاقی معیار وضع کرنے پڑتے ہیں، کیونکہ پرانی اخلاقیات نئے حالات پر منطبق نہیں ہوتی۔ اگر خاندان بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھال لیتا ہے اور پرانی اقدار کو خیر باد کہہ دیتا ہے تو وہ نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتا ہے۔ لیکن اگر روایتی فکر اور طرزِ زندگی رکھنے والے لوگ پرانی اقدار و روایات چھوڑنے پر تیار نہ ہوں تو وہ چکّی کے دو پاٹوں میں آ کر پسنے لگتے ہیں۔ خاندان نئے زمانے کا ساتھ دینے سے قاصر رہتا ہے اور اس کے اندر کشمکش اور تصادم جنم لے کر اسے اندرونی خلفشار کا شکار کر دیتا ہے۔

ہمارا روایتی خاندانی نظام پدرسری طرز کا ہے، جس میں کُل اختیارات خاندان کے مرد بزرگ کے پاس ہوتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ اپنے خاندان میں مطلق العنان اور تحکم پسند ہوتا ہے۔ اس کی بیوی، بچے، بچیاں، پوتے، پوتیاں اس کی رعایا اور ماتحت ہوتے ہیں۔ معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یہ نظامِ زندگی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے اور اس سے وابستہ قدریں بھی دَم توڑ رہی ہیں۔ مٹتی ہوئی تہذیب اور قدروں کا زوال بزرگ نسل کو ذہنی اذیت اور کرب میں مبتلا کر رہا ہے۔ وہ نئی نسل کو اقدار و روایات کا سرمایہ سونپنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ قدروں کا تسلسل منقطع ہو رہا ہے۔ نئی نسل کی آبیاری کرنے والا اقدار و روایات کا چشمہ خشک ہو رہا ہے۔ ماضی کے ساتھ بندھی ڈور کٹ جانے سے اس کا حال کٹی پتنگ جیسا ہو چکا ہے۔ وہ حال میں ڈول رہی ہے اور اس کا مستقبل بے سمت ہو چکا ہے۔

مشترکہ خاندانی نظام کی جگہ نیوکلیئر فیملی سسٹم رواج تو پا رہا ہے لیکن مشترکہ خاندانی نظام سے وابستہ روایتی اقدار ابھی پوری طرح ذہنوں سے محو نہیں ہوئیں۔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہے اور نئے رستے بانہیں کھولے اپنی اور بُلا رہے ہیں۔

خاندانی اقدار میں کشمکش کی ایک بڑی وجہ عورت کے مقام اور کردار میں تبدیلی واقع ہونا ہے۔ بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں عورت کا روایتی اور مثالی کردار قائم نہیں رہ سکا۔ تعلیم یافتہ عورت اب صرف گھر اور بچوں کی نگہداشت کے لیے وقف نہیں ہے بلکہ وہ ملازمت پیشہ ہے، معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ بانٹ رہی ہے اس لیے وہ شوہر کو ''مجازی خدا''

ماننے کی بجائے زندگی کا ساتھی سمجھنے لگی ہے۔ وہ خاندان کی خدمت کی قدر کو ترجیح دینے کی بجائے اپنی آزاد حیثیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

عورت کا بدلتا ہوا کردار اور اس کی تبدیل ہوتی ہوئی قدریں خاندانی انتشار کا باعث بن رہی ہیں۔ کیونکہ سماج میں اس کے بدلتے ہوئے کردار سے ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پا رہی۔ ایک طرف اس سے روایتی اور مثالی کردار کی توقعات ہیں کہ وہ گھر سنبھالنے والی، بچوں کی نگہداشت کرنے والی، وفا شعار خدمت گزار بیوی اور سر جھکانے والی بہو ثابت ہو اور اُس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ملازمت پیشہ اور بہترین رفیقِ کار کی ذمہ داریاں بھی پوری کرے۔ عورت خواہ کتنی ہی باصلاحیت اور ہمہ پہلو کیوں نہ ہو، بیک وقت اتنے کردار نبھانے کی سکت نہیں رکھتی۔ آج کے معاشرے میں عورت مرد کی نسبت زیادہ کشمکش اور ذہنی دباؤ کا شکار ہے، کیونکہ اس کے روایتی کردار کا تسلسل باقی نہیں رہا جو اسے توازن سے ہمکنار کر سکے۔ اس کے مقابلے میں مرد کا کردار زیادہ نہیں بدلا، اس کی ذمہ داریوں اور اس سے وابستہ توقعات میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ عورت کا کردار غیر واضح، متضاد اور اس سے وابستہ توقعات سے متصادم ہے۔ اس لیے اس کی اقدار بھی غیر واضح، متزلزل، متضاد اور بے یقینی کا شکار ہیں۔ اس کی بے یقینی اور کشمکش اس کے ذہن میں انتشار برپا کر رہی ہے۔ چونکہ وہ خود عدم توازن اور انتشارِ ذات کا شکار ہے، اس لیے اس کا خاندان بھی اس راہ پر چل نکلتا ہے۔ ایسے خاندان میں پرورش پانے والے بچے بھی کشمکش اور عدم توازن کو ورثہ میں پا کر ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے کے افراد مشترکہ خاندان کی خوبیوں اور مثالی اقدار کی خوابناک فضا میں ابھی تک کھوئے ہوئے ہیں، اس لیے جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ نیا خاندانی نظام وضع کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ خصوصاً نئے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ عورت کا کردار اور اُس کی اقدار طے کرنا اور بھی پیچیدہ اور نازک معاملہ ہے۔ ہم اقدار کی شکست وریخت کے کرب سے گزر رہے ہیں اور خاندانی زندگی کا تانا بانا بکھر رہا ہے۔ شہروں میں طلاق، بچوں کی نامناسب نگہداشت، لڑکے لڑکیوں کے ناجائز مراسم، میاں بیوی کے کشیدہ تعلقات، قرابت داروں سے دوری اور شکستہ خاندانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

فرد پر اثرات

ایک فرد کی صحت منداور متوازن زندگی نام ہے:

"Patterns of attitudes, values, purposes, goals, status and voles which grow out of his social experience and through which consciously or unconsciously, he hopes to make his life meaningful."(۲۵)

جدید معاشرے میں اقدار اور مقاصد میں توازن قائم رکھنا، مثبت رویوں کے ساتھ اپنے نصب العین کو حاصل کرنا، متعدد معاشرتی کردار نبھانا اور معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً غیر مستحکم معاشرے میں صحت مند متوازن زندگی گزارنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو چکا ہے۔

انسان کی پہلی اور بنیادی ضرورت معاشرتی تعلقات اور روابط ہیں تا کہ وہ معاشرے کا حصہ بن سکے۔ معاشرے کے ساتھ جڑا ہونا اسے احساسِ تحفظ اور خود اعتمادی عطا کرتا ہے جو اس کی ذہنی صحت مندی کے لیے ناگزیر ہے۔ بچپن میں یہ احساسِ تحفظ وہ والدین کی محبت اور خاندان میں اپنے مقام سے حاصل کرتا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا ہے معاشرے کے ساتھ اس کے روابط اور تعلقات کی گہرائی اس کا مقام و مرتبہ متعیّن کرتی ہے۔ ہم عصروں کا رویہ اور اس کی معاشرتی حیثیت اس کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر بعض حالات میں وہ اپنے ساتھیوں اور ہم مرتبہ لوگوں سے ہم آہنگی پیدا نہیں کر پاتا تو وہ اپنی معاشرتی حیثیت اور لوگوں کی نظروں میں اپنا مقام گر جانے کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ معاشرے سے کٹ جانے کا احساس اسے بے چین اور مضطرب کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شراب نوشی اور منشیات کا سہارا لے کر ان حالات سے فرار حاصل کرنے لگتا ہے۔

جدید معاشروں میں فرد کے لیے روایتی اخلاقی اقدار کو نبھاتے ہوئے معاشرتی حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی اقدار میں ٹکراؤ اس کے لیے ذہنی اضطراب کا باعث بن رہا ہے۔

"This is not true in modern society. The complexity of modern society is so great that many persons are called upon to play roles which are mutually irreconcilable. These role patterns were developed and handed down from a simpler structure in which

they bore some relationship to the actual situation. The individual today is faced, however, with new and often today different situations for which there are no accepted roles. Business roles call for an impersonal attitude toward persons in need, while one's belief as a Christian demand lenient treatment of the man behind in his mortgage. Social opinion moreover does not conform with reality."(۲۶)

جدید انسان روایتی اقدار کے شانہ بشانہ ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتا۔ وہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار میں تصادم کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اخلاقی اور معاشرتی اقدار میں بعدالمشرقین پیدا ہو چکا ہے۔ جدید سہولتیں، آرام و آسائش، بہترین تعلیم اور بلند معیارِ زندگی حاصل کرنے کی خاطر اسے اخلاقی قدروں کی کتنی ہی لاشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ذمہ داریوں کا پہاڑ اپنے کندھوں پر اُٹھائے، اخلاقی قدروں کی پامالی کا بوجھ اپنے سینے پر لیے نامعلوم منزلوں کی جانب رواں دواں ہے لیکن وہ ہانپ چکا ہے۔ اس کا ذہنی سکون، اطمینانِ قلب اور روحانی خوشی لٹ چکی ہے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر، ذہنی دباؤ، اضطرابِ قلب اور کئی ذہنی اور نفسی بیماریوں کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی اسّی فیصد جسمانی بیماریوں کے ڈانڈے اس کی ذہنی پریشانیوں اور نفسیاتی اُلجھنوں سے جا کر ملتے ہیں۔

مشینی اقدار کا مارا ہوا انسان تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہو چکا ہے۔ صنعت اور ٹیکنالوجی کی دنیا نے انسانی اقدار کو ملیامیٹ کر کے انسانی نفسیات پر جو اثرات مرتّب کیے ہیں، اس پر بحث کرتے ہوئے بیسویں صدی کے نامور مفکر Erich Fromm اپنی کتاب ''Escape from freedom'' میں لکھتے ہیں:

"Advances in technology have liberated many a man from hunger and physical want. Advances in scientific knowledge have freed him from ignorance and superstition (at least in theory) by providing him

with tested knowledge of the universe and man place in it ... These new freedoms have not brought the Utopia that was so optimistically expected ... he has no sense of participation in a number of warm, intimate, human relationships ... Modern man, freed from the bonds of pre-individualistic society, which simultaneously gave him security and limited him, has not gained freedom in the positive sense of the realization of his individual self ... freedom, though it has brought him independence and rationality, has made him isolated and thereby, anxious and powerless."[۲۷]

جدید معاشرتی زندگی کا المیہ فرد کی تنہائی اور اکیلا پن جو انسان سے انسان کا رشتہ ٹوٹ جانے سے جنم لے رہا ہے، معاشرے کے لیے ایک ناسور بنتا جا رہا ہے۔ ''David Riesman'' اپنی کتاب ''Lonaly Crowd'' میں لکھتے ہیں کہ انسان ہجوم کے اندر رہتے ہوئے بھی تنہا ہے۔ ''Lonaly crowd'' میں رہنے والا فرد اگرچہ انسانوں کے ساتھ مستقل رابطے میں رہتا ہے لیکن اس کا یہ میل ملاپ ان گہرے جذبوں اور احساسات سے عاری ہے جو اس کی سب سے پہلی انسانی ضرورت ہیں۔

صنعتی معاشرے کی مشینی اقدار کے ساتھ زندگی گزارنے والا انسان عقلیت اور معروضیت کے بوجھ تلے ایسا دَبا ہے کہ وہ نازک جذبوں اور لطیف احساسات کا بار اُٹھانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ انسانی قدروں کی موت سے دل تک رسائی بھی اپنی موت آپ مرگئی۔ گہرے جذباتی رشتے ناپید ہوئے ہیں تو ان کی جگہ لینے والے غرض کے رشتے آسودگی سے خالی اور خوشی سے عاری ہیں۔ دوستوں کا ساتھ، رشتوں کا پیار اور ذہنی رفاقت چھن جانے سے فرد تنہائی کے صحرا میں بھٹک رہا ہے۔ اس کی آبلہ پائی سے اس کا ذہن بھی لہولہان ہو چکا ہے۔

"The concept of isolation has direct implications for several forms of personality disorganization. Among these specific manifestation are (1) Alcoholism - the alcoholic often has a case history of isolation reaching far back into his childhood; the compulsive nature of his drinking intensifies his later isolation, as he progressively loses contact with family, friends, and fellow workers; (2) mental disorder - the mentally ill person is typically an isolated individual, as we have suggested; the most important psychosis (schizophrenia) is characterized by a gradual withdrawal from the world of others until isolation becomes virtually complete; (3) suicide - the suicide has so completely broken with the group that further existence is meaningless. This is the final isolation of death."[۲۸]

"In one study of mental disorder, the concentration of schizophrenia was found to be closely correlated with such indices of isolation as knowing the name of fewer personal friends, fewer acquaintance; more renting than owing of names."[۲۹]

اخلاقی وتہذیبی قدروں کے زوال نے انسان کے باہمی رشتوں کو بُری طرح پامال کیا ہے۔اس حوالے سے صفیہ

عباد لکھتی ہیں:

''عصری انتشار اور سیاسی بدامنی سے یہ قدریں اب زوال پذیر ہیں۔ ان کی زوال پذیری درحقیقت ہماری ہی زوال پذیری ہے۔ اس کے باعث باہمی انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ بھروسہ، اتفاق، پہچان سب اس کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ گھروں میں کوئی دوسرے سے کھانے کی پلیٹ لینے کے لیے تیار نہیں، کیا معلوم دوسرے نے اس میں زہر...... بیٹا باپ کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے اور باپ بیٹے کو...... گھروں، دفتروں، بازاروں میں وہ ایک دوسرے کو تاڑ رہے ہیں۔''(۳۰)

قدروں کا زوال انسانی رشتوں کے تقدس کو بُری طرح پامال کر رہا ہے۔ وہ کس پر بھروسہ کرے؟ اس کا اعتماد مجروح ہو چکا ہے۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو کر اپنی ہی ذات کے خول میں سمٹ رہا ہے۔

انفرادی قدروں کا زوال فرد سے اس کا تشخص چھین رہا ہے۔ وہ اعلیٰ تر انسانی سطح کی بلندیوں سے ''کایا کلپ'' ہو کر مکھی، بندر اور بکریوں کی پست سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ جب وہ اعلیٰ انسانی قدروں سے ناآشنا ہو جاتا ہے تو انسانیت بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

تصادمِ قدر (Value Conflict) کے منفی اثرات نفسیاتی الجھنوں، ذہنی بیماریوں، منشیات کے استعمال اور خودکشی کی انتہائی صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔

ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کی وجہ سے کی گئی خودکشی پر ایک تحقیقاتی رپورٹ کے مندرجات پیش کیے جاتے ہیں:

"The highest rates of suicide occur among patients with major affect or mood disorders (including depression) alcoholics, and schizophrenics, individual with clinical or major depression have a 15 percent rate of suicide; ten percent of schizophrenics commit suicide while alcoholism caries a four percent to six percent risk."(۳۱)

امریکہ میں کی گئی اس تحقیقی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں تصادمِ قدر کی سطح خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے۔ جو افراد میں schizophrenia، depression اور alcoholism پیدا کر کے انہیں خودکشی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک خصوصاً امریکہ میں نوعمری کی خودکشی کے رجحانات اقدار کی شکست و ریخت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ امریکی معاشرے کے لیے یہ بڑھتا ہوا رُجحان سنگین خطرہ بن کر اُبھر رہا ہے۔

> "Concurrently, the rate of suicide among young adolescents increased 120% from 1980 to 1992. Once extremely rare among teenagers, suicide has become the third ranking cause of their deaths, after accidents and homicides."(۳۲)

صنعتی معاشرے نے خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں، خاندانی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ Old People Homes بے حس صنعتی معاشرے کا پیدا کردہ ادارہ، اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ نئی اور پرانی نسل کے درمیان احساس و جذبات کے تمام بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ اس شکستگی نے دونوں نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ والدین کے ساتھ گہرے جذباتی رشتے کا خلا نوجوان نسل میں عدم تحفظ اور داخلی ناآسودگی پیدا کر رہا ہے۔ خاندانی وحدت ختم ہونے سے والدین بچوں میں روایتی اور اخلاقی اقدار منتقل کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ نئی نسل کے پاس اقدار و روایات کی ٹھوس زمین ہی موجود نہیں، جس پر قدم جما کر وہ اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے متوازن زندگی گزار سکیں۔ ایک طرف نئی نسل اقدار کا مثالی نمونہ نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی پراگندگی کا شکار ہے تو دوسری طرف عمر رسیدہ افراد خاندانی زندگی سے کٹ کر مایوسی، تنہائی اور depression کا شکار ہو جاتے ہیں اور موت انہیں آخری پناہ گاہ نظر آنے لگتی ہے۔

> "Age-specific rates of Americans suicides have consistently been highest among older person though accounting for 13% of the population, older Americans commit nearly one fifth of all suicides ... Why the suicide rate of elderly black Americans is but

a fraction of that of their white counterparts has intrigued workers. According to a 2002 study by Joan Cook and her colleagues (in the August special suicide issue of the American Journal Geriatric Psychiatry) the answer may lie in the strong religious faith and social support of African Americans."(۳۳)

امریکی جریدے کی اس تحقیقاتی رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ اقدار انسانی زندگیوں پر کس قدر گہرے اثرات مرتّب کرتی ہیں۔ مذہبی اقدار پر سیاہ فام باشندوں کا یقین اوران اقدار کی سالمیت ان کے رویوں کو مثبت سمت عطا کرتی ہے۔ دوسرا اہم عنصر معاشرتی تحفظ ہے۔ امریکی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی سیاہ فام باشندے اپنی ثقافتی ومعاشرتی اقدار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی خاندانی زندگی سفید فام لوگوں سے زیادہ منظّم اور مستحکم ہے جو ابھی تک اس درجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوئی کہ اس کے افراد تنہائی، عدم تحفظ اور انتہائی مایوسی کا شکار ہو کر خودکشی کی طرف مائل ہونے لگیں۔

اس حوالے سے ہم پاکستانی معاشرے پر نظر ڈالیں تو ہمیں بزرگ افراد میں خودکشی کا رُجحان نہیں ملتا۔ اس کی وجہ خاندانی زندگی کی اقدار ہیں جن میں آج بھی بزرگوں کا مقام اوراحترام باقی ہے۔ مذہبی اقدار پر یقین بھی اس ضمن میں اہم ہے۔ ہمارا مذہب والدین کی خدمت اوران کے ساتھ بہترین سلوک کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

اقدار کی شکست وریخت کے اثرات غیر ملکی شہریت اختیار کرنے والے افراد کی دوسری نسل پر بہت نمایاں ہیں۔ یہ نسل دوہری اقدار کے ساتھ پرورش پاتی ہے۔ گھر میں ان کے والدین ان کی پرورش اپنی آبائی تہذیب وثقافت کی بنیادوں پر کرتے ہیں جبکہ معاشرے میں انہیں مختلف اقدار کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گھر سے باہر کی دنیا میں قدم رکھتے ہی وہ جان جاتے ہیں کہ اپنی خاندانی اقدار وروایات کے ساتھ وہ معاشرے سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا اپنی آبائی اقدار پر یقین و بھروسہ متزلزل ہونے لگتا ہے، والدین کی سچائی معتبر نہیں رہتی، ان کی شخصیت کا اعتماد بکھرنے لگتا ہے اور وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنا تشخص کھونے لگتے ہیں۔ وہ بارڈر لائن پر رہنے والی دوغلے پن کا شکار شخصیت ہے، نہ تو وہ معاشرے کو پوری طرح اپنا سکتا ہے اور نہ اپنی اقدار کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔ عدم تحفظ، داخلی ناآسودگی، معاشرتی تنہائی اور انتشارِ ذات اس نسل کا مقدر ہے۔

امریکہ اور یورپی ممالک میں اقدار خصوصاً اخلاقی اقدار کے تنزل نے معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نئی نسل، جو اخلاقی اقدار سے بے پرواہ اور بے خبر ہے، بے راہرو ہوکر اخلاقی پستی کے اندھیرے غار میں اترتی چلی جا رہی ہے، جہاں سے واپسی ناممکن نظر آ رہی ہے۔ خاندانی اقدار چکنا چور ہو چکی ہیں۔ اس گھمبیر اور پریشان کن صورتِ حال کے متعلق Stephanie Coontz اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

> "Thirteen years ago, vice president Dan Quayle attached the producers of TV sitcom's Murphy Brown for letting her character bear a child out of Wedlock, claiming that the show's failure to defend traditional family values was encouraging America's youth to abandon marriage. His speech kicked off more than a decade of outcries against "collapse of the family". Today, such attacks have given way to a kinder, gentler campaign to promote marriage, with billboards declaring that "Marriage Works" and books making "The Case of Marriage". What these campaigns have in common is the idea that people are willfully refusing to recognize the value of tradition families and that their behavior will change if we can just enlighten them."[۳۴]

سماجی اقدار کے بدل جانے سے معاشرے، خاندان اور افراد پر کیا اثرات مرتّب ہوئے ہیں، اس کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> "The so-called divorce revolution, in just one aspect of

the world wide transformation of marriage … In the United States and Britain, divorce rates fell slightly during 1990s, but the incidence of cohabitation and unmarried child-raising continues to rise, the entry of women into the workforce in the last third of the 20th century was not only a US phenomenon. By the 1970s, women in America and most of the Europe could support themselves if they need to. The 1980s saw an international increase in unmarried women having babies, as more gained the ability to say no to shotgun marriages, and humanitarian reforms lowered the penalties for out-of-wedlock births. That decade also saw a big increase in couples living together before marriage … But marriages as a public institution exerts less power over people's lives now that the majority of Americans spend half their adult lives outside marriage and half of all kids spend part of their childhood in a household that does not include their two married biological parents. And unlike in the past, marriage or lack of marriage does not determine people's political and economic rights.

From Turkey to South Africa to Brazil, countries are

having to notify the legal rights and obligations of single individuals and unmarried couples raising children, including same-sex couples. Canada and the Netherlands have Joined Scandinavia in legalizing same-sex marriage, and such bastion of tradition as Taiwan and Spain are considering following suit." (۳۵)

اخلاقی دیوالیہ پن کی اس داستان کے بعد، جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، برطانیہ میں کیے جانے والے ایک سروے کی رپورٹ پیش کی جاتی ہے، جس کا موضوع ہے، ”Traditional Families hit by declining morals, say mothers“۔

Stability: Having a family meal together is important to most mums

The traditional family unit is in meltdown due to plunging moral values and the rise of single parents, according to a survey of mothers.

Nine in ten claim there has been a "breakdown in family life in Britain today", with the demise of the family meal and the rising popularity of video games among the worst culprits for driving rifts in the nuclear family.

Most blame the Government for fuelling the breakup, with almost two thirds claiming that Labour "doesn't like traditional family set-ups and seems to favour

single parents and working mums".

A quarter of mothers reported that the traditional family structure is under attack from the increasing numbers of unmarried couples and same sex parents.

And while single mothers enjoy tax breaks, more than half of two-parent families are struggling to make ends meet and a third are in debt, according to the 21st Century Family Life Survey.

In an alarming snapshot of family life in modern Britain, half of the 1,736 mothers surveyed blamed low moral standards, higher levels of sexual imagery, drug use, violence and bad language for the destruction of family life.

The most important factor for the disintegration of the parent-child relationship is the failure of most families to eat a proper meal together, with many working parents resorting to ready meals and fast food.

Other factors for the malaise include children spending long hours playing video games, computers, or watching the television. Half of youngsters now have a television set in their bedroom

by the age of 10, spending on average 25 hours a week in front of their television or game console screens - rising to 42 hours during the holidays, mothers reported.

Consumerism

A growth in consumerism, with longer shopping hours and Sunday trading was also attacked, with a third claiming that parents were too busy shopping to spend quality time with their children, according to the women's magazine survey.

Julian Linley, Editor of First magazine which commissioned the survey, said: "Families feel under attack from all directions and priced out of modern Britain.

"Nearly all families are struggling to juggle family life and the need to earn more and more money to keep their heads above water.

"At the same time modern society lets down British families.

"Family values are under pressure, morals hard to uphold and discipline derailed.

"Drugs and alcohol consumption among the young

and vulnerable are on the increase and high taxation and housing costs strangle the family unit.

"No wonder families feel they are at war with modern society."

Researchers also found that nine in ten mothers worry about their children's safety and some claimed children are no longer safe in Britain due to the easy availability of drugs and alcohol.

Three-quarters of working mothers would reduce their working hours if they could afford it and more than half said they are fulfilling their full potential as a mother.

An analysis of the results revealed that families in the North are closer than those in the South, with children seeing their grandparents and other relatives more frequently.[(۳۶)]

اقدار کی شکست وریخت، معاشرتی، خاندانی اور انفرادی ہر سطح پر منفی اثرات کی حامل ہے، سوائے اس وقت کے جب پرانی اقدار ختم ہو کر ان کی جگہ نئی مثبت اقدار جنم لے رہی ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ Robin M. Williams, JR, "Individual and Group Values", Social Psychology: Reading and Perspective, edited by Edgar F. Borgatta, Chicago: Rand McNally & Company, 1969, p.333

۲۔ Krech, Crutchfield, Ballachey, Individual in Society, Tokyo: Kogakusha Company, Ltd., 1962, p.102

۳۔ Farwa Dawood: Exploring intergenerational changes in family values, Research report M.Sc., Islamabad: Quaid-i-Azam University, NIP, 2007, p.6-7

۴۔ Personal values: http://en.wikipedia.org/wiki/value, 09. 07. 2008

۵۔ Philip K. Bock: "Modern Cultural Anthropology", 2nd edition, Alfred Knop Inc., 1974, p.347

۶۔ American Heritage Dictionary, 2003

۷۔ Knox, D., Schacht, "An introduction to marriage and the family", Choice in relationship, 7th ed., Belmont, CA: Thomson Learning Inc., 2002, p.20

۸۔ John M. Shepard, "Basic Socially"

۹۔ Frank R. Scarpitti: "Social Problems", 3rd ed., printed in USA, 1980, p.130

۱۰۔ شیخ محمد اکرام، ''ثقافتی ورثہ کی نوعیت''، مشمولہ پاکستانی ثقافت، مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۶۸-۷۲

۱۱۔ پروفیسر عبدالحمید تگہ: ''عمرانی اصول''، ملتان: اسماعیل برادرز پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۶

۱۲۔ Krech, Crutchfield, Ballachey: "Individual in Society", Tokyo: McGraw-Hill Book Company Inc. Ltd., 1962, p.351

۱۳۔ Philip. K. Bock: "Modern Cultural Anthropology", 3rd ed., Value System, Alfred A. Knope Inc., 1974, p.347

۱۴۔ Evon Z. Vogta and John M. Roberts, "Reading in Sociology", The study of values, New York: Thomas Y. Crowell Company, 1972, p.67

۱۵۔ Philip K. Bock: "Modern Cultural Anthropology", 2nd edition, Alfred Knop Inc., 1974, pp.354-357

۱۶۔ Elliot and Merill: "Social disorganization", 4th ed., New York: Harper & Row Publishers, 1961, p.34

۱۷۔ "Society Today", CRM Books, California: Del Mar, 1971, p.49

۱۸۔ Frank R. Scarpitti: "Social Problems", 3rd ed., printed in USA, 1980, p.13

۱۹۔ شیخ محمد اکرام، ''ثقافتی ورثہ کی نوعیت''، مشمولہ پاکستانی ثقافت، مرتبہ ڈاکٹر رشید امجد، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۶۹

۲۰۔ Krech, Crutchfield, Ballachey, "Individual in Society", Tokyo: McGraw-Hill Book Componay Inc., Kogakusha Company, Ltd., 1962, p.192

۲۱۔ "Social Disorganization", Ernest W. Burgess, "Values and Sociological Research", Social Problems, 2:16-20 (July, 1954), p.16

۲۲۔ Krech, Crutchfield, Ballachey: "Individual in Society", Tokyo: McGraw-Hill Book Company Inc. Ltd., 1962, p.193

۲۳۔ پروفیسر عبدالحمید تگہ: ''عمرانی اصول''، ملتان: اسماعیل برادرز پبلشرز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۱

۲۴۔ Elliot and Merill: "Social disorganization", New York: Harper & Row Publishers, 1961, p.34

۲۵۔ ibid, p.47

۲۶۔ W. Lloyd Warner and James C. Abegglen, "Big Business Leaders in America", New York: Harper & Brothers, 1955, p.14

۲۷۔ Erich Fromm, "Escape from freedom", New York: Rinehart and Company Inc., 1941. p.16

۲۸۔ E. Tartly Jacob, "The Social Isolation Hypothesis and Schizophrenia", American Sociological Review, October 1954, p.575

۲۹۔ Elliot and Merill: "Social disorganization", New York: Harper & Row Publishers, 1961, p.59

۳۰۔ صفیہ عباد، ''رشید امجد کے افسانوں کا فنّی و فکری مطالعہ''، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۶

٣١- When death is sought, Assisted suicide and Euthanasia in the medical context. 1998. www.health.state.ny.us/nyscdh/provider/death.htm

٣٢- US Department of health and human services, "Suicide among older persons, United States, 1980-1992", MMWR [Jan 12, 1996], www.health.state.ny.us/nyscdh/provider/death.htm

٣٣- Kearls Guide to the Sociology of Death: Suicide US Department of health and human services, www.health.state.ny.us/nyscdh/provider/death.htm

٣٤- Stephanie Coontz: For better, for wors, marriage means something different now, Washington Post.com, Sunday, May 1, 2005, www.washingtonpost.com/wp-dyn/content/article/2005

٣٥- ibid

٣٦- Traditional Families hit by declining morals, say mothers, by Rebacca Camber, www.dailymail.co.uk/femail/article-392846/traditions-families-hit-declining-morals-say-mothers.html

باب دوم

شہرِ بے مثال

''شہرِ بے مثال'' بانو قدسیہ کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ فنّی وفکری حوالے سے یہ اُردو ناول کی تاریخ میں کسی بڑے مقام کا حامل نہیں ہے۔ اسے بانو قدسیہ کے فکری ارتقاء کی پہلی سیڑھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اَکہری سطح کا ناول ہے، جس میں فکری گہرائی اور قصے کی تہہ داری کی بجائے سادہ اُسلوب میں سیدھے سادے انداز سے کہانی بیان کی گئی ہے۔

ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ رشیدہ بہاول پور کی رہنے والی سادہ مزاج لڑکی ہے۔ اس نے بی اے تک بہاول پور سے تعلیم حاصل کی۔ باپ کی وفات کے بعد اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن پھر ماں سے اصرار کر کے مزید تعلیم کے لیے لاہور کے کالج میں ایم اے سائیکالوجی میں داخلہ لے لیتی ہے۔ لاہور میں وہ اپنی دور کی رشتہ دار خالہ فیروزہ کے گھر ٹھہرتی ہے۔ خالہ کا گھرانہ لاہور کی روشن خیالی کا مظہر ہے۔ کالج میں بھی رشیدہ کو فیشن ایبل اور آزاد خیال لڑکیوں کی صحبت میسر آتی ہے۔ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی لیکن لاہور شہر کی جدید سماجی زندگی اور روشن خیالی سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی رونما ہونے لگی ہے۔ وہ پردہ ترک کر دیتی ہے اور خود کو نئے ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتی ہے۔

کالج کا ایک لڑکا ظفر خطوں کے ذریعے اس سے اظہارِ محبت کرتا ہے، جس کا وہ کوئی جواب نہیں دے پاتی، لیکن خط چھپا کر سوٹ کیس میں بند کر دیتی ہے۔ خالہ فیروزہ ایک سال رشیدہ کو گھر میں مہمان ٹھہرا کر اب اس سے تنگ آ چکی ہیں۔ وہ کسی بہانے اسے ہوسٹل میں بھیج دینا چاہتی ہیں۔ انہیں یہ بہانہ مل جاتا ہے، وہ رشیدہ کے خط پڑھ لیتی ہیں اور اُس پر آوارگی کا الزام لگا کر اُسے گھر سے نکال دیتی ہیں۔

رشیدہ، ظفر کے خط لے کر اس کے والد کے پاس شکایت کے لیے پہنچ جاتی ہے۔ ملک بختیار اُسے تسلی دیتا ہے اور ظفر کے رویے کی معذرت طلب کرتا ہے۔ یہاں سے ملک بختیار اور رشیدہ کے تعلقات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ رشیدہ اپنی سہیلی ڈمپل کے گھر منتقل ہو جاتی ہے۔ ڈمپل انتہائی ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی ہے۔ اس کی صحبت میں رشیدہ کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ ہو بہو ڈمپل کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ شاندار اور عیش وعشرت کی آرام دہ زندگی گزارنے کی خواہش میں رشیدہ

اپنے باپ کے برابر ملک بختیار سے شادی کر لیتی ہے۔لیکن شادی کے بعد اُسے ذہنی سکون اور حقیقی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔ وہ پچھتاوے کا شکار ہوکر نفسیاتی مریض بن جاتی ہے اوراسی جنونی کیفیت میں اپنے خاوند کا قتل کر دیتی ہے۔

رشیدہ کی محبت میں دیوانگی کی حد تک ڈوب جانے کے باوجود ظفر نا کامی پر ذہنی توازن کھونے کی بجائے روحانیت کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے،اور آخر میں دلبر داشتہ ہوکر شہر چھوڑ دیتا ہے۔

اقدار کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور اس کے نتائج کے حوالے سے یہ ناول بانو قدسیہ کی فکر کے ابتدائی خدوخال ہمارے سامنے لاتا ہے۔

ناول میں لاہور کی سماجی زندگی،اس کی بدلتی ہوئی اقداراوران کی شکست وریخت کی زد میں آنے والے کرداروں کوموضوع بنایا گیا ہے۔ناول کا شہرِ بےمثال لاہور ہے۔یہی اس کا مرکزی کرداراور ہیرو ہے۔اس کے اِردگرد کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔مصنفہ کی دلچسپی کا بنیادی مرکز رنگ بدلتی رشیدہ میر ہے، نہ ہی ملک بختیار اور ظفر کے درمیان ایڈیپس کمپلیکس سے ابھرتی ہوئی نفسیاتی کشمکش ہے، نہ ہی یہ ازلی وابدی عشقیہ تثلیث کی داستان ہے، بلکہ یہ ناول لاہور شہر کی کیمیا گری اور ساحری کے کمالِ فن کا افسانہ ہے۔

بانو قدسیہ نے لاہور کو ایک شہر نہیں شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے جس کا اپنا ایک مخصوص طرزِ فکر واحساس، اقداراورروایات ہیں۔انھوں نے ساٹھ اور ستّر کی دہائی کے درمیان لاہور شہر کی سماجی زندگی اور اس کی اقدار وروایات کو موضوع بنایا ہے۔یہ وہ عرصہ ہے جب لاہور دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور جدید طرزِ زندگی کا مرکز و منبع تھا۔ ٹی وی ہر گھر میں متعارف نہیں ہوا تھا اوراس کی بدولت چھوٹے شہروں کے باشندے بڑے شہروں کی جدید زندگی،اس کی بدلتی ہوئی اقداراور روشن خیالی سے آشنا نہیں تھے۔

بانو قدسیہ لاہور کی برتری کی گواہ ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس شہر کا مزاج دوسرے تمام شہروں سے جدا اور نرالا ہے۔ اس کی زندگی میں بے پناہ کشش اور قوتِ تسخیر ہے جو ذہنوں کو پلٹ دیتی ہے۔

ناول میں مصنفہ شہر لاہور کی شخصیت کے پرت کھولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں کے بزنس مین، سرکاری افسر، طوائفیں اور طالب علم اس شہر کی شخصیت و کردار کے مختلف زاویے ہیں، جن سے مل کر شہر کا مزاج بنا ہے۔ یہ لاہور شہر کی صدیوں پرانی تہذیب وثقافت کے امین بھی ہیں اور جدید طرزِ فکر واحساس اوراقدار کے داعی بھی۔

بانو قدسیہ ناول میں اس خیال کو پیش کرتی ہیں کہ بہاول پور کی سیدھی سادی لڑکی لاہور میں آکر جن حالات سے

دو چار ہوئی وہ دراصل لاہور کی سماجی زندگی کے پیدا کردہ تھے۔ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ لاہور شہر کی شخصیت میں کیمیا گری کا وہ وصف ہے جو انسان کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

وہ لاہور کی رنگین زندگی اور جدید ماحول کو رشو کی اقدار میں تبدیلی کا اصل ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ لاہور کی زندگی اتنی پُرکشش، دلکش اور جاذبِ نظر ہے کہ کوئی انسان اس کی قوتِ تاثیر سے بچ نہیں سکتا۔اس شہر کی اقدار اتنی توانا ہیں کہ نووارد کے لیے اپنی بنیادی اقدار کو ثابت وسالم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔وہ لاہور کا موازنہ بہاول پور سے یوں کرتی ہیں:

''بہاول پور سے لاہور تک وقت اس قدر لمبا ہو جائے گا اس کا رشیدہ کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جٹ طیاروں کے عہد میں یہ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا لیکن اس سفر میں رشو جان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر کوئی لاس اینجلس کے دل ہالی وڈ میں گھسیٹ لایا ہے۔''(۱)

لاہور میں داخل ہوتے ہی جو منظر سب سے پہلے رشو کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے وہ یہاں کے سائن بورڈ ہیں۔

''لیکن بتیوں کی جگمگاہٹ اور بڑے بڑے سائن بورڈوں کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھی۔ صبیحہ، نیلو، بہار، شیریں کی بڑی بڑی شبیہیں خوبصورت جادوگرنیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں...... یہ سارے سائن بورڈ رنگ ونور کا گلال بکھیرے اسے بلا رہے تھے۔سارے لاہور کا گلیمر اس کے استقبال کے لیے بڑھا آ رہا تھا۔''(۲)

لاہور کا گلیمر ہی اس کی شخصیت کی پہچان ہے۔اس گلیمر نے رشو کے ہوش وحواس چھین لیے اور وہ تن من دھن سے لاہور کی گرویدہ ہوگئی۔

بانو قدسیہ نے لاہور شہر کو کہانی کا مرکزی نکتہ بنایا ہے۔وہ دکھاتی ہیں کہ کس طرح کسی شہر کی سماجی زندگی اور اس کی معاشرتی اقدار انسانی شخصیت پر گہرے اثرات مرتّب کرتی ہیں۔

''ساری بات تو یہ تھی کہ بڈھے دریا اور ہڈیارے نالے کے درمیان جو دنیا آباد تھی، سارے شہروں کی خلقت پر مستزاد تھی۔

عام آدمی کی ایک شہ رگ ہوتی ہے جس سے اس کا لہو جاری وساری رہتا ہے۔اس بے مثال

شہر کی شہ رگیں بھی دو تھیں؛ ایک جو لہو کی گردش کے لیے مخصوص تھی، دوسری وہ جس میں احساسِ برتری کا ناگ پھن اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ اس شہر کے لوگوں کو زیادہ عزیز تھی۔ شاید لہو کی گردش بند ہونے پر وہ زندہ رہ سکتے تھے۔ لیکن احساسِ برتری کے بغیر انہیں پل بھر بھی سانس لینا دشوار ہو جاتا۔''(۳)

لاہور کی ہنگامہ خیز سماجی زندگی، یہاں کی جدید اقدار اور مخصوص طرزِ فکر و احساس اسے منفرد شخصیت کا شہر بنا دیتے ہیں۔ لاہور کی برتری پر وہ ایک حکایت منطبق کرتی ہیں:

''شیر نے لمبی سی جمائی لی اور مسکرا کر بولا، بوزنے تو کہتا ٹھیک ہے۔ لیکن شہزادوں کی تربیت میں فقط گُر کا فرق ہوتا ہے۔ تجھ میں اور اتالیق بلند مرتبت میں فقط ایک فرق ہے۔ تو منہ کے بل درخت سے اترتا ہے اور ریچھ سرین کے بل......سارے جنگل کے درندے بھالو کے اس وصف سے ناآشنا ہیں۔ سو ہم نے اسے اسی خوبی کے باعث منتخب کیا۔''(۴)

''لاہور میں بھی بھالو کی سی خوبی تھی۔ ساری دنیا جہاں منہ کے بل اپنے گن اور کرتب کا اظہار کرتی، وہاں لاہور والے منہ میں کوکا کولا کی بوتل لیے سرین کے بل اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔ لاہور والوں میں محض گُر کا فرق تھا، اس لیے دوسرے شہروں والے اس کے سامنے انگشت بدنداں تھے۔''(۵)

لاہور شہر کی برتری کو دکھا کر بانو قدسیہ یہ بتاتی ہیں کہ لاہور کے شان و شکوہ اور کروفر کے دبدبے سے اگر رشو مرغوب ہوگئی تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔

جب لاہور شہر کے احساسِ برتری نے رشو کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تو پھر رشو کے لیے اپنی اقدار کو چھوڑ کر لاہور کے ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینا فطری عمل نظر آتا ہے۔

کہانی کا عہد وہ ہے جب شالیمار میں پکنک منانا پرانا فیشن نہیں تھا، بلکہ عین جدت پسندی اور رومان پروری تھا۔

''مِس آپ بتایئے بھلا کالج اور شالیمار میں کیا فرق ہے؟ فیرول تو یہاں بھی پروفیسر ضیا کا ہوگا اور وہاں بھی۔ کم از کم پکنک اولڈ فیشن چیز نہیں ہے، پارٹی کی طرح......''(۶)

رشو کو شالیمار کی رومان پرور فضاؤں اور شان و شوکت نے بے حد متاثر کیا۔

''ساری ٹولی میانہ محل میں پہنچ چکی تھی۔ پروفیسر اعجاز اس جگہ کھڑے تھے جہاں سنگِ مرمر کی ''چدر'' موجود ہے۔ اس آبشار کی لذت زیب النسا دختر عالمگیر کے دل پر کندہ ہے...... واہ ڈمپل واہ! یہاں ٹب اور سنک کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں نہانے کو فوارے ہوں وہاں ٹبوں کے ساکت پانیوں کا کیا فائدہ؟...... رشیدہ صرف خاموش تھی...... چپ چاپ نیچے تکے جا رہی تھی۔ اس حمام نے تو جیسے اسے مبہوت کر دیا تھا۔''(۷)

شہر کے حسن و دلکشی، رومان پرور فضاؤں اور فیشن پرست لڑکیوں کے ناز و ادا نے رشو کے ذہن کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''میز پر سفید دستانے اور لمبوترا پرس رکھنے والی ڈمپل امریکی اشتہاروں کی طرح مجلّی اور چمکدار تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں چمکتے دانت، اوپر کو اُٹھی ہوئی پلکیں، سر پر بالوں کی آراستہ پگڑی، کانوں میں پہنے ہوئے لیمن ڈراپ جیسے آویزے، سب کچھ اشتہاری تھا۔ وہ لشتم پشتم سویّوں کی طرح بڑی لچھے دار اور چکنی چکنی انگریزی بولتی تھی، اور بولتی چلی جاتی تھی، ڈمپل سر کے بالوں سے لے کر جوتی کے پنجے تک بڑی دلآویز تھی۔''(۸)

''اس نے سلیک نما شلوار، جس کے پائنچوں میں بٹن لگے تھے، پہن رکھی تھی۔ قمیض میں دونوں جانب چاک نہ تھے، سرین سے نیچے پچھلی جانب البتہ ایک دو ٹک ڈال کر چلنے کی سہولت کو ذرا گھیرا کھولا ہوا تھا۔ کمر پر عین کولہوں کے اوپر فٹ بھر زِپ تھی...... اس لباس میں ڈمپل یوں چل رہی تھی جیسے بورژوا چینی عورتیں۔''(۹)

بانو قدسیہ ناول میں جا بجا اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ شہر کی تہذیب و ثقافت انسانی نفس پر اثر انداز ہو کر اس کی زندگی پر گہرے اثرات مرتّب کرتی ہے۔ ان کا نظریہ ہے:

''دراصل سارا فتور لہو کا ہے...... انسانی لہو کا...... شہروں کے لہو کا...... تہذیبوں کے لہو کا۔''(۱۰)

شہر اور تہذیب کے لہو نے رشو پر اثر انداز ہو کر اس کے طرزِ فکر و عمل کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا۔

''اب ضمیر دن بدن سست الوجود ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی ریگمال سی چیز دل کی کھردری سطح کو میوزیک فرش جیسا چکنا بنا رہی تھی، پہلے وہ لمبی سی چوٹی کرتی تھی، اب ڈھیلے ڈھالے بال

لمبے کانوں کو چھپا کر جوڑے کی شکل میں بندھنے لگے۔ ہر روز کالج سے واپسی پر قمیض میں فٹنگ تبدیل ہونے لگی۔ نامعلوم سی لپ اسٹک بھی کہیں سے آ گئی اور پلکوں کے سرے بھی برش سے اوپر کی طرف موڑے جانے لگے...... یہ ساری تبدیلیاں ظاہری تھیں۔ایک ایسی تبدیلی بھی تھی جو اندر ہی اندر سانپ کی کینچلی کی مانند اپنا وجود نئے سانچے میں بدل رہی تھی۔ اس تبدیلی کا خود رشیدہ کو بھی علم نہ تھا۔اسے تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ بازار جانے لگی۔کس دن اس نے انٹر کالج مباحثوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا اور کب سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے لگی۔ بالکل جس طرح چولہے پر چڑھی کیتلی کے اندر ذرّات کی تہ کھپڑ کی طرح جم جاتی ہے اسی طرح آہستہ آہستہ رشیدہ کی اَنا نے اپنے گرد جوازوں،تاویلوں،منطقوں کی فصیل تعمیر کر لی تھی۔

گھر سے پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ایک بار جب سیتا مہارانی باؤنڈری لائن الانگ گئیں تو سنگ دیپ تک کا سفر پلک جھپکتے میں ختم ہو گیا۔''(۱۱)

رشو کی یہ ساری تبدیلیاں غیرارادی اور بےاختیاری تھیں۔مصنفہ لکھتی ہیں:

''اوران کو بھول گیا کہ لاہور نے رشو کو کس قدر ملوث کر دیا ہے۔''(۱۲)

گویا لاہور عامل ہے اور رشو معمول۔

لاہور شہر کے بزنس مین،سرکاری افسر، طالب علم اور طوائفیں یہاں کی سماجی زندگی کے مختلف گوشوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ یہ سب مل کر لاہور کی وہ فضا تیار کرتے ہیں جس نے رشو کو بدلنے پر مجبور کر دیا۔

سرکاری افسر

اہلِ لاہور پرانی تہذیب وثقافت،نئی اقدار اور جدید فکر کے پروردہ ہیں۔خالو جمال لاہور کے نمائندہ سرکاری افسر ہیں۔ان کا گھرانہ لاہور کی جدید زندگی اور روشن خیالی کا مظہر ہے۔

''میں اماں کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ خالہ فیروزہ کا گھر روشن خیال گھر ہے۔ یہاں تنویر سائیکل پر اپنے کالج جاتی ہے۔اس کے بال کٹے ہوئے ہیں۔ وہ......اور یہاں خالو کے

دوست کئی انکل بلا تکلّف آتے ہیں اور پہروں رہتے ہیں۔توبہ! توبہ! اماں سمجھنے کی کوشش بھی نہ کریں گی کبھی۔'' (۱۳)

خالہ فیروزہ شہر کی شوقین مزاج خاتون ہیں۔ان کے حوالے سے لاہور کی معاشرتی زندگی کے کئی پہلو ہمارے سامنے روشن ہوتے ہیں۔یہاں افسروں کے گھروں کا کاروبار ملازمین کے سر پر چلتا ہے۔

''خالو جمال کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔لیکن امورِ خانہ داری بڑے وسیع و عریض قسم کے تھے۔ باورچی خانے کے کام،تنویر باجی کے چھوٹے موٹے اموراور کپڑے دھونے کی ذمے داری انوری کی،اندر باہر کی صفائیاں،بھینسوں کی دیکھ بھال،مرغیوں کی غور و پرداخت کے لیے رمضان، چھ کنال کی کوٹھی میں قلمی اورتخمی آم کے بوٹے، نئے کینو اور ایلچی کے پیڑ اُگانے، لان جھاڑتے وقت پر ٹیوب ویل لگانے......غفور مالی۔ان تینوں کے علاوہ غلام رسول کے ذمے متفرق کام تھے......خالو جمال کی کار کا ٹوکن بنوانا،بجلی کا بل، ٹیلی فون کا بل،منی آرڈر کرانا،لفافوں پر ٹکٹیں لگانا،راشن خریدنا،بنک میں روپیہ جمع کرانا اور نکلوانا،دعوتی کارڈوں کی وصولی اور چپراسی کی ڈاک بک میں دستخط کرنا،کوئلہ، چاول کے پرمٹ حاصل کرنا، ہاؤس ٹیکس ادا کرنا، مال کی دکان کا کرایہ وصول کرنا اور کرایہ داروں سے نپٹنا اور پھر ریاض میاں کی مخبری کرنا غلام رسول کی ڈیوٹیوں میں شامل تھا......غلام رسول کے بعد باہر کے نوکروں میں ڈیوڈ ڈرائیور بہت معتبر تھا......'' (۱۴)

ملازمین کی ڈیوٹیوں کی یہ فہرست لاہور کی معاشرتی زندگی کے اطوار کا بھرپور نقشہ پیش کرتی ہے۔معاشرتی زندگی کا یہ چلن لاہور شہر کے علاوہ اور کسے نصیب تھا؟ خالہ فیروزہ کے مشاغل کی تفصیل معاشرتی اقدار کے بہت سے اسرار و رموز کھول دیتی ہے۔فیشن پرستی،خودنمائی،محفل آرائی اور عیش پسندی یہاں کی خواتین کی محبوب اقدار ہیں۔مادّیت پرستی اور نمود ونمائش نے معاشرتی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔موج میلہ اور بے فکری اس معاشرے کے اوصافِ خصوصی ہیں۔

''صبح کے وقت خالہ فیروزہ عموماً شاپنگ کرنے نکل جاتیں تھیں۔یہ ان کی زندگی کے بڑے مشغول گھنٹے تھے۔گھر پر کپڑوں کا اَنبار ہونے کے باوجود ہر نیا رنگ ہر نیا کپڑا اُن کی جان بن جاتا اور اسے چاہے وہ کئی دن نہ خریدتیں پھر بھی ان کی جان پر بنی رہتی۔بزاز اور درزی

کے بعد انہیں جیولرز سے بہت کام رہتے تھے، پرانے زیور کی توڑ پھوڑ، نئے زیور کی رتّی ماشے تلوانے، موتیوں کو پَرکھنے اور جدید زیوروں کو پہن پہن کر آئینے میں دیکھنے کا انہیں بہت شوق تھا......''(۱۵)

''دوپہر کوتھوڑی دیر استراحت کے بعد خالہ عموماً کسی نہ کسی سے ملنے جایا کرتی، اگر خالو جمال ساتھ ہوتے تو خالو کے دوستوں کے ہاں، ورنہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں مجلس جمتی......اس کے علاوہ خالہ نے اپنے ہاں شادی کا ایک بیورو کھول رکھا تھا۔ جوان لڑکے خالہ کے دَر پر جبیں رگڑتے، محبت کا دَم بھرتے۔ خالہ کے ہاتھ پیروں اور بالوں کی تعریف کرتے اور اپنی ماہ پارہ تک پہنچتے۔''(۱۶)

لاہور کا سرکاری افسر چھوٹے خاندان کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے تو یہاں کے بزنس مین کا مفاد مشترکہ خاندان کے ساتھ جڑا ہے۔

بزنس مین

ملک بختیار لاہور کا لکھ پتی تاجر ہے۔ اس کے گھرانے کی زندگی، مشترکہ خاندان کی روایتی اقدار اور جدید زندگی کے ساتھ ان کی مطابقت کے مختلف پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہاں کی بہو بیٹیوں کا کام نت نئے ساز و سامان سے اپنی امارت کا سکہ بٹھانا ہے۔

یہ گھرانہ لاہور کی روایتی اقدار کا امیں ہے۔

''وہ گھر پہنچا تو ہمیشہ کی طرح گھر پر میلے کی سی ہڑبونگ چھائی تھی۔ یہ ایک بڑی برادری کا سردار خاندان تھا۔ آنگن میں اماں کھری چارپائی پر بیٹھی پرات بھر پیاز کاٹ رہی تھیں، پاس ہی دو چار تائیاں، ممانیاں، خالائیں، چھوٹی توپ جیسے جسموں والی سفید دوپٹے اور سفید شلواریں پہنے بیٹھی تھیں۔''(۱۷)

یہ لاہور کی پرانی تہذیب وثقافت کا بھرپور نقشہ ہے۔ یہ گھرانہ روایتی اقدار کو گلے لگائے نئی زندگی کے قدم سے قدم ملائے کامیابی سے چل رہا ہے۔ یہ جدید اور قدیم اقدار کے سنگم لاہور کا مثالی گھرانہ ہے۔ اہلِ لاہور کی زندگی کے

پوشیدہ گوشے یہاں عیاں ہو رہے ہیں۔

''یہ بالائی منزل گھر کی امیر ترین اور گندی ترین منزل تھی، یہاں بکسوں میں طلائی زیور، نائیلون، زری کی قمیضیں، نقرئی برتن، ٹرانسسٹر، الیکٹرک شیونگ ریزر......فرانسیسی سینٹ، بدیسی گھڑیاں، نقدی اور انعامی بانڈ تہ در تہ بند تھے۔ یہاں شادی شدہ نوجوان عورتیں بمع اپنے بچوں رہتی تھیں، مرد اس منزل کے سونا بٹورنے میں کچھ اس درجہ مشغول تھے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس منزل کی حالت سیاسی اکھاڑے کی سی ہے۔ ہر روز ایک نئی پارٹی بنتی ہے اور پچھلی پارٹی کے پول کھولتی ہے۔اس منزل کی اپنی زندگی تھی۔حسد کی زندگی، ساز باز کی زندگی، افواہوں کی زندگی......''(۱۸)

لاہور کی چمکدار زندگی کی تہ میں چھپی تاریکی کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے۔

''ان کی اولاد ان کی دوستی سے گریز کرتی تھی۔وہ چاہتے کہ بچے ان سے اپنی اپنی مشکلات کا ذکر کریں اور وہ حسبِ توفیق دوست بن کر ان کی مشکلات کو رَفع کریں، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ ہر بچہ اپنا اپنا دکھ مشکِ نافع کی طرح اپنے اندر چھپائے پھرتا تھا، حتیٰ کہ بڑی بیٹی جو عرصہ پانچ ماہ سے گھر آئی بیٹھی تھی، باپ کو یہ نا بتا سکی کہ اس کے جستی ٹرنک میں ایک عدد طلاق نامہ بھی موجود ہے۔''(۱۹)

اس گھرانے کے حوالے سے لاہور کی روایتی اقدار کے بیان میں بانو قدسیہ کا قلم دلچسپ مرقع پیش کرتا ہے۔

''ڈرائنگ روم میں حسبِ معمول بھانجیوں، بھتیجیوں، پوتیوں، نواسیوں کا اَنبار لگا تھا۔کہیں کہیں نمک کے طور پر کوئی بھانجا بھتیجا بھی صوفے میں دبکا بیٹھا تھا......لتا کا گیت ریڈیو پر بج رہا تھا اور ایک ایک کنیز صورت لڑکی اپنے آپ کو اس وقت شہزادی مہ پارہ سمجھ رہی تھی......لتا کے انکوبیٹر میں جوان کی گئی اَن گنت لڑکیوں سے گھر اَٹا پڑا تھا......

''اللہ کہاں جا رہے ہو، چوری چوری، ظفر؟'' اظہر بھائی کی بیوی بولیں۔وہ غسل خانے میں کھڑی مہاسوں پر کریم مل رہی تھی۔''بس جی اپنے کمرے میں جا رہا ہوں جی......''

''ادھر آنے کی تو تم نے قسم کھا رکھی ہے۔'' نگہت بھابھی اترا کر بولیں۔''بس جی پڑھائی

میں وقت ہی نہیں ملتا......''

''میرے پاس بیٹھنے کو وقت نہیں ملتا، عذرا کے پاس پہروں گذارنے کا وقت ملتا ہے۔'' وہ برا مان گئیں۔

''وہ تو عذرا بھابھی نے زبردستی پکڑ کر بٹھا لیا تھا جی، کل کریلے گوشت کھلانے کو...... پھر تو ہمیں بھی کریلے گوشت پکانے پڑیں گے۔'' ظفر پنجوں کے بل آگے ہی بڑھا تھا کہ مظفر بھائی کی بیوی عذرا سے ملاقات ہوگئی۔

وہ منی کی پیٹھ دھو کر توری کی طرح لٹکائے چلی آرہی تھیں۔

''اللہ...... ہاہا...... ظفر...... کہاں؟''

''جی اوپر جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔''

''منی کو دَست آرہے ہیں۔ دوائی نہیں لا دیتے کوئی۔''

''کیمرہ رکھ آؤں جی اوپر...... ابھی آیا۔'' ......''(۲۰)

ملک بختیار کا کردار دولت پرستی، ہوس گیری اور عیش پسندی کو اُجاگر کرتا ہے۔ لاہور کا یہ امیر طبقہ دولت کے بل پر ہر عیش اور آسائش خرید لینے کا متمنی ہے۔

ملک بختیار ڈھلتی عمر کا لکھ پتی تاجر ہے، جس کی اپنی بیوی سے تعلقات ختم ہو چکے ہیں اور اب وہ ایک نوجوان لڑکی کے سہارے اپنی زندگی میں بہار لانا چاہتا ہے۔

''رشو میں بچوں کا باپ ہوں، جوان لڑکوں کا باپ ہوں، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ لیکن بخدا میری عمر صرف پچاس سال ہے، میری بیوی میری بیوی نہیں، اپنے بچوں کی ماں ہے۔ ہمارے درمیان نہ محبت کا رشتہ باقی ہے نہ جنس کا...... رشو...... رشو! مجھ پر رحم کرو...... مجھ پر رحم کرو رشو!''(۲۱)

یہاں کے امیر طبقے میں ادھیڑ عمر آدمی کا نوجوان لڑکی سے شادی کرنا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ وہ دولت کے بل پر بیوی تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کی محبت نہیں خرید سکتا۔ ایسی شادیوں کا کم و بیش یہی انجام ہوتا ہے جو اس کہانی میں ہوا۔

''گلبرگ کی پُر رونق اور باوقار آبادی میں کل رات لاہور کے لکھ پتی تاجر ملک بختیار علی اپنی

کوٹھی میں قتل کر دیے گئے......مبینہ اطلاع کے مطابق ملک بختیار نے تقریباً ایک ماہ پیشتر بہاولپور کی طالبہ سے خفیہ طور پر شادی کی تھی اوراپنے گھر والوں سے چوری دونوں میاں بیوی اس کوٹھی میں بڑی پُر اسرار زندگی بسر کر رہے تھے۔''(۲۲)

زندگی کی لذتوں سے بھرپور لطف اٹھانا لاہور کی بنیادی اقدار میں شامل ہے۔ملک بختیاراور رشیدہ میر دونوں اسی کا شکار ہوئے۔

طالب علم

لاہور کی زندگی کا تیسرا زاویہ طالب علم ہیں۔لاہور شہر ہمیشہ سے علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہےاور یہاں کے طالب علم اپنی ذہانت، جودت طبع اور سیاسی شعور کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔یہاں کی طالبات میں روشن خیالی اور جدت پسندی ان کی فکر سے لے کر ان کے لباس اور طرزِ بودوباش سب میں نظر آتی ہے۔حکیم نثار احمد علوی اپنی کتاب ''شب چراغ میں لکھتے ہیں:

''لاہور کسی زمانے میں ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا جو فیشن مسلمانوں میں چلتا یہاں سے نکلتا تھا،لاہور کی یہ روایت آج بھی زندہ ہے۔''

ڈمپل نے اپنے بالوں کو چھو کر کہا،''لیجیے کوٹ پر جب تک فر کا کالر نہ لگے تو کوٹ کا مزہ ہی گیا۔'' ''لیکن ڈمپل جان میں تو ہاف کوٹ بنوا رہی ہوں...... بالکل یہاں تک......''

کولہوں تک ہاتھ لے جا کر طیبہ بولی۔

''چاہے ہاف کوٹ ہو چاہے فل،ان دنوں فر فیشن میں ہے۔وہ تو لگوانا ہی پڑے گی کوٹ پر......''(۲۳)

ڈمپل جدید لاہور کی ماڈرن لڑکی کی تمام خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔وہ نوجوان نسل کی نمائندہ ہونے سے بڑھ کر لاہور کی اصل روح کو اپنے اندر بسائے ہوئے ہے۔وہ روح جس میں ساحری اور کیمیا گری کا وصف ہے۔

''رشیدہ نے جو وقفہ ڈمپل کے گھر گزارا تو گویا ڈمپل اسے اکسیر بناتی رہی......اتنے تھوڑے عرصے میں اپنی مکمل جون بدل لینا نہ تو رشیدہ کے اختیارات کی بات تھی نہ ڈمپل کے استعداد

کی...... یہ تو سیدھی سادی کیمیا گری تھی اور اس کا نسخہ لاہور میں ڈمپل سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا۔''(۲۴)

ڈمپل لاہور کی روشن خیالی اور آزادروی کا تاریک پہلو بھی ہمارے سامنے لاتی ہے۔اس کی روِش اخلاقی اقدار کے دائرے سے ہٹی ہوئی ہے۔

پتہ نہیں ٹارچ کے سیل پرانے تھے کہ اس کا سوئچ خراب تھا۔بیس بائیس سیڑھیوں میں آٹھ دس دفعہ روشنی بند ہوئی۔

جب وہ دونوں اپنے کمرے میں لوٹ آئیں تو رشو نے ڈرتے ڈرتے سنہری پٹی والے ڈبے کو ہاتھ لگایا۔گڈی کا غذ کھولا اور بڑی جرأت سے بولی۔

''یہ...... یہ تحفہ کیسے دے دیا مسز سیّد نے تمہیں......؟ دینا ہی پڑتا ہے ایسی صورت میں...... تحفہ وغیرہ......''

''کیا مطلب؟''

''ایسی باتوں کا مطلب نہیں پوچھا کرتے۔سوجاؤ آرام سے۔''(۲۵)

ڈمپل لاہور کی جدید زندگی کی نئی اقدار سے بخوبی آگاہ ہے۔یہ تصنّع ، بناوٹ اور خودنمائی کی اقدار ہیں۔

''سنو رشو! جب کبھی اسکورٹ کے بغیر کسی پبلک جگہ میں جاؤ تو ہمیشہ اتنے قیمتی لباس میں ہونا چاہیے کہ کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑے اور اگر کار میں سے اتر سکو تو اور بھی اچھا۔معمولی آدمی قریب نہیں پھٹکتا......''

''لیکن میں ساڑھی پہن کر نہیں جا سکتی ، مجھے ساڑھی کی عادت نہیں ہے۔''

''عادت بھی پہننے سے ہوتی ہے۔یہ معزز عورتوں کا فارمل ڈریس ہے......چلو پہنو......''

''ڈمپل خدا کے لیے......''

''اور یہ لیس کے دستانے اور جوتے......کورٹ شو......''(۲۶)

لاہور نے رشو پر جو اثرات مرتّب کیے دراصل وہ ڈمپل کے واسطے ہی سے ہوئے۔ڈمپل کی صحبت میں رشو پر آہستہ آہستہ لاہور کا رنگ چڑھنے لگا اور وہ بھی ڈمپل کا روپ اختیار کر گئی۔

''ایک روز جب ڈمپل اور رشو کالج نہ آئیں تھیں تو چائے کا ٹرے سامنے رکھ کر سائیکالوجی کی ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں نے خوب خوب بخیے اُدھیڑے۔

''ڈمپل کی صحبت میں ڈمپل جیسی ہوگئی ہے۔'' گلنار نے کہا۔

''وہی لباس وہی بول چال......'' ظ نے کہا۔

''کرسمس کی چھٹیوں تک بالکل خیر تھی۔ یہ کچھ سکستھ ایئر ہی موافق نہیں آیا انہیں۔''

''خدا قسم دیکھ کر شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہی لڑکی ہے۔'' طیبہ بولی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو یہ سکستھ ایئر کا اثر ہے سارا......''

''ڈمپل کا بھی اثر ہے وہ تو بارود ہے پورا......''

بیچاری کی ماں بہاولپور میں سمجھتی ہوگی کہ بیٹی صاحبہ تعلیم حاصل کر رہی ہیں، یہاں فیشن کا مکتب کھلا ہے۔'' ط نے کہا۔''(۲۷)

لاہور کے طالب علموں نے فیشن پرستی، آزاد خیالی اور نت نئی تبدیلیوں کی طرح ڈالنے کا مزاج لاہور کی گھٹی میں شامل کر رکھا ہے۔

طوائف

لاہور کے طلبا کا ہیرا منڈی کی طوائفوں تک پہنچنا بھی اس شہر کی اقدار کا حصہ رہا ہے۔ غازی ایسا ہی طالب علم ہے جو ہیرا منڈی کی ایک طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے۔ ہیرا منڈی پر بھی لاہور شہر کے مخصوص مزاج کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ یہاں کی طوائف نے نسل در نسل تماش بینوں کے اتنے بدلتے رنگ، مزاج کی بوالعجبیاں اور تعلقات کی پیچیدہ گرہیں دیکھی ہیں کہ اب وہ مختلف مزاج کی طوائف بن چکی ہے۔

''ہیرا منڈی کے اپنے اصول ہیں یار! وہاں کی سائیکلوجی سمجھنا ہو تو پہلے اپنی ساری سائیکلوجی گھر چھوڑ کر جانی پڑتی ہے۔''(۲۸)

عمومی اوصاف کے علاوہ بعض طوائفوں میں انفرادی اقدار بھی نظر آتی ہیں اور یہ اس شعور کا نتیجہ ہیں جو ہیرا منڈی کے مشاہدے اور تجربے سے انہوں نے حاصل کیا ہے۔ گلنار ایسی ہی طوائف ہے جو ہیرا منڈی کی عام طوائفوں کی طرح

محبت کی خواہش تو اپنے دل میں رکھتی ہے لیکن اِردگرد کی طوائفوں کی ناکام محبت کی زندگی سے اس نے یہ سب حاصل کیا کہ محبت کی قدر طوائف کے کوٹھے پر نہیں پنپ سکتی۔ اس لیے وہ محبت کی خاطر نہیں بلکہ کچھ عرصہ ہی سہی عزت کی زندگی گزارنے کی خاطر ہیرا منڈی کو خیر باد کہتی ہے۔ گلنار محبت کی حقیقی رمز سے آگاہ ہے۔ اس کے فلسفۂ عشق میں وفا اور بیوفائی کا ظاہری فرق بے معنی ہے۔ وہ اس قبیلۂ محبت سے تعلق رکھتی ہے جہاں تیاگ محبت کی افضل ترین قدر ہے۔ اسی لیے وہ غازی کی محبت میں غازی ہی کو چھوڑ دیتی ہے۔

''جب سات سال کی شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد...... تین بیٹے جننے کے بعد میں بازار میں آؤ گی...... تو کم از کم مجھے ایک سکون ضرور ہوگا غازی!...... کیسا سکون؟ میں نے پوچھا۔ وہ سکون یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی نہیں تھی، تم نے مجھے گھر سے نہیں نکالا...... تم نے بیوفائی نہیں کی...... میں نے آخری بار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا...... گلنار اب بھی وقت ہے اپنے ارادے سے باز آجاؤ...... خدا کے لیے کلا بھٹ نہ جاؤ...... صاحب خاں کی محبت سے میرا جذبہ زیادہ دیرپا ہوگا...... وہ چپکے سے اٹھی اور برقع کی ڈوریں باندھنے لگی...... پھر بڑی دیر بعد بولی...... دعا کرنا میں واپس نہ لوٹوں۔ صاحب خان مجھے اپنے گھر میں اپنی پہلی بیوی کے قدموں میں بٹھائے رکھے...... چلتے ہوئے اس نے پھر مجھ سے کہا۔ غازی! تمہیں معلوم ہے نا میں تمہیں دغا نہیں دے رہی...... میں نے سر جھکا لیا...... میں تم سے بیوفائی نہیں کر رہی...... صاحب خاں اگر مجھے چھوڑ دے گا تو میں برداشت کرلوں گی...... لیکن اگر...... اگر شادی کے بعد تم نے مجھے چھوڑ دیا تو...... تو غازی کچھ تو میرے پاس ایسا رہنے دو جو ٹوٹا ہوا نہ ہو...... چلی گئی...... گلنار...... بالآخر......''(۲۹)

ناول میں یہ رمز موجود ہے کہ محبت کی قدر لاہور میں پنپ نہیں سکتی۔ لاہور کے حوالے سے محبت کی یہ تقدیر بتا کر وہ دراصل اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ محبت کی قسمت میں روزِ اوّل سے خودسوزی اور جدائی کی تڑپ لکھ دی گئی ہے۔ خواہ یہ محبت صدیوں پہلے عاقل خاں اور شہزادی زیب النساء کی ہو، خواہ گلنار اور غازی کی، یا ظفر اور رشو کی۔

''جب دیگیں پر از طعام ہائے لذیذہ روانہ ہوئیں تو خود بھی ایک دیگ میں دیدار کا دیوانہ پوشیدہ ہو بیٹھا۔ کسی بدفطرت غمّاز نے مخبری کی۔ بادشاہ سلامت بہ نفسِ نفیس محل سرا میں

آئے۔ایک دیگ سے کچھ طعام نکال کر چکھا اور فرمایا کہ دیگیں ابھی خام ہیں،اس وقت تک آگ پر رکھو جب تک پختہ نہ ہو جائیں۔

شہزادی فرخندہ رو بن آگ کی سیج پر لوٹی کباب ہوئی۔ وہ ماہی بے آگ ان کی ناموس پر قربان ہوا۔جل کر راکھ ہوا۔لیکن ایک بار بھی لب نہ کھولے۔محبت کا پختہ راز سینے میں لیے اگلے جہان کو کوچ کیا۔شہزادی زیب النساء خاموش رہی۔اس کے اندر جو کچھ جل چکا تھا اس کی کسی کو خبر نہ ہوئی۔''(٣٠)

محبت کے نصیب میں خودسوزی کے سوا کچھ نہیں،خواہ وہ زمانہ قدیم ہو یا جدید دور کے ظفر اور رشو کا۔

''رشو کے دل میں پہلی بار یہ تمنا جاگی کہ کاش اس طرح ڈمپل کی ساڑھی میں کوئی اسے دیکھ لے.....خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ جے مالا لیے کالج میں پھر رہی ہے.....لانوں پر، کلاس روموں میں، گیلری میں ہر طرف نل روپی لڑکے کھڑے ہیں اور وہ نہیں جانتی کہ ان میں سے اصلی راجہ کون ہے.....؟ اصلی راجہ شاید دیگ میں راکھ ہونے کے لیے بیٹھ چکا تھا۔''(٣١)

محبت کی قدر ہر دور میں موت کے گھاٹ اتر کر رہتی ہے،خواہ یہ محبت کسی شہزادی کی ہو یا طوائف کی،محبت جان سوز ہی رہتی ہے۔وہ طوائف کی ہستی کو بھی جیتے جی مار دیتی ہے۔

''غیر ضروری باتیں مت کرو..... مجھے یاد کرنے دو.....ایک ایک لمحہ ایک ایک لفظ اس سے بچھڑنے کا ایک ایک ثانیہ..... وہ کتنی دبلی ہو گئی تھی..... جیسے ٹائیفائیڈ کے مرض سے اٹھی ہو.....بغیر لپ اسٹک کے ہونٹ.....بغیر سرمہ کے آنکھیں..... چلتے ہوئے اس نے پھر مجھ سے کہا، غازی! تمہیں معلوم ہے ناں میں تمہیں دغا نہیں دے رہی..... غازی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے سرسوں رنگ چہرے سے کافور کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔''(٣٢)

طوائف کے حوالے سے بانو قدسیہ یہ بتاتی ہیں کہ لاہور ایک رنگین مزاج شہر ہے۔باہر سے آنے والے طالب علم اس کی رنگ رَلیوں میں کھو کر بعض اوقات اپنے اصل مقصد کو بھی بھول جاتے ہیں۔لاہور کی سماجی اقدار کے ساتھ ساتھ

مصنفہ شہر کے مزاج کی طرف جا بجا اشارے کرتی رہتی ہیں۔

''لاہور حلیم کی ایک دیگ ہے۔ اس میں ہر قسم کا اَناج کھپ جاتا ہے، ہر طرح کی بوٹی گل جاتی ہے...... یہاں آ کر آپ کو اپنی شخصیت کو بے داغ رکھنا ہے تو آپ کو ہڈی کی طرح سخت بننا پڑے گا۔''(۳۳)

''میرا مطلب ہے کہ آپ کو وہاں پے اِنگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ لاہور ایک مصروف شہر ہے، مہنگا شہر ہے، یہاں کوئی کسی کے اخراجات برداشت کر کے خوش نہیں رہ سکتا......''(۳۴)

''دیکھو ناں رشو! تمہاری ان سے کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں۔ وہ منہ سے کہیں نہ کہیں لیکن بوجھ ضرور محسوس کرتے ہوں گے تمہارا۔ ویسے لاہور میں تو رشتہ دار چھوڑ اپنے بچوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔''

''اپنے بچوں کا بوجھ؟'' رشو نے سر جھکا کر سوچا...... ''ہائے اللہ! کیسا شہر ہے؟ جہاں اپنے بچوں کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔''(۳۵)

لاہور کی سماجی زندگی کی اقدار اور اس کے مزاج کی مختلف جہتوں کو اُبھار کر بانو قدسیہ یہ نقطۂ نظر دیتی ہیں کہ لاہور دوسرے شہروں سے برتر، مختلف اور جدید اقدار کا شہر ہے اس لیے چھوٹے شہروں کی سیدھی سادی لڑکیاں یہاں آ کر جدید ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی خواہش اور کوشش میں انتشارِ ذات کا شکار ہو جاتی ہیں۔

رشو کے انجام کا تجزیہ کرنے سے بانو قدسیہ کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ ماحول کے جبر کی وجہ سے یکدم پرانی اقدار کو چھوڑ کر نئی اقدار اپنا لینا شخصیت کو عدم توازن کا شکار کر دیتا ہے۔ انسان کا لاشعور پرانی اقدار کو بھلا نہیں پاتا۔ یوں اس کے شعور اور لاشعور میں کشمکش اسے نفسیاتی الجھنوں کا شکار کر دیتی ہے۔

ظفر کی شخصیت

ظفر اِس ناول کا سب سے سچا اور کھرا کردار ہے۔ جسے ظاہر پرستی اور خود نمائی سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ اپنے حال میں مست رہنے والا دروں بیں انسان ہے۔

''ظفر بیلیئیڑ طرز کا لڑکا تھا، انوکھے پن، بدہیئتی اور بدوضعی کے باوجود اس پر نظر پڑتی تھی۔ کپڑوں کی طرف سے وہ ہمیشہ لاپرواہ رہا۔ بوٹ پالش کیے اسے ہفتوں گزر جاتے۔ شیو کے معاملے میں کبھی کبھی تو وہ اس قدر محتاط ہو جاتا کہ دن میں دو بار کھونٹی نکالے پھرتا اور کبھی ہلکی ہلکی داڑھی رکھ کر نیوی کٹ سگریٹ کا اشتہار بن جاتا۔'' (۳٦)

اس کا کردار دھوکہ، فریب اور ریاکاری سے دور ہے، نہ تو اس میں منافقت ہے اور نہ ہی تضاد۔ وہ جیسا ہے ویسا ہی نظر آتا ہے۔ وہ ایک صوفی کی طرح صاف شفاف اور روشن دل رکھتا ہے۔ اسی لیے خالص سچائی اور معصومیت کی طرف اس کا دل کھنچتا ہے۔ اگر رشیدہ اسے پہلی ہی نظر میں بھا گئی تو اس میں کچھ ایسی ہی خصوصیات اسے نظر آئیں۔

''وہ باقی لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی؟ سٹین لیس سٹیل کے برتنوں میں بہاولپوری کوزہ...... کانچ جیسا نازک چینی آرٹ کی طرح دلآویز اور ہڑپے کی تہذیب کی طرح پُراسرار۔'' (۳۷)

ظفر، رشیدہ کی سادگی اور فطری حسن پر مر مٹا۔ شہری لڑکیوں کی بناوٹ اور تصنّع سے دور وہ اسے قدرت کا خالص شاہکار معلوم ہوئی جس میں خالص مٹی کی خوشبو اور اَنجانی روح کا اسرار تھا۔ وہ نہیں چاہتا کہ رشو کی سادگی اور اصلیت لاہور شہر کی ملاوٹ سے آلودہ ہو جائے۔ وہ اسے خط لکھتا ہے تو اظہارِ محبت کی بجائے لکھتا ہے:

''محترمہ!

شاید آپ میرا خط پا کر ناراض ہوں گی۔ ممکن ہے آپ میری رپورٹ بھی کر دیں لیکن خوفزدہ ہونے کے باوجود میں آپ کو خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا۔ میں بس آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ جیسی ہیں ویسی ہی اچھی لگتی ہیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ کبھی ملوث نہ ہوں۔

نیک دعاؤں کے ساتھ: ظفر احمد'' (۳۸)

ظفر ایک پُرخلوص لڑکا ہے اور اس زمانے میں جبکہ خلوص اور مہر و وفا کی اقدار ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ قدر اس کے پاک و شفاف دل کے ساتھ مل کر اسے گوہرِ نایاب بنا دیتی ہے۔ اس کی شدت پسندی نے اس کے خلوص ہی سے جنم لیا ہے۔

''ظفر پر جو بھی موڈ طاری ہوتا اس میں ہمیشہ شدت کا پہلو ہوتا۔ ایک بار نویں جماعت میں اسے سنگھاڑے کھانے کا خبط ہوا تھا۔ ایک دن میں سیروں سنگھاڑے کھا لیتا اور منہ سے لے کر آنتوں تک سیمنٹ سے بھر جاتا۔ کالج کے پہلے دو سال مباحثوں میں اس قدر گرم جوشی سے جتا رہا کہ ہر ڈکلیمیشن، ہر کونٹسنٹ، ہر مباحثہ اس کے بغیر نامکمل رہتا۔'' (۳۹)

''ظفر کی طبیعت میں بلا کی شدت تھی۔ اسے جب رشو جان سے محبت ہوئی تو اس میں میدانی علاقوں کے دریا کی سست رفتاری نہ تھی بلکہ قطب شمالی کی برف پر چلنے والی برق رفتار برف گاڑیوں کی سی تیزی تھی۔ وہ رشو جان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا، مہیب...... خطرناک...... اچھوتا...... اَن ہونا......'' (۴۰)

ظفر بلا کا ذہین ہے، لیکن چالاک و شاطر نہیں۔ اس کی ذہانت نے اسے زمانہ شناس نہیں بلکہ حقیقت شناس بنایا ہے۔

''کالج میں اسے کنگ آف سپیکرز کہتے تھے۔ مبحث کو اُلجھانا، مباحثے میں شریک ہونے والے تمام ارکان کو پٹڑی سے اتارنا، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ایوان میں جو بھی بحث اس کی زیرِ صدارت ہوتی ہمیشہ کامیاب ہوتی اور جس بحث میں وہ سپیکر بن کر داخل ہوتا اُس سیشن میں صرف اس کو داد ملتی۔ وہ بڑا مجمع گیر، آتش نفس اور خوش گفتار تھا۔ انگریزی، پنجابی تینوں زبانوں میں اتنی روانی سے اور اتنی جلدی بولتا جیسے بجلی کے پنکھے چل رہے ہوں۔'' (۴۱)

ظفر اتنا دروں بیں ہے کہ اسے دوسروں کے احساسات و جذبات جاننے کا بھی خیال نہیں آتا۔ وہ اپنی ہی ذات کے سمندر میں ڈوبا رہتا ہے۔

''مشکل یہ تھی کہ شدتِ جذبات نے ظفر کو کبھی رشو کے مسائل، اس کا عندیہ، اس کا نقطۂ نظر سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔'' (۴۲)

اسے شاید رشیدہ سے نہیں اپنی اس وجدانی کیفیت سے محبت تھی جس میں وہ رشیدہ سے محبت کرنے کے بعد ڈوبا رہتا تھا۔

''کچھ نہیں۔ وہ اپنی وضع شوق سے نہ بدلیں۔ ہمارے جذبات کو ان کے رویے سے کوئی تعلق نہیں۔''(۴۳)

ظفر صوفی منش انسان ہے، جس کے اندر ذوق وشوق، مہر ومحبت اور جنوں خیزی پرورش کرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے ظفر کو مثبت قدروں کی علامت بنایا ہے۔اس کے اندر صوفیانہ اقدار کا عکس نمایاں ہے۔صوفیا جیسا پاکباز روشن دل، سچائی اور فطرت سے لگاؤ، محبت کی جنوں خیزی اور دروں بینی اور سب سے بڑھ کر کیفیات کی شدت جو دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

''چونکہ ظفر پر مہینوں کی کیفیت پلوں میں گزر جاتی تھی۔اس لیے جب اسے رشیدہ سے محبت ہوئی تو وہ قیس صورت گرا محبت کی واردات اس پر وجدانی تھی۔ وہ چاہتا تو اسی وقت کپڑے پھاڑ کر بنوں کو نکل جاتا، اپنا نام دھید ورکھواتا اور کانوں کو چروا کر اُن میں مندرے ڈلوالیتا۔ وہ اگر پسند کرتا تو بی آر بی نہر کا رُخ موڑ کر خالہ فیروزہ کی کوٹھی کے آگے سے گزار دیتا۔''(۴۴)

ظفر کا صوفیانہ مزاج جس میں محبت کو بنیادی قدر کی حیثیت حاصل ہے، اسے زود حِس بنائے ہوئے ہے۔اس کے اندر محبت کے ایندھن کا اَنبار لگا ہے۔بس اسے ذرا سی چنگاری دکھانے کی ضرورت تھی۔اس کی محبت اور جنوں خیزی رشیدہ کی جوابی محبت کی محتاج نہیں ہے۔ وہ تو ایک صوفی کی طرح اللہ ھُو کا نعرۂ مستانہ لگا کر جذب وسرمستی میں سرشار ہو چکا ہے۔

''اس کے دیوانے پن کی کوئی حد نہ تھی۔لیکن ان باتوں کا اسے خیال نہ آیا۔اسے تو بس یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے وجود پر پیٹرول کی بوتل چھڑک کر بھک سے جلا دیا ہو...... ظفر کہاں ہے؟......کون ہے؟......کیا کرتا ہے؟......کیوں ہے؟......ان باتوں کا واہمہ بھی اس کے دماغ سے نکل گیا تھا۔اَنا کے تمام سرخابی پَر اتار پھینکنے کے بعد اندر سے وہ فاختی رنگ کی کبوتری نکل آئی تھی جس کا سارا وجود ایک ہی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔
یہ رنگ تھا رشیدہ کی محبت کا رنگ...... پیروں میں روندا ہوا رنگ۔ وہ کالج کے ہر واقف لڑکے سے رشو کی باتیں کرتا۔فرصت کے لمحوں میں اسے خط لکھتا۔ بازاروں میں اس کے

لیے تحفے خریدتا اور پھر انہیں اپنے ٹرنک میں رکھ دیتا۔'' (۴۵)

وہ محبت کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی فنا فی اللہ کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی اپنی ذات کا فخر و غرور ختم ہو کر صرف رشیدہ کی محبت کا رَنگ باقی رہ چکا تھا۔

رشیدہ کی محبت سے پہلے اس پر جنوں کے جتنے بھی دَور گزرے وہ اپنی تلاش اور وجود کی معنویت کی تلاش کے سفر تھے۔

> ''شام پڑ رہی تھی۔ آج کوٹھے پر ابا جی نہ تھے۔ ایسی سکون کی گھڑیاں اس گھر میں کم آتی تھیں، دوسری منزل میں کوئی بچہ منہ کھولے اونچے اونچے رو رہا تھا، ظفر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ نیچے کھلونے جیسی کاریں آ جا رہی تھیں۔ شہر کی آبادی اینٹوں میں محبوس موہنجودڑو اور ہڑپے کے کھنڈروں کی طرح بے جان نظر آتی تھی۔ ظفر اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر کا تماشا دیکھنے کا شوقین تھا۔ اس بازیچۂ اطفال میں کھو کر وہ اپنی بے بضاعتی کو پَرکھتا۔'' (۴۶)

اس کی جنون خیزی کے ہر دَور نے اسے حقیقت سے آشنائی عطا کی۔ وہ اپنی پہچان کی تلاش کے سفر میں زینہ بہ زینہ اوپر جاتا رہا۔

> ''تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا تو اسے تھرڈ ڈویژن کے باوجود آسانی سے داخلہ مل گیا۔ پرنسپل کا خیال تھا کہ یہ آدمی اپنے میرٹ کی وجہ سے کالج کے لیے مفید ثابت ہو گا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ظفر مکمل طور پر مباحثوں سے اُکتا چکا ہے اور تو اور وہ ڈکلیمیشن کو سننے کے لیے بھی نہ جاتا۔ بہت سی لڑکیوں نے اسے مباحثوں میں شرکت کرنے پر مجبور کیا۔ ہر بار وہ یہی کہتا:
> بحث کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ بال کی کھال اکھیڑنے سے حاصل؟ میری بلا سے آپ چاہے کچھ سمجھتے ہوں، مجھے اپنے نظریوں کے متعلق شکوک نہیں ہونے چاہئیں۔ آپ اگر اس عہد میں دنیا کو چپٹا سمجھتے ہیں تو آپ کی مرضی۔ یہ ملک آزاد ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہونا چاہیے......'' (۴۷)

مباحثوں کا شوق اسے نظریات کی پختگی کا شعور دے کر رخصت ہوا۔ ان کے ذریعے اس نے اپنے اندر کے سچ کو پہچانا اور پھر کج بحثی سے منہ موڑ کر موسیقی کی طرف متوجہ ہوا۔ موسیقی کی دنیا نے اس کی خود آگاہی کے سفر کو بہت مختصر کر دیا۔ وہ

عرفان کی منزلوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔

''مباحثوں کی ہنگامہ خیز فضاؤں سے نکل کر ظفر نے اپنے آپ کو نغمے کی بیکراں وسعتوں کے حوالے کر دیا۔ بی اے کے فائنل میں پہنچتے تک اس کے پاس تین ٹیپ ریکارڈر، ایک ریڈیو گرام، دو ٹرانسسٹر اور ایک پرانا گراموفون اکٹھے ہو گئے۔ ہر محفلِ موسیقی میں سینے پر ہاتھ رکھ کر شرکت کرنا اس کا اوّلین فرض تھا۔ اس کے پاس روشن آراء، نزاکت علی، سلامت علی، امانت، فریدہ، ثریا ملتانیکر، زاہد سلطانہ کے وہ ٹیپ تھے جو شاید ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں بھی موجود نہ تھے۔ وہ گھنٹوں پکا گانا سن سکتا تھا۔ اس بحرِ ذخّار سے نکلتا تو ریڈیو گرام پر فلمی گیت سنتا۔ لتا اور نور جہاں کے گیت، خورشید انور کی دُھنیں، جھنڈے خاں کے گیت، یہ موسیقی ہلکی پھلکی اور دل کی فضا کو ملائم کرنے کے لیے ناگزیر تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ گراموفون نکال کر پلنگ کے پاس رکھ لیتا اور پرانی فلموں کے گیت بجاتا...... ان فلموں سے اس کی پود دور ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسے ان گانوں سے عشق تھا۔ سہگل، کانن مالا، خورشید، کے سی ڈے وحیدن، اختری بائی کے گیت، پہاڑی سانیہال اور سریندر کے نغمے، رام دُلاری کا لوچ، وہ کنول کے پھول کی طرح ان گیتوں کے سروں پر ڈولتا پھرتا۔

ایک طرح سے یہ عہد ظفر کا عالمِ عرفان تھا۔ اس وقفے میں وہ اپنے آپ سے آگاہ ہوا۔ اس نے ہر طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو موسیقی کے قلعے میں محبوس کر لیا۔''(۴۸)

ظفر ایک کے بعد ایک معنی خیز جنوں میں ڈوبتا اور اُبھرتا رہا۔ فلمی دنیا کے جنوں کے بعد وہ قلمی دوستی کے مشغلے میں ڈوب گیا۔

''فلمی جنوں ختم ہونے کے بعد ظفر پر قلمی دوستی کا بخار چڑھا۔ اخباروں، رسالوں میں سے ایڈریس لے کر یہ سلسلہ چلایا گیا۔ ظفر کے جنوں میں ایک خوبی ضرور تھی۔ وہ اپنے سودائی پن کو شاہ جہاں کی طرح تاج محل ضرور بنا دیا کرتا۔ قلمی دوستی کا حلقہ جب بہت بڑھا تو اس نے ایک سوسائٹی کی شکل اختیار کر لی۔ تیسری منزل پر ایک بورڈ نصب کیا گیا جس پر انگریزی

میں فلوریسینٹ رنگوں میں لکھا گیا...... انٹرنیشنل فرینڈ شپ ہاؤس، سیکرٹری...... ظفر احمد ملک'' (۴۹)

اس جنوں نے اسے انسان دوستی کی راہ پر ڈال دیا اور یہاں سے وہ خوابوں کا صورت گر بن کر اُبھرا۔

''مختلف ممالک، ان کے عقائد، رسومات، نسلی امتیازات، مذہبی تنازعات میں ظفر کو بڑی گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ رفتہ رفتہ ان علاقوں سے محبت کرنے لگا تھا جس میں اس کے دور افتادہ دوست بستے تھے۔ یہ شوق اس کے ان خوابوں کا باعث بنا جو وہ امن کے متعلق دیکھنے لگا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر دنیا کے تمام نوجوان عالمی امن کے لیے ایسی سوسائٹیاں بنا کر اپنے اپنے گھر کی تیسری منزل پر اسی نام کے بورڈ ٹانگ لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ بقائے امن کی مشکل آسان نہ ہو جائے۔'' (۵۰)

اِن سب کے بعد محبت کا وہ جنوں جس نے خود آ گاہی سے عرفان کی آخری منزلوں تک اس کی رہنمائی کی، اس محبت سے اس نے قناعت اور ضبطِ نفس کی اخلاقی اور روحانی اقدار حاصل کیں۔

''کالج میں وہ رشو اور ڈمپل کے پیچھے بیٹھنے کا عادی تھا۔ یہ عرصہ جو وہ کلاس میں ان کی پشت پر بیٹھ کر گزارتا اُس کا سرمایۂ حیات تھے۔ اپنے آپ پر ایک پابندی لگانے سے اس میں ایک طرح کی صبر آزما قناعت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ رشو کو خط تو نہ لکھ سکتا تھا، اس سے بات نہ کر سکتا تھا، لیکن اس خوشبو میں سانس تو لے سکتا تھا جو رشو سے اُٹھتی تھی۔'' (۵۱)

محبت کی مثبت قدر نے اس کے اندر صبر اور ایمان کی اقدار کو جنم دیا۔ محبت ہی نے اسے اپنے اندر جھانکنے کی راہ دکھائی اور وہ خود شناسی کے رستے طے کرنے لگا۔

''اب اس کا زیادہ وقت باغوں میں کٹنے لگا۔ کبھی باغِ جناح میں جا بیٹھتا، کبھی جہانگیر کے مقبرے میں پناہ لیتا۔ جب شام کو کوّے کائیں کائیں کرتے غول درغول گھروں کو لوٹتے تو وہ بھی موٹر سائیکل لے کر گھر آ جاتا۔ سب سے زیادہ اسے نور جہاں کے مزار کا لپکا تھا۔ اس مقبرے میں جو خستگی، بے چارگی اور اندھیرا تھا وہ ظفر کی طبیعت سے میل کھاتا تھا...... رشو کی محبت سیر بیں کی طرح کئی روپ دھارتی کئی زاویوں سے اسے برماتی...... بہت مذہب کا

سہارا پکڑتا کئی طور اس جذبے پر کمند پھینکتا۔ اس منہ زور گھوڑے کو زانوؤں میں دَباتا، لیکن رشو سے محبت کچھ اکتسابی علم نہ تھا۔ یہ تو ایک وجدانی کیفیت تھی جیسے صبح سویرے کوئی دُھن کانوں میں رَچ بس جائے۔ اور سارا دن ذہن میں، دل میں، کانوں میں شریانوں میں بھونرے کی گونجار بن کر گونجتی رہے۔''(۵۲)

محبت نے ظفر کو مذہب کی راہ دکھائی اور مذہب نے اس کے اندر صبر اور ایمان کی مضبوط مثبت قدروں کو جنم دیا۔

''ان دنوں اس کے ساتھ سائیکلوجی سے زیادہ مختلف مذاہب کی کتابیں ہوتیں۔ کنفوشس، کپل وستو کے سدھارتھ، زرتشت، بہائی فرقہ اور صوفیا کرام کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھ لیا...... لیکن مذہب کی لاٹھی ٹیکنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اس میں ایک قسم کی مثبت قوتِ مدافعت پیدا ہو گئی۔ پہلے وہ رشو کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ رشو کے قدموں کو پکڑ کر اسے یروشلم کی کسبی کی طرح اپنے آنسوؤں سے دھونا چاہتا تھا۔ وہ رشو کو اپنے بازوؤں کے حصار میں انارکلی کی طرح دفن کرنا چاہتا تھا۔ لیکن دکھ اور صبر نے ایمان کی ایک اور راہ متعین کر دی تھی۔''(۵۳)

محبت نے ظفر کو روحانیت کی جس راہ پر لگا دیا تھا اُس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ ظفر وصال پر ہجر کو ترجیح دینے لگا۔

''جہانگیر بادشاہ کو شاہ حسین ڈھڈا کی زیارت کا دِلی شوق واشتیاق ہوا...... اسی رات وہ فقیر مجذوب صورت جھروکا شاہی تلے آ نکلا۔ کسی نے شاہ کو خبر کی کہ آپ کے جھروکے کے نیچے شاہ حسین بہ نفسِ نفیس آ موجود ہوئے ہیں۔ اگر ارادہ زیارت کا ہو تو طلب فرمائیے۔ بادشاہ نے جھٹ پٹ کمند لٹکا دی۔ فقیر کو اوپر کھینچ لیا۔ کچھ دیر باہم اخلاص کی باتیں ہوئیں پھر بادشاہ نے پوچھا کہ اے دینِ اسلام کے چراغ یہ بتا تجھے خدا کیسے ملا؟ جواب ملا، جیسے تو۔ پھر پوچھا کہ یہ بتا میں تجھے کیسے ملا؟ تو پھر ارشاد ہوا، جیسے خدا...... اب تو ہندوستاں کے فرماں روانے زچ ہو کر کہا کہ یہ معمہ کیا ہے یہ تو سمجھا...... بس تمہارے دل میں تمنا جاگی تو ملنا سہل ہو گیا۔ چپ چاپ اپنے تک گھسیٹ لیا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ملاقات ہو گئی......

خدا جانے یہ باغوں کا اثر تھا کہ علومِ دینی کا عطیہ تھا، ظفر کے دل میں یہ تمنا جاگ اٹھی تھی کہ

اب رشوا سے کمند پھینک کر اُٹھائے ورنہ وصل سے ہجر بہتر...... پہلے درجہ بہ درجہ سلوک طے کرنے کے خواب دیکھتا تھا، اب ایک جذبۂ غیبی کا انتظار کرنے لگا جو ایک آن میں ساری منزلیں طے کرتا ہے۔'' (۵۴)

ظفر عشقِ مجازی کے ذریعے وجدان کی جس منزل پر پہنچ چکا ہے وہاں اسے کپل وستو کے شہزادے کی ذہنی رفاقت نصیب ہو چکی ہے۔

''جذبۂ غیبی کے انتظار میں چشمِ بیمار کی طرح وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ پتلون سے باغِ جناح کی خشک گھاس کے پتے چمٹے تھے۔ ہاتھوں اور کہنیوں پر سیلی مٹی کی ٹھنڈک تھی۔ لبوں پر کپل وستو کے شہزادے کی بانی تھی۔

اگر تمنا کا درخت کاٹ دو

تو اس کے تنے میں پھر حسرتوں کی کونپلیں نکل آتی ہیں

اگر تمنا کا درخت جڑ سے نہ کٹے

تو دُکھ کی کونپلیں کیوں پھوٹیں گی؟

کیونکہ ہر تمنا کو ہمیشہ دُکھ کی کونپلیں لگتی ہیں۔'' (۵۵)

محبت کی آگ نے ماسوا محبوب کے خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اس آگ نے اس کے دل کو روشن اور روح کو منور کر دیا۔ اب وہ کپل وستو کے شہزادے اور راجہ گوپی چند جیسی ہستیوں کی صف میں کھڑا تھا۔

''اور ظفر چلا جا رہا تھا۔ کپل وستو کا شہزادہ...... راجہ گوپی چند چلا جا رہا تھا نالہ ہڈیارہ اور بڈھے دریا کی آبادی اس کے بہت پیچھے رہ گئی تھی......'' (۵۶)

ظفر اعلیٰ اخلاقی قدروں کا امیں ہے۔ مرد ہونے کے باوجود اس میں حجاب اور شرم وحیا کے اوصاف نظر آتے ہیں۔ وہ ایک شریف النفس نوجوان ہے جس نے محبت کی جنوں خیزی کے باوجود حدّ ادب ملحوظ رکھا۔ اسے یاد کرتے ہوئے رشو خود سے کہتی ہے:

''ظفر کتنا خوبصورت تھا!

اس کے خطوں میں کیسی حیا تھی کیسی سادگی تھی!

ظفر اسے کلاس میں کیسے دیکھتا تھا!

ظفر نے اس کی تصویریں کھینچی تھیں شالامار میں۔'' (۵۷)

اس کی پاکیزہ محبت میں رِشیوں اور مِنیوں جیسا تیاگ تھا۔

''جوانی میں محبت میں اندر اور باہر کا ایک رنگ ہوتا ہے...... جون کی دھوپ کا زَرد رنگ...... سہل انگار اس دھوپ سے ڈر کر ماں باپ کی چھاؤں میں جا لیٹتے ہیں لیکن ظفر سہل انگار نہ تھا، اس کے اِرد گرد چوزے کی زردی کھنڈی تھی اور وہ اکیلا ہی اپنی محبت کے یرقان میں مبتلا چلا جا رہا تھا۔ نہ اس نے رشو سے رحم کی التجا کی نہ اس نے اپنے باپ سے وعدہ توڑ ڈالنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ تو اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب بیج خود سیاہ مٹی کا سینہ چیر کر باہر آ نکلتا ہے۔ وہ تو اس لمحے کا منتظر تھا جب رشو کو خود چل کر اس کے پاس آنا تھا۔'' (۵۸)

ظفر صرف محبت ہی میں ادب کا قائل نہیں ہے بلکہ یہ وہ قدر ہے جو بچپن سے لے کر جوانی تک اسے ایک مہذب انسان بنائے ہوئے تھی۔ ظفر کے دل میں باپ کے خلاف لاشعوری نفرت موجود ہونے کے باوجود (جسے بانو قدسیہ ایڈیپس کمپلیکس کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں) وہ ہمیشہ ایک فرمانبردار بیٹے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ اس کے اندر مثبت اور منفی قدروں کی جنگ میں ہمیشہ مثبت قدروں کی جیت ہوئی۔ باپ کے ساتھ ظفر کے تعلقات کی نوعیت ہمیشہ اس طرح کی رہی:

''ظفر؟''

''جی ابا جی!''

''ذرا اِدھر آنا۔''

وہ دُم دبائے کتے کی طرح اندر چلا گیا۔ (۵۹)

''اس نے جی میں سوچا، میں ابا جی کی خاطر اس کھڑکی سے کود سکتا ہوں، ہکسلے کے ناول پڑھ سکتا ہوں، ان کے لیے جان دے سکتا ہوں، لیکن دوستی...... توبہ! توبہ! ابا جی سے دوستی کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔ اکیلا میں کیا کوئی بھی تو نہیں کر سکتا۔'' (۶۰)

وہ اپنے باپ کے خلاف دل میں وقتاً فوقتاً ابھرنے والی نفرت سے خائف رہتا تھا۔ لیکن گوشمالی کے بعد وہ ایسے خیالات پر قابو پا لیا کرتا۔

''رشو جان میز پر کہنی ٹکائے بیٹھی تھی۔ ڈمپل دو موہے کانٹے کے ساتھ چار تہہ والا سموسہ کھانے میں مصروف تھی اور ظفر سوچ رہا تھا، کاش رشو مجھ سے کہے، جا اپنے باپ کا کلیجہ نکال کر سٹین لیس سٹیل کے طشت میں دھر کر لے آ۔ کاش یہ کہے کہ دیکھ میں سلومی ہوں اور جب تک تیرے باپ کا کلیجہ لہو اور انگوری شراب میں ڈوبا ہوا میرے سامنے نہ آئے گا، میں تجھ سے کبھی نہ بولوں گی۔

اس مکروہ خیال سے اس نے گردن جھٹک کر چھٹکارا تو پالیا لیکن ضمیر کا تیر دل میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔'' (۶۱)

باپ کے ساتھ محبت اور نفرت کی کشمکش میں وہ الجھا رہا، لیکن اس پر کبھی کوئی منفی قدر زیادہ دیر تک حاوی نہ رہ سکی۔

''جب سے رشو کو خط لکھنے کا سلسلہ بند ہوا تھا، وہ اپنے جذبات پر کارک لگانے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن اب اس کے دل میں اپنے باپ کے خلاف وہ دبا دبا بغض اکٹھا ہو رہا تھا جو کارک لگانے کے باعث بڑی شدت کے ساتھ تبخیر کی صورت میں جمع ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے باپ سے بیک وقت نفرت اور محبت کا شکار ہو چکا تھا۔'' (۶۲)

''محبت کا پُر جوش ریلا اس کے دل میں گھستا چلا آیا۔ وہ جی میں سوچنے لگا، یہ بوڑھا آدمی جو بظاہر نوجوان لگتا ہے، کس قدر خستہ ہے۔ اس کے کئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے...... کندھوں میں ہلکا سا خم...... بالوں میں کھلی میلی سیاہی......اسے نہ جانے کیوں یاد آیا؟

اپنے باپ کی عزت کر

اپنے باپ کے لرزتے قدم دیکھ......

دیکھ کہ یہ سایہ سورج غروب ہونے کے خوف سے لرز رہا ہے

دیکھ یہ سایہ شام کی ظلمت سے جھگڑ رہا ہے

دیکھ اور سوچ......

یہ سایہ کہیں تیرا اپنا سایہ تو نہیں......؟

جی ہی جی میں اس نے اپنے باپ کے لیے دعا مانگی۔ اپنے باپ کی خوشیوں کے لیے ہاتھ

اٹھائے۔اس کی تمنائیں بَرآنے کی خواہش کی۔"(۶۳)

فرمانبرداری، اطاعت شعاری اور رشتوں کے تقدس کی پاسداری اس کی پہچان تھے۔وہ مشترکہ خاندان میں پلنے والا نوجوان ہے جہاں کی مشرقی اخلاقی اقدار نے اس کی ذہنی تربیت کی ہے۔باپ نے اسے رشو کو خط نہ لکھنے کا حکم دیا اور وہ باپ سے کیے وعدے کی زنجیر میں بندھا رہا۔اس نے اپنے ہونٹ سی لیے۔وہ اندر ہی اندر اس وعدے کی پاسداری پر تڑپتا رہا لیکن وعدے کا پکا اور وفا شناس تھا۔اس نے باپ کو دھوکہ نہیں دیا جبکہ اس کا باپ اسے دغا دے گیا۔

"اگر آپ مجھے اس وعدے سے رہا کر دیں تو......تو......میں کم از کم ایک بار......میں اس سے ایک بار شادی کی درخواست کرنا چاہتا ہوں......ایک بار......میں......میں اس تذبذب میں زندہ نہیں رہ سکتا۔میں پڑھ نہیں سکتا ابا جی......میں" پھر حجاب نے اس کی زبان پکڑی۔

"آپ......آپ کو میں بتانے آیا تھا ابا جی......کہ میں اپنا وعدہ نہیں رکھ سکتا......کوئی طاقت ہر لمحہ ہر وقت مجھے یہ وعدہ توڑنے پر اُکساتی رہتی ہے......میں اس طاقت کے خلاف زیادہ دیر تک اپنی کمزور ڈھال کا سہارا نہیں لے سکتا......"

"وہ تمہارے متعلق کچھ نہیں سوچتی......نہ مثبت نہ منفی......"

"وہ......وہ مجھ سے اس قدر لاتعلق نہیں رہ سکتی۔وہ مجھ سے نفرت کر سکتی ہے لیکن وہ مجھ سے لاتعلق نہیں ہو سکتی......ابا جی......"

ملک صاحب ظفر کو اپنی شادی کی اطلاع نہ دینا چاہتے تھے۔جس رازداری سے انہوں نے نکاح کیا تھا، وہ اس رازداری کو تاحیات قائم رکھنا چاہتے تھے......اب تمہیں رشو کا خیال چھوڑ دینا چاہیے......کیونکہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔"(۶۴)

ظفر کے کردار میں بانو قدسیہ نے مثالی مشرقی اور ازلی وابدی اخلاقی اقدار کو جمع کر دیا ہے۔ان اقدار نے ظفر کے کردار کو بے پناہ استحکام عطا کر رکھا ہے۔ان کی بدولت وہ اپنی تمام تر شدت پسندی کے باوجود ذہنی انتشار سے بچا رہا۔

مشترکہ خاندان کی اقدار و روایات میں آنکھ کھولنے والے ظفر کا بچپن محبت،خلوص اور شفقت کی آغوش میں بسر ہوا، ماں باپ، بہن بھائیوں،عزیز رشتے داروں کی قربت نے اسے جو تحفظ عطا کیا اُس نے ظفر کی شخصیت میں کوئی ذہنی الجھاؤ اور کج روی پیدا نہیں ہونے دی۔اس دَور کی ذہنی اور جذباتی تسکین نے اس کی شخصیت کو پُراعتماد بنانے میں بنیادی

کردار ادا کیا۔

مشترکہ خاندان کی روایتی اقدار میں اس کی شخصیت پنپتی رہی۔ بچپن میں حاصل کی ہوئی ان توانا اقدار نے جوانی میں اسے بڑی توانائی عطا کی۔

بانو قدسیہ نے اس کردار کے اندر تصادمِ قدر کی کوئی صورتِ حال نہیں دکھائی۔ باپ کے ساتھ اس کے رویے میں معمولی سی کشمکش ضرور موجود ہے۔ لیکن یہ کبھی بھی مسائل پیدا کرنے کا باعث نہیں بنی۔ ایسا نہیں کہ ظفر کا کردار جامد ہے، بلکہ وہ فکری و روحانی ارتقاء کے سفر میں کردار کی عظمتوں کو حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس سفر میں کبھی بھی اس کی اقدار ڈانواڈول نہیں ہوئیں۔ ان پر اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ وہ اپنی اقدار کے حوالے سے کبھی تذبذب کا شکار نہیں ہوا۔ نہ تو اسے اپنی اقدار پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی وہ شکست و ریخت کا شکار ہوئیں۔ یہی اس کی ذہنی صحت مندی کا راز ہے۔

ظفر کو اپنی زندگی میں شدید قسم کے ذہنی دھچکوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ ہر جھٹکے کی شدت کو برداشت کر گیا۔ اس نے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھتے ہوئے رشتوں کے تقدس کو پامال نہیں ہونے دیا۔ پختہ مثبت قدروں کی بدولت وہ کبھی منفی قدروں کا شکار نہیں ہوا۔ انتہائی ذہنی انتشار کے دِنوں میں بھی وہ بے راہرو نہیں ہوا، بلکہ اس کی اقدار نے، جو اُس کی ذہنی و جذباتی تہذیب کر رکھی ہے، اس کی بدولت اس کے دکھ نے مثبت صورت اختیار کر کے اسے عرفان و آگہی کی منزلوں سے ہمکنار کر دیا ہے۔

محبت کی ناکامی سے اس کے اندر جوالہ مکھی پھٹ پڑا۔ سطوتِ شہر میں وہ خارش زدہ کتے کی طرح گھوم رہا تھا۔ [۶۵] وہ کئی راتیں باغِ جناح کی روِشوں پر ٹہلتا رہا۔ اس باغ نے اس کے عشق کو تھپتھپانے کی بجائے ان پھولوں کی طرح دُہکا دیا جو سوکھے درختوں پر جاپانی پھل کی طرح چمکا کرتے ہیں اور جنہیں مالی لوگ جنگل کی آگ کہتے ہیں۔ [۶۶] باغِ جناح نے اس کے دل کو برف میں لگانے کی بجائے اس میں جنگل کی آگ دہکا دی تھی۔ وہ سوچتا رہتا بے ربط باتیں دکھ بھری باتیں...... بدھ کی طرح زندگی چھوڑنے کی باتیں...... راسپوتین کی زندگی سے ادھار لی ہوئی باتیں۔ لیکن اس جذباتی طوفان کے ''مدوجزر اکبر'' نے اس کے اعصاب کو شل نہیں کیا۔ وہ کسی ذہنی اور نفسی کج روی کا شکار نہیں ہوا۔ اس نے نہ تو منشیات کا سہارا لیا نہ خودکشی کی اور نہ اپنے باپ کا قتل کیا اور نہ اپنی محبوبہ کے ساتھ غیر اخلاقی تعلق استوار کیا۔ اس کی پختہ اخلاقی اقدار نے اس کے رویوں، جذبوں اور فکر کو مثبت سمت عطا کر کے اسے بکھرنے سے بچا لیا۔

ظفر حالات کے دباؤ اور جبر کی وجہ سے ذہنی و جذباتی انتشار کا شکار ضرور ہوا لیکن کمزور ترین لمحوں میں بھی پختہ

اخلاقی اقدار نے اسے سہارا دے رکھا۔ بانو قدسیہ ظفر کی پیغمبرانی پاکیزگی کو اُس کی پختہ اخلاقی اقدار کا ثمر قرار دیتے ہوئے ایک حکایت کے ذریعے اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں:

''راجہ اسے بیاہ کر اپنے شہر کی طرف چل دیا۔ لوناں باندی سے کہنے لگی......تو جلدی سے شہر میں جا کوئی ایسا آدمی ڈھونڈھ کے لا جو مجھ جیسا ہو۔ راجہ سالواہن بوڑھا ہے یہ میرے کام کا نہیں۔

ہیرا باندی وہاں سے چلی اور شہر میں پہنچ گئی۔ اس نے پورن کا چہرہ دیکھا تو غش کھا کر گر پڑی۔ پھر جلدی سے اٹھ کر لوناں کے پاس آئی۔

پورن تجھ سے بھی حسین ہے، وہ تیرے لیے موزوں بَر ہے۔ وہ تیری سوت کا بیٹا ہے، مگر ہے بہت حسین۔

پورن لونا کے محل میں آیا۔ رام رام کہا اور ماں کے سامنے سیس نوا دیے۔

مجھے ماتا نہ کہہ، میں تیری ہم عمر ہوں۔

کماں زوروں پر ہے اسے کھینچ کر لطف اُٹھا۔

جیسے تنور سے شعلہ اٹھتا ہے اور بجھائے نہیں بجھتا، یہی میری حالت ہے۔

اے ماتا کیوں دھرم کی جڑ کاٹتی ہو؟

اگر ماں بیٹے میں ایسے تعلقات قائم ہو جائیں تو دنیا تباہ ہو جائے، گناہ کا برتن پھینک دو، دھرم کے برتن سے غسل کرو......''(٦٧)

''ظفر کا وجود پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سارا جسم سُن اور دماغ ماؤف تھا، اپنا گھر زنداں، ہوائیں دشمن اور موسم زہر آگیں ہو گیا۔ وہ بیک وقت ظفر تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ سائیکلوجی کا طالب تھا......ورٹیگو کے مریض کی طرح ساری کائنات اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کے اندر اس کا اپنا وجود لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ لوناں ماتا کے سامنے پورن بھگت کی طرح کھڑا تھا۔''(٦٨)

بانو قدسیہ مثبت قدروں کے حامل اس کردار کے ذریعے اخلاقی قدروں کی عظمت و اہمیت اُجاگر کرتی ہوئی نظر آتی

ہیں۔ وہ روحانی قدروں کی طاقت پر یقین رکھتی ہیں اور انسانی زندگی پر اس کے مثبت اثرات ظفر کی شخصیت کے حوالے سے نمایاں کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ کے نقطۂ نظر کے حوالے سے، رشو اِس ناول کا وہ کردار ہے جس کے ذریعے ہم فرد پر اِقدار کی شکست و ریخت کے اثرات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

رشو

رشیدہ میر بہاولپور کی رہنے والی سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اس کی پرورش قدیم بہاول پور کی روایتی اقدار کی فضا میں ہوئی ہے۔ اس وقت کے بہاول پور کا نقشہ بانو قدسیہ یوں کھینچتی ہیں:

''قیامِ پاکستان سے پہلے جب بہاول پور سے دلّی کو راستہ جاتا تھا، تب بہاول پور پُر بہار شہر تھا۔ پھولوں سے لدی ڈالی کی طرح پُرکشش اور شگفتہ......لیکن اب یہ صرف سفید پوشوں کا شہر تھا۔ جہاں صرف نجابت اور خاندانی شجروں کی باتیں ہوتی تھیں۔ پدرم سلطان بود کے نعرے لگتے تھے اور شہر کے معزز شہری اپنے اپنے گھر پہنچ کر اپنی اپنی عزت کو پگڑی کے ساتھ کھونٹی پر لٹکا کر اطمینان کا سانس لیتے تھے۔''(۶۹)

''ادھر بہاول پور میں چھوٹے سے سٹیشن پر نہ کوئی لاؤڈ سپیکر تھے نہ ہی ان سے نسوانی آوازیں پھوٹ پھوٹ کر ٹرینوں کی آمدورفت کا پتہ دیتی تھیں۔''(۷۰)

بہاول پور قدیم روایتی اقدار کا شہر تھا۔ یہ صنعتی معاشرے کی مشینی زندگی اور معروضی اقدار سے الگ تھلک چھوٹی بڑی زمینداریوں پر مشتمل تھا۔ یہاں کے سماجی اور معاشرتی حالات میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی تھی جو اُن کی قدیم اقدار میں تبدیلی کا باعث بنتی۔ یہ ایک غیر ترقی یافتہ سفید پوشوں کا شہر تھا جس کی زندگی ہنگامہ خیزی، ہلچل اور نت نئی تبدیلیوں سے بالکل عاری تھی۔ سست روز زندگی کے معمولات سالہا سال سے ایک ہی ڈگر پر چل رہے تھے۔

''سب گھر میں اٹھ گئے ہوں گے۔ ہتھی سے چلنے والے نلکے کے سامنے سب نے وضو کیا ہو گا۔ زری چھوٹے چھوٹے گیلے پیر لیے جانماز پر بیٹھی کبھی راشدہ، کبھی امی کا منہ تکتی ہو گی، لیکن اب تو سورج نکل آیا ہو گا......وہ لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے

ہوں گے۔ خالد پلاسٹک کا بیگ لے کر، ابا جی کی سائیکل پر سبزی گوشت لینے گیا ہو گا......''(۷۱)

اس چھوٹے سے اقتباس میں ہمیں بہاول پور کی زندگی اور اقدار کی طرف بہت سے اشارے مل جاتے ہیں۔ بہاول پور غیر ترقی یافتہ شہر ہے۔ یہاں ابھی تک گھروں میں ہتھی سے چلنے والے نلکے لگے ہیں، مذہبی اقدار گھروں میں پختہ ہیں اور چھوٹے بچے بڑوں سے یہ اقدار سیکھ رہے ہیں۔ صبح سویرے اٹھ جانا اور معمولاتِ زندگی کا آغاز کر دینا یہاں کا دستور ہے۔ ہفتے بھر یا مہینے کا سودا سلف لانے کی بجائے ہر روز تازہ گوشت اور سبزی بازار سے آتی ہے۔ اس وقت کے لاہور کا موازنہ بہاول پور سے کیا جائے تو بہاول پور بہت ہی پسماندہ شہر نظر آتا ہے۔ اس کی سماجی زندگی پر بھی اسی لحاظ سے سادگی کا غلبہ ہے۔ بڑی بڑی زمینداریاں، شان وشکوہ اور کروفر اس شہر سے ختم ہو چکا ہے۔ جو باقی رہ چکا ہے وہ پرانی اقدار وروایات ہیں۔ جن میں مشترکہ خاندانی زندگی کی روایتی اقدار شرافت اور نجابت، خلوص، صادگی، صبر، شکر اور قناعت بہاول پور کی معاشرتی زندگی کا حصہ ہیں۔

''رشو کے والد بھی سفید پوش تھے، آبائی زمینیں، جنہیں ہندوستان سے منسلکہ نہروں کا آتا جاتا پانی تباہ کر چکا تھا......ان سے بمشکل تمام اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ سال بھر بڑی کفایت سے گزراوقات کی جا سکتی۔ وہ تو اماں کی جُزرسی تھی کہ قرض لیے بغیر کام چل رہا تھا۔ ورنہ ابا جی تو نہ جانے کیا کیا سکیمیں بناتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے حالات سے اس قدر تنگ آ جاتے کہ کویت اور بحرین جانے کا پکا منصوبہ بن جاتا۔ ایسے میں انہیں کھونٹے سے دادی اماں باندھتیں، جنہیں اس کنگروں والی حویلی سے بڑا پیار تھا۔''(۷۲)

پورے بہاول پور شہر کی معاشرتی زندگی کسمپرسی کا شکار تھی۔ معاشرتی زندگی کی سفید پوشی نے اس شہر کو پژمردہ کر رکھا تھا۔ مالدار شہروں کی چونچالی اور زندہ دلی اس سے کوسوں دور تھی۔ اس کے ریلوے اسٹیشن سنسان اور سڑکیں ویران رہتی تھیں۔ بہاول پور اور لاہور کا موازنہ رشو دل ہی دل میں یوں کرتی ہے:

''اس سفر میں رشو جان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے افریقہ کے جنگلوں سے پکڑ کر کوئی اسے لاس اینجلس کے دل ہالی وڈ میں گھسیٹ لایا ہو۔''(۷۳)

سفید پوش بہاول پور کی سادہ زندگی کی اقدار قدیم اور روایتی ہیں۔ گو نئی نسل کی لڑکیاں اب تعلیم حاصل کرنے لگی

ہیں لیکن ان کے ذہنوں پر ان کی ماؤں کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ ان کی سوچوں کی رہنمائی برسوں پرانی اقدار کرتی ہیں۔ ان کی زندگی میں تھیٹر، سینما، کلب اور بازار نہیں بلکہ گھر کی صفائی ستھرائی اور آنے والے دُلہا کا انتظار کرنا ہے۔

''ادھر رشیدہ گھر کی صفائیاں کر کر کے تھک چکی تھی، ہر صبح بستر بچھاتے، گلدانوں میں پھول سجاتے، دریاں جھاڑتے، تخت پوش کے تکیے ٹھکانے سے لگاتے ہوئے اس کے دل میں آنے والے دُلہا کے قدموں کی چاپ اٹھتی، دل ایک انجانے اضطراب سے کانپتا، ہر نئی آواز، ہر نئی دستک پر امید کی لَو اُبھرتی اور دل میں ایک انجانی سی خوشی بھل بھل کر کے بھر جاتی۔''(۷۴)

بہاول پور کی ماں اپنی بیٹی کو جو اِقدار منتقل کر رہی تھی وہ کچھ اس طرح کی تھیں:

''رشو جان کا رشتہ ہمیں بیٹھے بٹھائے آ ملے گا۔ شادی تو نصیب سے ہوتی ہے جہاں لکھی ہوتی ہے وہیں ہوتی ہے۔ دولہا سات سمندر پار سے آئے چاہے ساتھ والے گاؤں سے...... آپی آپ آجاتا ہے...... پچھمی ہواؤں کی طرح......''(۷۵)

بہاول پور شہر کی روایتی اقدار کے ساتھ رشو کو جو خاندانی اقدار ورثے میں ملیں اُن پر حزن و یاس کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ یہ گھرانہ کفایت شعاری، قناعت اور توکل کے بل بوتے پر زندگی گزار رہا تھا۔ برادری سے تعلق رکھنے والے دوسرے گھرانوں کے حالات ان کی نسبت بہتر تھے۔

''بدقسمتی سے رشو کے چھوٹے سے کنبے کا رشتہ باقی برادری سے کبھی کا کٹ چکا تھا۔ شادی بیاہ میں کارڈ وغیرہ ضرور آ جاتے تھے لیکن نہ اِدھر سے جانے کی استطاعت تھی نہ ادھر سے کبھی اصرار ہی ہوا تھا۔ جب سے رشو نے ہوش سنبھالا، لاہور والے رشتہ دار نہایت دور، بے حد پُراسرار اور بہت ہی مختارِ کل نظر آئے۔ ان کی جو بھی خیر خبر بہاول پور پہنچتی سنہری حروف میں لکھوا کر فریم کر کے دِلوں میں لٹکائی جاتی۔ لاہور والے ہر طرح سے اعلیٰ و ارفع تھے۔ رشیدہ کا ننھا سا کنبہ کسی طرح بھی ان کی رِیس نہ کر سکتا تھا۔ اگر کبھی کوئی لاہور سے آ ٹپکتا تو اس کے لیے مرغی پلاؤ، قورمہ، کوفتے انگلی انگلی گھی میں تیرتے پکائے جاتے۔ امی کے جہیز کی پلش کی رضائیاں نکلتیں۔ کڑھی ہوئی چادریں بچھائی جاتیں۔ گھر میں سے اگربتیوں کی خوشبو آتی اور

پہلی ہی شام مہمان کو نواب صاحب کا محل دکھانے کا پروگرام بنتا۔‘‘(۷۶)

شہر کی مجموعی معاشرتی زندگی اور خاندانی حالات نے رشو کے اندر عجز وانکسار، جھجک اور احساسِ کمتری کو جنم دیا۔ وہ کبھی بھی اعتماد کے ساتھ اپنے احساسات وجذبات کا اظہار نہ کر سکی۔ بچپن میں وہ سلام کرنے سے ہچکچاتی تھی تو جوانی میں ظفر کی محبت کا نہ تو دوٹوک انداز میں اقرار کر سکی اور نہ ہی انکار۔

’’بچپن میں اسے بزرگوں کو سلام کرنے سے بڑی شرم آتی تھی۔ ذرا گھر میں کوئی آ جاتا تو وہ ٹرنکوں والی کوٹھری میں محض اس خوف سے چھپ جاتی کہ کہیں سلام نہ کرنا پڑ جائے۔ امّاں اس کی اس عادت سے بہت نالاں تھیں۔ الٹا ایک ایک آدمی کو چار چار بار سلام کرواتیں...... ذرا بڑی ہوئی تو سلام کرنے کی عادت تو پڑ گئی لیکن ایک اور گانٹھ پڑ گئی۔ ذرا جو کسی دوست سے بول چال بند ہو جاتی تو مہینوں سلسلۂ کلام منقطع رہتا۔ ذرا سی پھانس مغلئی پھوڑے کی طرح رِسنے لگتی۔ اگر ادھر سے صلح کا جھنڈا بلند نہ ہوتا تو ادھر سے لاکھ چاہنے کے باوجود رشو کے لیے دوست کو منانے کی صورت نہ نکلتی۔ ایسا پرت دار حجاب پیدا ہو جاتا......
کالج میں آ کر بھی یہ عادت نہ گئی۔ وہ دوستوں سے ہمیشہ متفق رہنے کو اسی لیے ترجیح دیتی تھی کہ اگر خدانخواستہ دوست روٹھ گئی تو پھر منائے گا کون؟‘‘(۷۷)

رشو نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ بڑا اقدامت پرست تھا۔ جہاں لڑکیوں میں سرِتسلیم خم کرنے کی خُو پیدا کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں جرأت اور اعتماد پیدا نہ ہو سکا۔ جرأتِ اظہار کی کمی نے اسے ایک کمزور کردار شخصیت بنا دیا۔

’’جب ڈمپل بیڈ لیمپ بجھا کر سو گئی تو یکدم رشو کو اپنے رویے پر تأسف ہونے لگا۔ ایسی محسن سے اس قدر بے رُخی اور وہ بھی بلاوجہ...... اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت لعنت ملامت کی لیکن اتنی ہمت نہ پیدا کر سکی کہ اٹھ کر ڈمپل کے پلنگ تک جا سکتی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہہ سکتی آئی ایم سوری!
زندگی بھر رشو میں یہی عیب رہا۔ جب خوب ندامت میں بھیگ جاتی تو اندر ہی اندر کڑھتی لیکن ندامت کے اظہار کا کوئی راستہ نہ نکل سکتا......‘‘(۷۸)

رشو کا باپ نسبتاً روشن خیال تھا۔ دراصل رشو کے والد میں بھی حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ بھی رشو کی

طرح جرأت سے محروم تھا۔ وہ ساری عمر رشو کو بیٹی کی بجائے بیٹا کہہ کر پکارتا رہا اور خود کو اس فریب میں مبتلا رکھا کہ رشو حقیقت میں بیٹا ہی ہے۔

''شاباش میرا بیٹا! جب تو پیدا ہونے والی تھی تو میں تیری ماں سے کہا کرتا تھا، سن بھاگ بھری! ہم ریاستی لوگوں کے ہاں ہمیشہ پہلوٹھی کا بیٹا ہی پیدا ہوا کرتا ہے۔ میں اس کا نام شمشیر علی رکھوں گا یا ضیغم پرویز...... آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بچی سے...... باپ بیٹا بات کرتے ہوں تو تُو بیچ میں مت بولا کر...... ہاں...... تو پھر تو پیدا ہوئی تو میں نے تیری ماں سے کہا...... یہ دراصل بیٹا ہی ہے۔ وہ رب سائیں مجھے آزما رہا ہے۔ میرے صبر کو آزما رہا ہے۔ میں نے تیرا نام اشرف النساء رکھا تھا۔ خدا جانے تیری ماں نے اسے رشیدہ میں کیوں بدل دیا۔'' (۷۹)

فریب خوردہ روشن خیالی کے ساتھ رشیدہ کی پرورش ہوئی۔

''ابا جی کی ساری امیدیں زمین پر ٹیوب ویل لگوانے کے بعد رشو کو بی اے بی ٹی کروانے کے ساتھ بندھی تھیں۔ جب وہ ایف اے میں ہوئی تو ابا اسے اپنے ساتھ کھانا کھلانے لگے۔

کھانے کے دوران وہ ساری اچھی اچھی بوٹیاں، روغنی ہڈی، حلوے سے گریاں، ناریل نکال کر اس کی تھالی میں رکھتے جاتے اور کہتے۔

ہماری رشو لڑکی تھوڑی ہے...... یہ تو لڑکا ہے لڑکا...... اس کی تو میں شادی کبھی نہیں کروں گا۔

ہماری رشو تو بی اے بی ٹی کرے گی، کیوں رشو؟

جی ابا جی......

اور پھر ہماری رشو بہاول پور سکول کی ہیڈ مسٹریس بنے گی، انسپکٹر آف سکولز بنے گی...... یہ تو ہے ہی میرا دایاں بازو...... یہ تو ہے ہی میرا بیٹا...... کیوں رشو؟

جی ابا جی......

ابا کو دغا تو نہیں دے گی۔

نہیں ابا جی...... (۸۰)

رشو نے دوغلی اقدار کے ساتھ پرورش پائی۔ ماں نے اسے مشرقی لڑکی کی روایتی اقدار سے نوازا تو باپ نے اسے لڑکی ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ ایک طرف وہ عجز وانکسار، تسلیم اور شرم وحیا کی اقدار کے ساتھ اپنے آنے والے دُلہا کا انتظار کر رہی تھی تو دوسری طرف ان اقدار کی زنجیروں کو توڑ دینے کی لاشعوری خواہشیں بھی اس کے اندر پرورش پا رہی تھیں، کیونکہ وہ بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ وہ رشیدہ کے ساتھ ساتھ روشن خیال اشرف النساء کی پرچھائیں کو بھی اپنے ساتھ لے کر بڑی ہوتی رہی۔ وہ لڑکا تو نہیں بن سکتی تھی لیکن لاہور آ کر مشرقی لڑکی کی روایتی اقدار سے جونہی چھٹکارا پانے کا موقع ملا تو اس نے یہ موقع ضائع نہیں کیا۔

ماں اور باپ کے طرزِ فکر میں اختلاف کی وجہ سے رشو کے اندر کوئی واضح اور ٹھوس نظامِ اقدار تشکیل نہ پا سکا۔ اس کی عدم موجودگی سے اس کے رجحانات اور رویے بھی کوئی واضح سمت اختیار نہ کر سکے۔ اس کے پاس اقدار کا محض دُھندلا سا خاکہ ہے جو کڑے وقتوں میں اس کے لیے صحیح راہِ عمل متعیّن کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

رشو جن اقدار کو ساتھ لے کر لاہور آئی ان پر اس کا ایمان اور بھروسہ مضبوط نہ تھا۔ وہ تشکیک کا شکار تھی اسی لیے لاہور شہر میں قدم رکھتے ہی اس کی اقدار شکست وریخت کا شکار ہونے لگتی ہیں۔ وہ کمزور اقدار کی حامل تھی اسی لیے لاہور کی توانا اقدار نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔

لاہور کی سماجی زندگی کے اثرات

لاہور شہر کی پہلی جھلک دیکھ کر ہی رشو بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔ یہاں کی بالکل ہی مختلف دنیا کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

> ''جس وقت گاڑی پلیٹ فارم پر رُکی اور رشیدہ نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا، لاہور کی پہلی جھلک شیر کی گرج بن کر خیر مقدم کو آئی۔ ادھر بہاول پور میں چھوٹے سے سٹیشن پر نہ کوئی لاؤڈ سپیکر تھے نہ ہی ان میں سے نسوانی آوازیں پھوٹ پھوٹ کر ٹرینوں کی آمد ورفت کا پتہ دیتی تھیں۔ رشو جان نے جلدی سے اپنا پرس سنبھالا اور جی میں سوچا کہ کیوں نہ ابھی ٹکٹ خرید کر واپس چلی جاؤں۔ امی بھی خوش ہو جائیں گی اور اس بحرِ ذخّار میں اپنی بے پتوار کشتی

چھوڑنے سے بھی بچ جاؤں گی۔'' (۸۱)

بہاول پور کے مقابلے میں لاہور کی برتری کے احساس نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا اور دل و جاں نے فوراً اسے قبول کر لیا۔ نئی زندگی کے پہلے ہی دن کے تجربے نے اس پر ثابت کر دیا کہ بہاول پور کی اقدار کے ساتھ لاہور میں نہیں رہا جا سکتا۔

'' آپ کا کیا نام ہے مِس؟

رشو یکدم اٹھ کر بولی۔

مِس رشیدہ میر۔

بیٹھیے بیٹھیے!

رشو کے کھڑا ہونے پر ساری کلاس بہت محظوظ ہوئی۔

بہاول پور میں شاگرد کھڑے ہو کر جواب دیتے ہوں تو خیر، ادھر لاہور کے لیے یہ طریقہ بالکل جنگلی تھا۔ ظفر نے پیچھے سے ذرا سا ہاتھ بڑھایا اور رشو جان کے دوپٹے کو جھٹکا دیا۔ وہ جھٹکا کھا کر پیچا کھائی پتنگ کی طرح کرسی میں گر گئی۔'' (۸۲)

'' آپ کہاں سے آئی ہیں مس رشیدہ!

مارے ادب کے پھر اس نے اٹھ کر کہا، جی بہاول پور سے۔

اس بار قہقہہ اتنا بلند تھا جیسے بہت سارے کوّے یکبارگی اُڑے ہوں۔ بیٹھیے بیٹھیے پلیز......

آپ نے بی اے میں کون سے مضمون لیے تھے مِس میر؟

اس بار رشیدہ نے اٹھنے کے لیے جسم ابھارا اور پھر اٹھے بغیر بولی، جی اکنامکس اور سائیکلوجی۔'' (۸۳)

یونیورسٹی میں داخلے کے پہلے ہی روز اسے اپنی اقدار کی بوسیدگی کا علم ہو گیا۔ خالہ فیروزہ کے گھر اور یونیورسٹی میں یکے بعد دیگرے وہ ذہنی اور جذباتی دھچکوں سے گزرتی رہی۔ اس کی تعلیم بی اے تک تھی اور کالج میں اس نے سائیکلوجی پڑھ رکھی تھی، لیکن جس قدر صراحت کے ساتھ جنس اور جنسی تعلقات کے موضوع پر کلاس روم میں لیکچر ہو رہا تھا، وہ اس کے لیے ذہنی دھچکے کا باعث تھا۔ اتنی کھلم کھلا گفتگو سن کر وہ جذباتی ہیجان کا شکار ہو گئی۔

''رشیدہ کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اور وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ بالکل برہنہ کھڑی ہے اور گلی کے بچے اس کے گرد تالیاں پیٹ رہے ہیں...... کہنے کو تو رشیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس کا دل کبوتری کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سفید رومال میں ناک کو بھوں بھوں کر کے صاف کرنے والا پروفیسر، اس کی پشت پر بلیک بورڈ، سامنے پڑا ہوا منبر نما ڈسک سب پانی کے عکس کی طرح ہل رہے تھے...... رشیدہ کی بغلوں میں پسینے کی وجہ سے ہلکی ہلکی مہک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس کمرے سے اس لیکچر سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ بی اے میں بھی اس نے ایڈیپس کومپلیکس پڑھا تھا، لیکن نہ تو زاویہ یہ تھا نہ اس قدر بیان میں کھلا پن اور بے باکی تھی۔ رشیدہ کی نظریں پیوستِ فرش ہو گئیں۔ ساری کلاس کھٹ کھٹ کاپیوں پر نوٹس لے رہی تھی لیکن اس کی انگلیوں میں برف کی قلمیں جم گئی تھیں۔ سانس میں ناہموار کیفیت تھی۔ اسے وہم سا ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی اسے مرگی کا دورہ پڑنے والا ہے۔'' (۸۴)

رشو بہاول پور جیسے پسماندہ شہر سے آئی تھی، لاہور کی ترقی یافتہ معاشرتی زندگی، امارت اور چمک دمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔

''سینما گھروں کے سامنے اب رش کم تھا۔ لیکن بتیوں کی جگمگاہٹ اور بڑے بڑے سائن بورڈوں کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھی...... یہ سارے سائن بورڈ رنگ و نور کا گلال بکھیرے اسے بلا رہے تھے۔ سارے لاہور کا گلیمر اس کے استقبال کے لیے بڑھا آ رہا تھا۔'' (۸۵)

لاہور کا گلیمر ایسا نہ تھا جس سے رشو اپنے آپ کو بچا سکتی۔ لاہور کی لڑکیوں کا فیشن اور ناز و ادا اس کے حواس معطل کر رہے تھے۔

''میز پر سفید دستانے اور لمبوترا پرس رکھنے والی ڈمپل امریکی اشتہاروں کی طرح مجلّی اور چمکدار تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں چمکتے دانت، اوپر کو اُٹھی ہوئی پلکیں، سر پر بالوں کی آراستہ پگڑی، کانوں میں پہنے ہوئے لیمن ڈراپ جیسے آویزے، سب کچھ اشتہاری تھا۔ وہ لشتم پشتم سویّوں کی طرح بڑی لچھے دار اور چکنی چکنی انگریزی بولتی تھی، اور بولتی چلی جاتی تھی، ڈمپل

سر کے بالوں سے لے کر جوتی کے نیچے تک کاروں کے نئے ماڈلوں کی طرح بڑی دلآویز
تھی۔'' (۸۶)

رشو اپنے پس ماندہ پس منظر، اپنے لباس حتیٰ کہ اپنی شکل وصورت کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگی۔

''رشو نے پہلی بار اپنے لمبے کان بالوں تلے چھپا لینا چاہے۔ڈمپل کے سامنے کسی اور لڑکی کو
اپنے آپ کو جنسِ لطیف سمجھنے کا حق ہی باقی نہ رہتا تھا۔'' (۸۷)

رشو لاہور اور اہلِ لاہور سے پوری طرح مرعوب ہو چکی تھی۔

''توبہ کالج آ کر تو بے حد وقت ضائع ہوتا ہے۔اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی گھر بیٹھ کر مطالعہ کر
لے۔سچ!
رشو جان یہ جملہ سن کر یکدم چونک گئی۔اس نے جس لمحہ کالج کے پھاٹک کے اندر قدم رکھا
تھا، اس وقت سے لے کر لیڈیز روم کی ٹھنڈی کرسی پر بیٹھنے تک ایک ایک لمحہ کبوتری کے
پوٹے کی طرح جاندار اور بھرا ہوا تھا۔وہ پروفیسر جس میں لڑکیاں بیٹھی زمانے بھر کے نقص
نکال رہی تھیں، رشو جان کو کسی انگریزی فلم کے کیریکٹر کی طرح پُر خلوص، تجربہ کار اور بے انتہا
فاضل لگ رہا تھا......رشو جان پر تو اعجاز حسین صاحب کی شخصیت نے اتنا بوجھ ڈالا تھا کہ دل
کی کلی یکدم پریس ہو گئی تھی۔'' (۸۸)

بہاول پور سے لاہور آ کر رشیدہ، خالہ فیروزہ کے گھر میں ٹھہری یہ گھر لاہور کی روشن خیالی کا آئینہ دار تھا۔خالہ فیروزہ، ان کی بیٹی تنویر اور بیٹا سبھی لاہور کی جدید زندگی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔اس گھر کی زندگی اور اس کے معمولات نے رشو کی فکری دنیا میں ہلچل مچا دی۔

''رشو جان کچھ بھونرے میں تو پلی نہ تھی کہ شہزادہ گلفام کی طرح چودہ برس کسی نیکی بدی کا علم نہ
ہو سکتا۔بی اے تک تعلیم تھا۔سائیکلوجی جیسا مضمون پڑھا تھا۔باتیں تو سبھی معلوم تھیں۔لیکن
باتیں معلوم ہونے کا یہ مطلب نہ تھا کہ ان پر ایمان بھی آ گیا تھا۔تھیوری اور تجربے میں جو
فرق ہوتا ہے وہی رشو کی تعلیم اور سادہ زندگی میں نمایاں تھا۔علم کے جو پشتارے رشو جان
ذہن پر لادے پھر رہی تھی۔بہاول پور میں نہ تو ان کے بطلان کی کوئی وجہ موجود تھی، نہ ان پر

ایمان لانے کی کوئی دلیل لاہور کیا پہنچی دل میں بغارے پڑ گئے۔ تیغا توڑ کر جیسے کسی نے علم کی ساری کوٹھری ہی مسمار کر دی۔'' (۸۹)

رشو بہاول پور سے شرم وحجاب، اطاعت شعاری، سادگی، فرمانبرداری اور تسلیم کی جو اقدار لے کر آئی تھی لاہور میں وہ کھوٹا سکہ ثابت ہو رہی تھیں۔ اس کے برعکس اسے یہاں خودنمائی، بے باکی، فخر و غرور اور روشن خیالی کی اقدار سے واسطہ پڑا۔ وہ اپنی اقدار کی کم مائیگی پر بدحواس تھی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی پرانی اقدار کو بھلا کر نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرے۔ چونکہ اس کا اپنی اقدار پر یقین بھی پختہ نہ تھا چنانچہ اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی پرانی اقدار ایک ایک کر کے دَم توڑتی گئیں اور ان کی جگہ نئی اقدار جنم لیتی رہیں۔

رشو کمزور اعصاب کی لڑکی تھی اور جس ماحول میں اس نے پرورش پائی وہاں بچپن ہی سے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے اور سر جھکا دینے کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ ایک تاثر پذیر شخصیت تھی اس لیے لاہور کی معاشرتی زندگی کے اثرات قبول کرتے ہوئے اسے زیادہ مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لاہور کے اثرات قبول کرتے ہوئے اس نے شعوری طور پر ذرا سی بھی مزاحمت اختیار نہ کی۔ وہ ذرا سا تذبذب کا شکار ہوئی لیکن اسے بھی اس کی جھجک کہا جا سکتا ہے، مزاحمتی رویہ نہیں۔

''جس روز پکنک تھی اس روز صبح سے رشیدہ کا دِل بجھنے لگا تھا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ خالہ فیروزہ سے اجازت طلب کرتی۔ اور نہ ہی اتنی سکت تھی کہ پکنک میں جانے سے انکار کر دیتی۔ اب بیٹھی سوچتی تھی کہ کالج جائے یا گھر بیٹھی رہے۔ اس گومگو کے عالم میں کبھی اس نے بالوں کی چوٹی بنائی اور کبھی چوٹی کھول کر جوڑا باندھا، لیکن ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتی تو دل بجھ سا جاتا۔ اپنے لمبے لمبے کان بے حد بدوضع نظر آتے۔ ان کانوں کا کوئی کیا کرتے؟ مہاتما گاندھی کے کانوں کی طرح، اَدھ کھلے کواڑ کی مانند چہرے سے پرے پرے کھڑے تک رہے ہیں۔ یہ بھی خیال جی کو کھائے جا رہا تھا کہ ادھر کالج کی ساتھنیں ایسا سنگھار کر کے آئیں گی جو بظاہر تو کاٹن کی قمیض اور پھولدار نائیلون جالی پر مشتمل ہوگا، لیکن تراش خراش کے اعتبار سے یہ لباس Dior کی تخلیق نظر آئے گا۔'' (۹۰)

رشیدہ میر ذہنی طور پر لاہور کی برتری کو تسلیم کر چکی تھی۔ اسے اپنی اقدار کی بوسیدگی اور کم مائیگی کا احساس بھی ستا رہا

تھا۔ بس ایک جھجک تھی جو نئی اقدار کو اپناتے ہوئے اس کے آڑے آ رہی تھی۔ بہاول پور میں ہر کام سے پہلے وہ ماں کی اجازت طلب کرتی تھی، ماں کی رضامندی کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہ اٹھاتی تھی۔

''وہ تو کھڑی سوچ رہی تھی کہ خالہ جان سے اجازت لیے بغیر پکنک پر جانا درست بھی ہے کہ نہیں؟ بہاول پور میں چاہے کنوکیشن ہو، چاہے سالانہ اجلاس، ہفتہ بھر پہلے امی کی خوشامد کرنا پڑتی تھی۔''(۹۱)

لیکن لاہور کی لڑکیاں خودمختار تھیں۔ وہ ماؤں سے اجازت طلب نہ کرتی تھیں بلکہ انہیں پہلے سے آگاہ کرنا بھی کوئی ایسا ضروری نہ تھا۔ رشو کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری جب لاہور کی خودمختاری اور آزادخیالی سے ٹکرائی تو وہ کچھ دیر شش و پنج کا شکار رہی لیکن پھر اُس نے فیصلہ کرلیا کہ لاہور میں لاہور کی قدروں کے ساتھ ہی رہا جاسکتا ہے۔

''بالوں میں کان چھپا کر رشو نے اپنا برقعہ اٹھایا اور چھوٹی سی زِپ لگی پلاسٹک کی تھیلی لے کر اس میں کچھ پیسے ڈالے، اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

ارے باجی! برقعہ پہن کر پکنک پر جائیں گی آپ؟......تنویر غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے رک گئی۔

میں تو کالج صرف اطلاع دینے جارہی ہوں۔

کیسی اطلاع باجی؟

میں پکنک پر نہیں جاسکتی۔

ہائے وہ کیوں باجی! نائٹ سوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر تنویر نے سوال کیا۔

میں رات کو خالہ جان سے اجازت نہیں لے سکی اس لیے۔

تنویر ہنسنے لگی۔

اس کے کٹے ہوئے بالوں میں لٹکے ہوئے رِبن، گلابی رنگ کا نائٹ سوٹ، پیروں میں پڑی ہوئی چکوالی چپلیں......سب اس کے موڈ میں شریک ہوگئیں۔

اللہ! خالہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے باجی! اگر بھول گئی تھیں تو شام کو بتا دیجیے گا انہیں، ہم تو اسی طرح کرتے ہیں۔

اچھا؟

اور کیا؟ اب کالج میں اتنی فنکشنز ہوتی ہیں، کبھی کبھی بھول بھی جاتا ہے ان سے پوچھنا، شام کو بتا دیتے ہیں انہیں، آپ ضرور جایئے باجی، کس کی فیرول ہے؟

پروفیسر ضیاء کی۔'' (۹۲)

بہاول پور کی فرمانبرداری اور تابعداری کو لاہور کی خودمختاری کے سامنے منہ کی کھانی پڑی۔ رشو جان ابھی اپنی پہلی شکستگی سے سنبھلنے نہ پائی تھیں کہ تنویر نے ایک اور وار کیا۔

''اللہ یہ برقعہ تو پہن کر نہ جایئے باجی جان۔ خدا قسم اس سے تو بہتر ہے کہ آپ چادر اوڑھ لیں، سفید ٹسر کی...... اس کا بھی بہت فیشن ہے آجکل۔ میں لاؤں اپنی چادر......

رشیدہ جو اسی جگہ رکی رہی تو یہ کچھ ٹسر کی چادر کے لیے نہ تھا۔ وہ تو کھڑی سوچ رہی تھی کہ خالہ جان سے اجازت لیے بغیر پکنک پر جانا درست بھی ہے کہ نہیں؟

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ تنویر چادر لے آئی۔

اس ٹسر کی چادر کا بہت رواج ہے لاہور میں باجی! جو خاندان ذرا پہلے برقعے کے زیادہ پابند تھے۔ انہوں نے برقعے اتارے تو یکدم منہ سر ننگے باہر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ یہ چادر اس لیے بڑی مفید رہی...... بڑا سہارا رہا خاندانی عورتوں کو اس کا۔

رشیدہ نے پوچھنا چاہا کہ یہ برقع اتارنے کی آخر وجہ کیا تھی، لیکن تنویر کچھ ایسی روانی میں تھی کہ سوال کی پچر پھنسانے کی مہلت نہ ملی۔

ویسے بھی باجی! جو لڑکیاں ٹسر کی چادر پہن کر آتی ہیں کالج میں، وہ اچھے گھرانوں کی سمجھی جاتی ہیں۔ خدا قسم اتاریئے یہ برقعہ۔ اولڈ فیشن چیز...... یا تو انساں پورا فیشن کرے یا چادر اوڑھے، بس۔'' (۹۳)

رشو کا برقعہ اتار کر چادر اوڑھنا گویا بپتسمہ لے کر بہاول پور کی لڑکی سے لاہوری لڑکی ہونا تھا۔ یہ رشو کے طرزِ فکر و احساس میں تبدیلی کی علامت ہے۔ اس کا یہ فعل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ تبدیلی کے عمل کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکی تھی۔

خالہ فیروزہ کا گھر لاہور کی جدید اقدار کا پروردہ تھا۔تنویر کی جدت پسندی، خالہ فیروزہ کی روشن خیالی اور انوری کی بے دھڑک طبیعت نے رشیدہ میر کی ذہنی دنیا میں کھلبلی مچادی۔

''میں اماں کو کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں کہ خالہ فیروزہ کا گھر روشن خیال گھر ہے، یہاں تنویر سائیکل پر اپنے کالج جاتی ہے۔اس کے بال کٹے ہوئے ہیں۔وہ......اور یہاں خالو کے دوست کئی انکل بلاتکلّف آتے ہیں اور پہروں رہتے ہیں۔توبہ! توبہ! اماں سمجھنے کی کوشش بھی تو نہ کریں گی کبھی۔'' (۹۴)

یونیورسٹی میں فیشن پرست اور آزاد خیال ڈمپل کی صحبت نے اسے اپنی اقدار پر نظرِ ثانی کی طرف مائل کیا۔

''کالج میں دو شخصیتوں سے رشو بُری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ایک تو ڈاکٹر اعجاز حسین اور دوسرے ڈمپل......ڈمپل سے گو اُس کی دوستی نہ ہو سکی تھی لیکن وہ ڈمپل کو ہمیشہ منہ کھول کر دیکھتی رہتی۔ڈمپل میں آرٹ پیپر جیسی چکنائی اور ہوائی اڈے جیسا رومان بھرا تھا۔رشو اندر ہی اندر ڈمپل کی انگلی سے رسّی کی طرح لپٹی جا رہی تھی۔'' (۹۵)

خالہ کے گھر، یونیورسٹی میں آزاد خیال لڑکیوں کی صحبت اور لاہور کے گلیمر نے رشو کی اقدار کو بُری طرح ٹھیس پہنچائی۔لاہور کی برتری کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کے طرزِ فکر نے جو رُخ اختیار کیا اس کے تناظر میں بہاول پور کی اقدار کی کم مائیگی کا خیال اس کے دل میں پختہ ہونے لگا۔وہ ڈائری میں لکھتی ہے:

''آج نومبر کی بائیس تاریخ ہے۔لاہور میں مجھے آئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔لیکن مجھے یوں احساس ہوتا ہے جیسے صدیوں سے یہاں ہوں۔میں یہاں سے کبھی باہر گئی ہی نہیں۔اماں کو خط لکھتی ہوں تو وہ ساری باتیں لکھنے پر دل مائل نہیں ہوتا جو یہاں ہوتی ہیں۔کچھ اس لیے نہیں کہ میں ان سے کچھ چھپا رہی ہوں۔فقط اس خیال سے کہ وہ جس ماحول میں رہتی ہیں وہاں ان باتوں کو سمجھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔اور اسی لیے وہ میری باتیں سمجھ نہ پائیں گی۔

اور تو اور خالہ کے گھر کا نقشہ اگر میں ان سے ہو بہو بیان کروں تو وہ کہیں گی، فوراً بہاول پور واپس چلی آؤ۔اور سچی بات یہ ہے کہ بہاول پور میں سب کچھ ہے لیکن وسعتِ نظر نہیں ہے۔

خدا قسم ذرّہ بھر وسعتِ نظر نہیں۔ پورے کنویں کے مینڈک، وہ بھلا کیا سمجھیں گے کہ لاہور درۂ خیبر اور دلّی کی درمیانی کڑی ہے اور درمیانی کڑی ہمیشہ زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔'' (۹۶)

رشو کی اقدار میں شکست وریخت کا عمل جب ایک بار شروع ہو گیا تو پھر وہ زیادہ دیر تک کشمکش کا شکار نہ رہ سکی۔ جلد ہی اس پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ بہاول پور کی اقدار لاہور کی جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ رشو جو پہلے ہی تشکیک اور تذبذب کا شکار تھی، لاہور آ کر وہ اپنی دوغلی اقدار سے بالکل ہی بدظن ہوگئی۔

''بہاول پور کی کبوتری جب پہلی بار لاہور آئی تھی تو فتح شیر روڈ پر...... جہاں خالہ فیروزہ جنسی لطیفے سناتی تھیں، تنویر بیلیٹز سے عشق کرتی تھی، ریاض روبوٹ بنانے سے لے کر کیفے ڈی کھانس پھونس میں مغلیہ لباس کے بیروں کو ڈبل شفٹ میں کام کرنے کے پلان بناتا تھا اور اُن سب کا سردار خالو جمال انٹی کرپشن میں بڑے معتبر عہدے پر تھے۔ یوں سمجھئے کہ کسی نے ہانڈی کے منہ پر کیلے کے پتے باندھ کر اِردگرد مٹی کا لیپ کر کے اسے اُپلوں کی آگ میں کشتہ بنانے کو چھوڑ دیا۔ ایک ایک کر کے ہر نظریے کو قلعی کروانا پڑی۔ ہر نظریے کے مالک نے جب ہانڈی کھولی تو دم پخت رہنے کی وجہ سے اس کا نظریہ سیاہ پڑ چکا تھا۔'' (۹۷)

رشو کے پرانے نظریے بوسیدہ ہو چکے تھے اور وہ نئے نظریوں کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف تھی۔ اقدار کے ردّ و قبول کا عمل غیر محسوس طریقے سے شروع ہو چکا تھا۔

''ہر لڑکی نے، چاہے وہ آدھی چمچ پیتی تھی چاہے دو چمچ، چائے میں چینی ڈالنے سے انکار کیا۔ ان کی دیکھا دیکھی رشیدہ نے بھی چائے میں چینی نہ ملائی۔'' (۹۸)

بہاول پور کی اقدار و روایات کی لکیر پاٹ کر کب اس نے لاہور کی جدید زندگی کے راستے پر قدم رکھا وہ خود بھی اس سے آگاہ نہ تھی۔

''دراصل ففتھ ایئر کی بات اور تھی۔ وہ میلہ گھومنی تھی۔ اپنی ہاٹ لگا کر نہ بیٹھی تھی۔ دیدے پھاڑے اِدھر اُدھر جھانکتی رہی۔ اب دن بدن ضمیر سست الوجود ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی ریگمال سی چیز دل کی کھردری سطح کو میوزیک فرش جیسا چکنا بنا رہی تھی، پہلے وہ لمبی سی چوٹی کرتی تھی، اب ڈھیلے ڈھالے بال لمبے کانوں کو چھپا کر جوڑے کی شکل میں بندھنے لگے۔ ہر روز کالج

سے واپسی پر قمیض میں فٹنگ تبدیل ہونے لگی......نامعلوم سی لپ اسٹک بھی کہیں سے آ گئی اور پلکوں کے سرے بھی برش سے اوپر کی طرف موڑے جانے لگے...... یہ ساری تبدیلیاں ظاہری تھیں۔ایک ایسی تبدیلی بھی تھی جو اندر ہی اندر سانپ کی کینچلی کی مانند اپنا وجود نئے سانچے میں بدل رہی تھی۔اس تبدیلی کا خود رشیدہ کو بھی علم نہ تھا۔اسے تو پتہ بھی نہ چلا کہ کب وہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ بازار جانے لگی۔کس دن اس نے انٹر کالج مباحثوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا اور کب سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے لگی۔ بالکل جس طرح چولہے پر چڑھی کیتلی کے اندر ذرّات کی تہ کھپڑ کی طرح جم جاتی ہے اسی طرح آہستہ آہستہ رشیدہ کی اَنا نے اپنے گرد جوازوں،تاویلوں،منطقوں کی فصیل تعمیر کر لی تھی۔

گھر سے پہلا قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے،جب ایک بار مہارانی سیتا باؤنڈری لائن الانگ گئیں تو سنگل دیپ کا سفر پلک جھپکتے میں گزر گیا۔‘‘ (۹۹)

لاہور آکر رشو کی نئی زندگی کا ایک اہم واقعہ ظفر کا اظہارِ محبت کرنا تھا۔ظفر کے محبت نامے نے رشو کے دل میں محبت کی گدگدی ضرور پیدا کی لیکن وہ اس کا مثبت جواب نہ دے سکی۔اس کی ایک وجہ ظفر کا صوفیانہ مزاج تھا۔اس کی خودسوز محبت رشو کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔دوسرا رشو اس وقت ڈمپل کی چکا چوند شخصیت کے زیرِ اثر تھی۔وہ ذہنی تبدیلی کے جس دور سے گزر رہی تھی وہاں ظاہر پرستی کا غلبہ تھا۔وہ ظفر کی محبت کی گہرائی اور سچائی کو پہچان ہی نہ سکی۔ڈمپل کی صحبت میں رشو مکمل طور پر لاہور کی لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔جب وہ پہلی دفعہ ظفر کے والد سے ملتی ہے تو باپ بیٹے کا موازنہ اس طرح کرتی ہے:

’’اف توبہ! کیا پرسنلٹی ہے......کیا شاہِ بلوط جیسا قد ہے۔باپ کے سامنے تو بیٹا بالکل ہی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند......‘‘ (۱۰۰)

باپ کی امارت اور شاندار شخصیت کے سامنے ظفر کا بے حد معمولی نظر آنا اس کے ذہنی رویوں کی غمازی کرتا ہے۔ اسے باپ کی امارت تو مرعوب کر رہی تھی لیکن وہ محبت میں ظفر کی عاجزی سے متاثر نہ ہو سکی۔محبت کی جو ذرا سی چنگاری کہیں دل میں موجود تھی،خالہ فیروزہ نے اسے بھی بجھا دیا۔

’’یہ...... یہ خط ہیں......خدا قسم میں نے کسی خط کا جواب نہیں دیا......اور ان ہی خطوں کی وجہ

سے مجھے گھر سے نکالا گیا ہے...... بے قصور...... بلا وجہ......لولی پاپ چوس لینے پر جیسے اکیلا ٹنڈ منڈ تنکا بیچ میں سے نکل آتا ہے، بالکل اسی طرح خالہ کے غصے نے وہ ساری محبت چوس لی تھی جوان خطوں نے قطرہ قطرہ ٹپکائی تھی......اور اب فقط اکیلے تنکے کی طرح آوارگی کا وہ الزام بچا تھا جو خالہ نے اس پر لگایا تھا۔''(۱۰۱)

خالہ فیروزہ کے گھر سے نکل کر رشو کو زیادہ محتاط ہو جانا چاہیے تھا، لیکن ہوا یہ کہ ڈمپل کی صحبت میں وہ بالکل ہی آزاد خیال ہو گئی۔

''رشیدہ نے جو وقفہ ڈمپل کے گھر گزارا تو گویا ڈمپل اسے اکسیر بناتی رہی......اتنے تھوڑے عرصے میں اپنی مکمل جون بدل لینا نہ تو رشیدہ کے اختیارات کی بات تھی نہ ڈمپل کے استعداد کی...... یہ تو سیدھی سادی کیمیا گری تھی اور اس کا نسخہ لاہور میں ڈمپل سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا۔''(۱۰۲)

ڈمپل لاہور کی ماڈرن لڑکیوں کی نمائندہ ہے اور رشو کا اس سے مرعوب ہونا دراصل لاہور کی فیشن پرستی، جدّت پسندی، روشن خیالی اور آزادہ روی کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔

''ڈمپل اور رشو کا تعلقِ خاطر ان سب سے مختلف تھا کچھ تو رشو، ڈمپل کی نفاستِ طبع اور لباس کی عمدگی سے مرعوب تھی، کچھ احسانمندی اور تشکر کا عنصر تھا جو رشو اُن کے گھر رہ کر محسوس کرتی تھی۔ جب تک ماڈرن ہوسٹل میں جگہ نہ ملتی اسے ان کے گھر نظریں جھکا کر جی ہاں جی ہاں کرتے گزارنا تھی۔ کچھ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے رشو کو بیک وقت حیران، متزلزل اور مرعوب کر رکھا تھا۔ ڈمپل میں ایک شانِ قلندری تھی۔ اس کا ہر فیصلہ ایک غنی کا فیصلہ تھا، کالج کے لڑکے اس کی بے داغ انگریزی اور اعلیٰ لباس سے ڈرتے تھے۔''(۱۰۳)

رشو کو ڈمپل کا اصل روپ پہچاننے میں زیادہ دیر تو نہ لگی لیکن اس کے باوجود وہ خود کو ڈمپل کے اثرات سے نہ نکال سکی۔

''اس لڑکی کا خوبصورت لباس دیکھ کر کبھی کبھی ابا کو خیال آتا کہ اتنی ساری قیمتی ساڑھیاں، ایسے خوبصورت کوٹ، یہ فیشنی جوتے میری آمدنی سے تو نہیں بن سکتے۔ لیکن ابا میں آنکھیں

بند کرنے کی وہ صلاحیت تھی جو کبوتر میں بلّی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔'' (۱۰۴)

''کوٹھی کے اوپر والے حصے میں کرایہ دار رہتے تھے اور انہی کے کرائے پر مالک مکان کی بیشتر گزر بسر ہوتی تھی۔ ابھی رشو کو اس گھر میں آئے آٹھ دس دن ہوئے تھے کہ ڈمپل نے ایک دن رشو سے کہا۔

میرے ساتھ اوپر چلتی ہو۔

اوپر؟

اوپر تو ایسے پوچھتی ہو جیسے میں ٹرائیڈنٹ کے سفر کے لیے کہہ رہی ہوں۔

لیکن اوپر کیا کام ہے تجھے؟

کوئی کام نہیں صرف میل ملاقات......سوشل لائف......

نہیں بھئی تم جاؤ......

بابا بے ضرر سے لوگ ہیں۔ بیوی دمے کی مریض ہے، کھانستی رہتی ہے، کبھی ہومیو پیتھک علاج کرتی ہے کبھی کوریٹوزون کھاتی ہے۔ چلو تو سہی......

کیا ایسا ہی ضروری ہے؟

گو رشو نہیں جانتی تھی کہ اوپر والے کیسے ہیں اور کیوں اس کا دل دھڑک رہا ہے؟ لیکن کوئی چیز اُسے بتا رہی تھی کہ معاملہ اتنا صاف نہیں جتنا نظر آ رہا ہے۔'' (۱۰۵)

حالات کے دباؤ اور ڈمپل کی شخصیت کے سحر سے مرعوب ہو کر رشو نے وہی راستہ اختیار کر لیا جو ڈمپل کا تھا۔ دو ایک بار ضمیر نے اسے ملامت کی اور اسے اماں کے خطوں کی نصیحتیں بھی یاد آئیں، لیکن حالات کے دھارے کے سامنے سینہ سپر ہو جانا اس کے بس سے باہر تھا۔

''ڈمپل گہری نیند سو رہی تھی اور رشو پر گہری ندامت طاری تھی۔ اب ملک صاحب پر بھی غصہ باقی نہ رہا تھا۔ ہائے بھلا انہوں نے کیا کیا ہے؟ ہمدردی کی ہے مجھے غریب الوطن جان کر اور میں خوامخواہ جل بھن رہی ہوں ان پر...... تکیے تلے اماں کا تازہ ترین خط بھی اسے بھول چکا تھا۔ صرف ڈمپل کا خوف باقی تھا۔ اگر کہیں ڈمپل ناراض ہو گئی تو میں اسے کیسے مناؤں گی؟

بڑی دیر ڈمپل کے متعلق سوچتی رہی۔ پھر اُٹھی، بتی جلائی، ڈمپل کا لحاف اس کے کٹے ہوئے بالوں تک کیا اور اپنے پلنگ پر آ بیٹھی۔ شام کو وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی۔ کتنی مجوب نظروں نے کاسۂ التفات اس کی طرف بڑھایا تھا۔

اس پر ساڑھی واقعی بہت سجتی ہے۔ جسم کا ایک ایک خم ابھر آتا ہے۔ شام کا میک اپ ابھی تک چہرے پر باقی تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں اس کا جسم بہت سڈول نظر آ رہا تھا۔ رشو نے اپنے بال کھولے اور سٹول پر بیٹھ کر انہیں کنگھی کرنے لگی۔ آج اسے اپنے کان لمبے نہیں لگ رہے تھے۔ بالوں کے ریشمی کوڑیالے کندھوں پر ساٹن کے بلاؤز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر لپ اسٹک کی نامعلوم سی لکیر باقی تھی۔ آنکھوں میں پارے کی سی چمک تھی۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ وہ ڈمپل سے زیادہ خوبصورت ہے۔'' (۱۰۶)

رشو نے ہولے ہولے ڈمپل کا سارا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا۔

''ڈمپل کی صحبت میں بالکل ڈمپل جیسی ہوگئی ہے۔ وہی لباس وہی بول چال......ظ نے کہا۔ خدا قسم دیکھ کر شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہی لڑکی ہے۔ طیبہ بولی۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سکستھ ایئر کا اثر ہے سارا...... ڈمپل کا بھی اثر ہے وہ تو بارود ہے پورا......'' (۱۰۷)

''ادھر رشو قوسِ قزح کی طرح رنگین ہو چکی تھی...... کسی بڑی امریکن کار کی پچھلی بتیوں جیسی عینکیں چہرے پر لگائے ٹیڈی پیسے جتنی باریک ہیل والی جوتے پہنے چست قمیض میں جب رشو چینی عورتوں کی طرح چلتی آتی تو ظفر کا دل یکدم بند ہو جاتا۔'' (۱۰۸)

بہاول پور کی سیدھی سادی رشو باجی اگر لاہور کی ماڈرن رشو جان میں بدل چکی تھی تو اس میں سارا قصور اس کا نہ تھا۔

''دراصل سارا فتور لہو کا ہے...... انسانی لہو کا...... شہروں کے لہو کا...... تہذیبوں کے لہو کا۔'' (۱۰۹)

لاہور شہر کے لہو نے اس کے مزاج میں شامل ہو کر اسے نیا رنگ دے دیا تھا۔ اب اس کا رنگ لاہور کا رنگ تھا۔ رشو

باجی قصور وار اس وقت ہوتی اگر بہاول پور میں رہ کر وہ یہ سب کچھ کرتی۔

ظفر کے باپ کے ساتھ رشو کے تعلقات میں اس کی نیت کا عمل دخل نہ تھا۔ وہ تو بس حالات کے دھارے کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ اس نے اس بہاؤ کے خلاف کبھی ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی رشو نے مفاہمت کے جس رویے کو اپنایا تھا، بعد کے تمام حالات اسی کے پیدا کردہ تھے۔

لاہور آ کر رشو پر مادہ پرستی غالب آ چکی تھی۔ وہ لاہور کی شاندار زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی اور اس کے لیے اسے دولت درکار تھی۔ جب امیرانہ زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ کا تجربہ حاصل کرنے کا اسے موقع ملا تو اس نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا دیے۔ نتائج کی طرف سے بے پرواہ ہو کر وہ اس زندگی کے حصول کی خواہش میں ہر قدر کو پامال کرتی چلی گئی۔

''جس وقت رشو جان ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھول کر بنک کی سیڑھیاں اتر رہی تھی، اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل جائنٹ اکاؤنٹ کیا ہوتا ہے؟ وہ تو اتنا بھی نہ جانتی تھی کہ اس جائنٹ اکاؤنٹ میں ملک صاحب نے کتنی رقم جمع کرائی ہے؟ اسے تو بس اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اس کے پرس میں پچیس چیکوں والی ایک چیک بک ہے۔ اب تک اس نے منی آرڈروں پر دستخط کیے تھے۔ آج بنک کے منیجر نے اس سے جا بجا دستخط کروائے تھے۔ ان دستخطوں کو کرتے وقت اس کے جی میں اَنجانی سی خوشی تھی...... بنک کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ملک صاحب نے پہلی بار کہا، میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار جمع کروا دیا ہے۔ پانچ ہزار؟

اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔''(۱۱۰)

''ملک صاحب کے ساتھ جائنٹ اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد رشو کی اَنا بہت اونچی ہو چکی تھی......ایک معزز شہری کی طرح وہ اپنی ساکھ کے لیے یکدم بہت متفکر ہو گئی تھی......

آپ کیا سوچ رہی ہیں رشو؟

کچھ نہیں جی......

پھر بھی؟

یہی سوچ رہی تھی جی کہ......کہ......آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''(۱۱۱)

امارت کی زندگی کا مزہ رشو نے پہلے کبھی نہ چکھا تھا۔ بنک میں اکاؤنٹ کھلنے کے بعد اس کی زندگی میں بہت سی نئی اقدار خود بخود پیدا ہو گئیں۔ رشو کو یقین ہو گیا کہ دولت ہی سب کچھ ہے۔ اسی کے ساتھ عزت، شاندار زندگی اور اس کے آرام و آسائش ہیں۔ رشو کا طرزِ فکر، طرزِ احساس اور طرزِ عمل سب کچھ بدل گیا۔

''پہلے تو رشو جان کو ان لوگوں کی خدمت گزاریوں پر تعجب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ان مراعات کی عادی ہو گئی اور رفتہ رفتہ وہ ہر جگہ اس بات کی متوقع رہنے لگی کہ لوگ اٹھ کر اسے پانی پلائیں، اس کے لیے کرسی لائیں، اس کا گرا ہوا رومال پکڑائیں، بھاگ کر اس کے لیے ٹیکسی لائیں...... خدمت کرنے سے زیادہ خدمت کروانے میں مزہ آنے لگا...... زندگی میں ایک بانکپن پیدا ہو گیا۔ خود اعتمادی کا جذبہ، خودستائی کی خواہش، خود پسندی کی عادت رفتہ رفتہ جڑ پکڑنے لگی......''(۱۱۲)

دولت مندی کی پُر آسائش زندگی کو مستقل طور پر حاصل کرنے کے لیے اسے جو قیمت بھی چکانی پڑی اس پر اُس نے ذرا بھی تامّل نہ کیا۔

''ملک صاحب کے ساتھ رشو کا نکاح ایک چھوٹی سی تقریب تھی...... رشو کی طرف سے ڈمپل کے ابا جی ولی مقرر ہوئے۔ ملک صاحب نے پچاس ہزار روپیہ کا حق مہر اُسی وقت ادا کر کے نکاح پڑھوایا...... بالکل بندر بندریا کا سا ننگا بوچا نکاح...... رشو کے ہاتھوں میں ڈمپل نے کیوٹکس لگائی۔ اسے زرق برق سرخ جوڑا پہنایا...... اور اسی میسن روڈ کے ایک کمرے میں دلہن کو دلہا کے سپرد کر دیا گیا۔''(۱۱۳)

رشو کی نئی زندگی کا یہ نقطۂ عروج تھا۔ لاہور آ کر اُس نے اپنے آپ کو جس قالب میں ڈھالنے کا عمل شروع کیا تھا، یہ اس کی انتہا تھی۔ اب رشو بہاول پور کی سیدھی سادی لڑکی نہ تھی، بلکہ لاہور کی فیشن ایبل مسز رشیدہ بختیار تھی۔

لاہور کے گلیمر سے سحر زدہ ہو کر، آنکھیں بند کیے رشو جس رستے پر نکل کھڑی ہوئی تھی، وہ بے جوڑ شادی پر ختم ہوا اور شادی کی پہلی ہی رات وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اب وہ بہت کچھ کھو چکی تھی۔

''کہو''

''کیا کہوں؟'' رشو نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔

''رات کیسی گزری؟''

''رات''

یک دم رشو کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ پہلی بار کالج گئی تھی، اس روز پروفیسر اعجاز حسین ایڈیپس کومپلیکس پر لیکچر دے رہے تھے......انہوں نے کلاس میں پرانے عہدنامے کا ایک اقتباس پڑھا تھا کہ

لوط جب ضغر میں داخل ہوا تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمودہ پر آگ برسائی، اور لوط ضغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اسی کے ساتھ تھیں، کیونکہ اسے ضغر میں بستے ڈر لگا۔ اور وہ اور اس کی بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سی کہا، ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تا کہ اپنے باپ سے اپنی نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔''(۱۱۴)

''کیوں پھر کیسی گزری رات؟'' ڈمپل نے اس کے لیے توس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

رشو نے نگاہیں اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

''کیسی رات؟''

''یہی پچھلی......شادی کی رات......''

وہ ڈمپل کو کیا بتاتی کہ اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی......

ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر اُس نے کہا ''بہت اچھی......جیسی پہلی رات ہوا کرتی ہے، ویسی ہی اور کیسی......؟''

لیکن یہ جملہ بولتے ہی جیسے اس کے نیچے لگا فوم ربڑ کا گدا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور تکیے کے پروں میں خود بخود پھڑ پھڑاہٹ پیدا ہوگئی۔ قفس میں بند طوطے کی پھڑ پھڑاہٹ......بار بار اسے وہ پہلا دن......کالج کا پہلا دن یاد آنے لگا اور ریکارڈ کی طرح ایک ہی گرو میں پھنسی

ہوئی سوئی پکارنے لگی......

''پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی......؟''

رشو نے لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مفاہمت کے جس رویے کو اپنایا تھا باقی تمام حالات اسی کی پیداوار تھے۔ رشو کو کالج کے پہلے دن اپنی اقدار کی بوسیدگی کا جو ادراک حاصل ہوا وہ اسے قدم قدم پر یہ احساس دلاتا رہا کہ لاہور میں باعزت طریقے سے صرف لاہور کی اقدار کے ساتھ رہا جا سکتا ہے۔ وہ اتنی مضبوط نہیں تھی کہ بہاول پور کی اقدار کے ساتھ لاہور میں رہ سکتی۔ چنانچہ کسی مزاحمتی رویے کا اظہار کیے بغیر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے بہاول پور کی اقدار کو خیر باد کہہ کر لاہور کی جدید شہری اقدار کو اپنا لیا۔ اس کے چال ڈھال، رنگ روپ اور سوچ سب پر لاہور شہر کی چھاپ لگ گئی۔ لیکن قباحت یہ تھی کہ اس سب کے باوجود وہ اصل لاہور کی رہنے والی نہ تھی۔ اس کی سوچ، اس کا ذہن، اس کی روح لاہور کی اقدار میں پروان نہ چڑھی تھی۔ اس نے تو محض بہروپیے کی طرح یہ روپ اختیار کر لیا تھا۔ اصل اور نقل میں جو فرق ہوتا ہے وہی رشو میں تھا۔ بہروپ بھرنے والی نے لاہور کی لڑکی کا روپ بھرا تو غلو کا شکار ہو گئی۔ اسی لیے بانو قدسیہ کو کہنا پڑا:

''یہ باہر کی لڑکیوں کو پَر بھی زیادہ لگ جاتے ہیں لاہور والیوں کی نسبت۔''(۱۱۵)

رشو نے جب ایک بار اپنی اقدار کی لگائی ہوئی حدود کو توڑ دیا تو پھر کوئی دوسری رکاوٹ اس کے سامنے نہیں آئی۔ اس نے لاہور میں رہ کر صرف اقدار کو توڑنا سیکھا، وہ اپنی برسوں پرانی اقدار کے عوض کون سی اقدار کو اپنا رہی ہے۔ اس نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ بہاول پور سے رشو نے جو اقدار حاصل کی تھیں اُن کے پیچھے صدیوں کا تجربہ موجود تھا۔ کئی نسلوں نے ان اقدار کی آبیاری کی تھی اور انہی اقدار کی پاسداری کا صلہ تھا کہ رشو کا خاندان بُرے بھلے وقتوں میں بھی عزت کی زندگی گزار رہا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اقدار و روایات کے سائے تلے اس کے خاندان کو معاشرتی زندگی کا تحفظ حاصل تھا۔ رشو کی ماں بیوگی کی زندگی بڑے صبر اور عزت و وقار کے ساتھ بسر کر رہی تھی۔ اس نے اگر پورے خاندان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھا تو اس وجہ سے کہ برسوں پرانے نظامِ اقدار میں ان حالات سے نپٹنے کے اخلاقی ضابطے موجود تھے جنھوں نے اس کے کردار کو استحکام اور توازن عطا کر رکھا تھا اور خاندانی زندگی کسی انتشار کا شکار ہوئے بغیر معمول کی ڈگر پر چل رہی تھی۔

رشو نے لاہور میں آ کر پرانے نظامِ اقدار کو توڑ پھوڑ دیا اور نئی اقدار کو اپنانے کے عمل میں کسی معیار کو مدّ نظر نہیں رکھا۔ اس کی سوچ کا انداز سراسر سطحی ہو چکا تھا۔ جب پرانی اقدار کی معنی خیزی اس کی زندگی سے ختم ہو گئی تو نئی اقدار کی پرکھ کا

مرحلہ بھی اس کے لیے بے معنی ہو گیا۔

نئی اقدار کی روشنی میں رشو نے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے منفی اثرات جلد ہی اس کی شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔عیش وعشرت اور آسائشوں سے پُر نئی زندگی کچھ ہی عرصے کے بعد اپنا نیا پن کھو کر بے معنویت کا شکار ہو گئی۔

''گھر کی ہر چیز اپنا نیا پن کھو چکی تھی......رشوان چیزوں کے لیے پیدا ہوئی تھی......اور وہ دل سے سمجھتی تھی کہ وہ ایسے ہی گھر ایسی ہی آسائشوں کے قابل تھی۔ پہلے تو اسے اپنی زندگی نے بے حد متاثر کیا۔ وہ کچھ روز اپنی زندگی پر نازاں بھی رہی......مگر اب یہی قد جو قائداعظم کی طرح مضبوط اور پُر اعتماد تھا، اب رنجیت سنگھ والئی پنجاب کی طرح اندر سے کانا نکل آیا تھا...... پہلے کچھ دیر تو رشو بڑے جوش سے روتی رہی پھر پلنگ کے پاس آ کر ملک صاحب کو دیکھنے لگی......ان کی خواب آور گولیوں کی بوجھل نیند سے رشو کو اللہ واسطے کا بیر ہو گیا۔'' (۱۱۶)

پُر آسائش زندگی کی چمک دمک کا کھوکھلا پن جلد ہی اس پر آشکار ہو گیا۔

''آسائش میں بس ایک ہی قباحت ہے کہ پہلے انسان اس کا متمنی ہوتا ہے پھر اُس کا عادی ہو جاتا ہے اور بالآخر اسے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔'' (۱۱۷)

پُر آسائش زندگی کا خواب پورا ہو جانے کے بعد جب زندگی اصل روپ میں سامنے آئی تو اس میں بہت خلا پیدا ہو چکا تھا۔اب رشو کو وہ سب کچھ یاد آنے لگا جو اس شادی کی وجہ سے اس سے چھن چکا تھا۔ بہاول پور کی سادہ اور پُر خلوص زندگی، دُکھی ماں، اپنی حویلی کا سُکھ، ظفر کی محبت، کالج کی زندگی اور اپنا سیدھا سادا معصوم انداز۔

''رات کے وقت جب ٹب میں گرم پانی بھر کر باتھ سالٹ ڈال کر رشو چھوٹے سے برش سے اپنی پیٹھ صاف کرتی تو یکدم اسے اماں یاد آ جاتیں جو بورے کی انگیٹھی پر تیل میں آلو کی بھجیا پکایا کرتی تھیں۔'' (۱۱۸)

''ظفر کتنا خوبصورت تھا!

اس کے خطوں میں کیسی حیا تھی، کیسی سادگی تھی!

ظفر اسے کلاس میں کیسے دیکھتا تھا!

ظفر نے اس کی تصویریں کھینچی تھیں شالامار میں!

یکدم اس کا دل چاہا کہ وہ واپس جائے اور ایک نظر ظفر کو دیکھے......
دبے پاؤں اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا پرانا پرس نکالا اور اپنی کا پیاں اکٹھی کرنے لگی......
ہولے ہولے اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے...... ایسے آنسو جو آج تک اس کی آنکھوں میں نہ آئے تھے...... ایسے آنسو جو موت سے ہم کنار اور محبت سے بھیگے ہوئے تھے۔''(۱۱۹)

رشو نے نئی زندگی کے جن راستوں کا انتخاب کیا، اس کا جواز سماجی زندگی کے اخلاقی ضابطوں اور روایتی اقدار میں موجود نہ تھا۔ اس نے معاشرتی قاعدوں کو توڑ کر ملک بختیار سے شادی کی تھی۔ اسی لیے نہ تو ملک بختیار اسے خاندان میں باعزت مقام دلا سکا اور نہ ہی وہ اپنی ماں کو یہ حقیقت بتانے کی جرأت کر سکی۔ قانون اور شریعت کی نظروں میں جائز ہونے کے باوجود معاشرتی قواعد وضوابط اس کی اجازت نہیں دیتے تھے، اسی لیے اسے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ سماجی سطح پر رَد کیے جانے کے احساس نے رشو کو عدم تحفظ کا شکار کر دیا۔ وہ معاشرتی تنہائی کے کرب سے دوچار ہو کر نفسیاتی اُلجھنوں اور ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی۔

''ہائے اللہ آپ تھے میں سمجھی تھی کنکھجورہ ہے کوئی......
لجاجت سے ملک صاحب بولے......
نہیں میں ہی تھا......
تو پھر سو جائیے اب۔
نیند نہیں آتی رشو!
کوشش کیجئے......
بہت کوشش کی ہے۔ لجاجت سے ملک صاحب نے نظریں جھکا کر کہا۔
آپ فکر کرتے ہیں......
کیسا فکر......
اپنے گھر والوں کا خوف ہے آپ کو اور کیسا فکر......
گھبرا کر ملک صاحب نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

مجھے بھی تو بہاول پور واپس جانا ہے۔ مجھے بھی تو اماں کو کچھ جواب دینا ہوگا۔
تم فکر نہ کرو...... میں ساتھ چلوں گا تمہارے...... ہم...... اماں کے پاؤں پڑ جائیں گے۔
ملک صاحب نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو رشو نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر کہا......
اچھا اب سو جایئے۔
پتہ نہیں کیا بات ہے نیند نہیں آتی۔
تو کوئی سلیپنگ پلز کھا کر سو جایئے۔
ملک صاحب خاموشی سے اٹھے اور خواب آور گولیاں کھا کر چپ چاپ لیٹ گئے...... وہ نیچے ڈرائنگ روم میں اتر گئی اور صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔'' (۱۲۰)

رشو اور ملک بختیار دونوں ہی اعصابی دباؤ اور ذہنی انتشار کا شکار ہو کر ادویات استعمال کرنے لگے۔ غلط فیصلوں کے پچھتاوے اسے ہر وقت گھیرے رہتے، ملک صاحب کے خلاف رشو کے دل میں نفرت پیدا ہو کر پرورش پانے لگی۔

''میسن روڈ کی بات اور تھی۔ وہاں ڈمپل تھی، اس کے ابا جی تھے، ڈمپل کی چھوٹی بہنیں تھیں، ایک گھریلو ماحول تھا...... یہاں ان لوگوں سے کٹ کر آسائش کی گود میں پہنچ کر اُس کا محبوب مشغلہ ملک صاحب کو دَبکانا رہ گیا تھا۔ وہ ہنٹر پھڑکاتی اور شیر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ وہ چمڑے کا سونٹا سر پر گھماتی اور ہاتھی ناچنے لگتا...... وہ شوں شوں کرتی اور کتا دونوں ہاتھ اٹھا کر ہڈی مانگنے لگتا...... اتنی سی بات پر رشو یوں بلبلا کر روئی کہ ملک صاحب پریشان ہو گئے۔ لیکن جب انہوں نے رشو کو چپ کرانا چاہا تو وہ بپھر کر بولی۔
''مجھے ہاتھ نہ لگایئے خدا کے لیے...... آپ کے ہاتھ تو کسی مہوس کے ہاتھ ہیں...... پرے رکھیے انہیں...... کسی کا خیال نہیں، کسی پر ترس نہیں...... بس اپنا ہی خیال ہے۔''
ملک صاحب کا دِل کٹ گیا۔ لیکن وہ زندگی میں اتنا کچھ برداشت کر چکے تھے کہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹ گئے۔ رشو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر روتی رہی۔ دو چار بار وہ کھانسے۔ ایک آدھ بار انہوں نے پلٹ کر بھی دیکھا لیکن پھر چار وٹامن کی گولیاں اور دو سلیپنگ پلز کھا کر وہ خاموشی سے سو رہے۔

پہلے کچھ دیر تو رشو بڑے جوش سے روتی رہی پھر پلنگ کے پاس آ کر ملک صاحب کو دیکھنے لگی...... ان کی خواب آور گولیوں کی بوجھل نیند سے رشو کو اللہ واسطے کا بیر ہو گیا۔ یہی قد جو قائداعظم کی طرح مضبوط اور پُر اعتماد تھا، اب رنجیت سنگھ والئی پنجاب کی طرح اندر سے کانا نکل آیا تھا۔'' (۱۲۱)

جیسے جیسے رشو کے دل میں ملک صاحب کے لیے نفرت بڑھتی گئی، اس کی ذہنی حالت بھی بگڑتی چلی گئی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا، ڈمپل سے ملنا جلنا ترک ہو گیا۔ وہ معاشرے سے کٹ کر تنہائی پسند ہو گئی۔ اکیلے بیٹھ کر خود سے باتیں کرنا اب اُس کا مشغلہ رہ گیا تھا۔ اس نے خیالی دنیا میں پناہ لینا چاہی لیکن یہاں بھی اس کے لیے سکون نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا سے اس کا رابطہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ schizophrenia کی مریضہ بن گئی۔ وہموں کی دنیا اُسے ڈرانے لگی۔

''پہلے ملک صاحب اسے چپ کرانے پر آمادہ تھے تو رشو نے ان کی ہمدردی کو ٹھکرا دیا، اب وہ سو گئے تو انہیں پتھر دِل سمجھ کر وہ اور زور سے رونے لگی...... پچھتاوے کی آگ سے بالآخر اُمید کا سمندر پیدا ہوا۔ یہ سمندر آگ چاٹتا تھا۔ آگ کھاتا تھا۔ آگ میں جھلسی ہوئی ہوا میں سانس لیتا تھا۔ وہ لمبے دیوان پر شنیل کا تکیہ ڈالے اوندھے منہ لیٹی تھی۔ ہولے ہولے ماضی لوٹ رہا تھا۔ دَبے پاؤں سات سمندر پار سے آنے والا دُلہا دروازے پر اتنی مدھم دستک دے رہا تھا جیسے پتنگا کمرے میں آنے کے لیے پَر پھڑ پھڑا رہا ہو......'' (۱۲۲)

پھر یکدم رشو کو یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کا واحد سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ تصور میں وہ ظفر کے قدموں میں قالین پر بیٹھ کر جلدی جلدی بولنے لگتی، ''میں...... میں اپنی غلطی پر پشیمان ہوں...... میں اپنی...... میں اگر تم سے معافی مانگوں تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہو گا...... میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں میرے لیے کوئی امید نہیں پھر بھی...... میں تم سے معافی کی طلب گار ہوں۔''

''جو باب بند ہو چکا ہے اسے مت کھولیے۔''

رشو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے کبابوں کی انگیٹھی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ظفر نے جلدی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کر لیا۔ سارے کمرے میں سگریٹوں کا دھواں

بھرا تھا۔

''خدا حافظ رشو!''

رشو دونوں بانہیں ڈال کر ظفر کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

''خدا حافظ''

دروازہ کھلا اور رات کی تاریکی اسے چاٹ گئی۔ کچھ لمحے رشو نے اس آہٹ کے سہارے جینا چاہا جو اس کے دل سے آ رہی تھی...... وہ اپنے تصور میں اس قدر اُلجھ گئی تھی کہ اسے لگ رہا تھا کہ ظفر ابھی یہاں تھا...... ابھی وہ اس سے بازو چھڑا کر باہر نکلا ہے...... سارے ڈرائنگ روم میں سگریٹوں کا دھواں اور ظفر تھا۔ (۱۲۳)

رشو مکمل طور پر اپنے حواس کھو بیٹھی اور اسی ہذیانی حالت میں اس نے ملک صاحب کو قتل کر دیا۔

''خیالی پورن جیتے جاگتے ظفر سے بھی زیادہ سنگدل تھا۔ پھر وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ ملک صاحب سلیپنگ پلز کی نیند سو رہے تھے...... رشو نے ملک صاحب کے گریباں میں ہاتھ ڈالا۔

''اٹھو......!......اٹھو! سنو...... مجھے لگتا ہے کہ نیچے دروازے پر کوئی ہے۔ کوئی دستک دے رہا ہے۔''

شک شوں کی آواز بند ہوگئی۔

اٹھو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔'' (۱۲۴)

رشو کی کہانی کا منطقی انجام یہ نکلا:

''مبیّنہ اطلاع کے مطابق ملک بختیار نے تقریباً ایک ماہ پیشتر بہاول پور کی طالبہ سے خفیہ طور پر شادی کی تھی اور اپنے گھر والوں سے چوری دونوں میاں بیوی اس کوٹھی میں بڑی پُراسرار زندگی بسر کر رہے تھے...... کل صبح جب ان کا خانساماں ناشتے کی ٹرالی لے کر اندر گیا تو ملک صاحب خون میں لت پت اپنے بستر پر مردہ پڑے تھے اور اُن کے پہلو میں ان کی نوجوان بیوی نیم برہنہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی...... ان کی بیوی مسز رشیدہ ملک کے کہنے پر ملازم نے

پولیس چوکی میں اس وقوعہ کی اطلاع کی اور مسز رشیدہ ملک اس وقت تک اپنے مردہ خاوند کے ساتھ بستر پر لیٹی رہیں جب تک پولیس جائے واردات پر پہنچ نہیں گئی۔'' (۱۲۵)

رشو نے لاہور آ کر جس طرح اپنی اقدار کو خیر باد کہا اور اس کے ذہنی رویوں، طرزِ احساس اور طرزِ فکر نے تبدیلی کی جو سمت اختیار کی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس خیال میں الجھتی چلی گئی کہ اس کا طرزِ عمل درست نہیں تھا۔ پچھتاوے نے اسے ذہنی مریض بنا دیا۔ عدم تحفظ کے احساس نے اسے تنہائی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار بنا دیا۔ ان سب کا منطقی نتیجہ مکمل پاگل پن اور تباہی کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا تھا۔

بانو قدسیہ کا نظریۂ اِقدار

بانو قدسیہ ناول میں دو بنیادی کرداروں کے ذریعے انسانی کردار پر اِقدار کی پختگی اور شکست و ریخت کے اثرات کے راز کو آشکار کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک کردار کی عظمت ایمان کی مضبوطی، ارادے کی پختگی اور حوصلے کی بلندی میں پوشیدہ ہے۔ انسان کا ایمان اگر متزلزل ہو جائے تو اس کی فکر تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے ارادے کمزور پڑنے لگتے ہیں۔ اس میں ہمت کی کمی اور خوف کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

ظفر کے کردار کے حوالے سے بانو قدسیہ نے کردار کی عظمت کے اسی نظریے کو پیش کیا ہے۔ اس کا اپنی سچائی یعنی محبت پر ایمان غیر متزلزل ہے۔ اس کی پختہ اقدار کسی خوف اور دباؤ کو قبول کیے بغیر اس کے ارادوں کو استحکام اور حوصلوں کو بلندی عطا کرتی رہیں۔ اپنی اقدار پر اس کا ایمان ہی ثابت قدمی اور استقلال کا باعث بنتا رہا۔ اقدار کی پختگی کی بدولت وہ اپنی ذات کی سالمیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

بانو قدسیہ نے ایک مستحکم و متوازن شخصیت کا نمونہ ہمارے سامنے پیش کر کے یہ نظریہ دیا ہے کہ مثبت اقدار کا سہارا انسان کو ہر طوفان سے نپٹنے کی طاقت عطا کرتا ہے۔ وہ یہ پیغام دیتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کی بنیادیں اگر پختہ ہوں تو وہ کردار کو کلیت عطا کر کے اسے رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔

بانو قدسیہ روحانی قدروں کی طاقت کو تسلیم کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ ظفر کے کردار کے ذریعے ان قدروں کی عملداری کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ محبت کی کٹھالی میں ظفر جل کر راکھ نہیں ہوا بلکہ کندن بن کر نکلا ہے۔ ظفر کی اقدار نے اسے جو صراطِ مستقیم دکھایا، وہ اسے خود آگاہی اور خدا شناسی کے رستے پر ڈال دیتا ہے۔

بانو قدسیہ مثبت قدروں کے حامل اس کردار کا رشتہ پیغمبروں اور اوتاروں کے ساتھ جوڑتی ہیں۔ظفر نے بھی زمانے کے ظلم وستم کے تیر اپنی چھاتی پر سہے ہیں۔اس نے بھی اخلاقی قدروں کی عظمت کی گواہی دیتے ہوئے اپنی عزت و غیرت کی پاسبانی کی ہے۔

بانو قدسیہ کا ظفر کی نسبت عظیم ہستیوں سے قائم کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اخلاقی قدریں ہی وہ معیار ہیں جن پر کردار کی عظمت کو پَرکھا جا سکتا ہے۔وہ انسان جو اعلیٰ اخلاقی قدروں کے امیں ہیں، وہ زماں و مکاں کی حدوں کو پار کر کے عظیم ہستیوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ بتاتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کا دائرۂ کار آفاقی ہے۔صدیوں پہلے کے عظیم انسانوں نے جن اخلاقی معیارات کو قائم کر کے لافانی قدروں کو جنم دیا تھا، وہ آج بھی صراطِ مستقیم کی جانب انسان کی رہنمائی کر رہی ہیں اور اُن پر چل کر ہی انسان ذہنی و روحانی مسرت سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

ظفر کے کردار کا اگر ناول کے دوسرے کرداروں سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ظفر کی پختہ اقدار اس کے ذہنی رویوں، رجحانات اور زندگی کے فیصلہ کن مرحلوں میں بنیادی کردار ادا کرتی رہیں۔بانو قدسیہ کا نظریہ ہے کہ یہ اقدار جتنی مضبوط اور توانا ہوں گی، فرد کی شخصیت اتنی ہی مستحکم و مضبوط ہو گی۔ظفر کی پختہ اخلاقی اقدار نے اس کے کردار کو استقامت اور کلیت عطا کر کے اسے شکستگی اور دیوانے پن سے بچا لیا۔

رشو کے کردار کے ذریعے بانو قدسیہ نے کردار کی ناپائیداری اور بودے پن کے نتائج کو پیش کیا ہے۔رشو اپنی کمزور اقدار کی وجہ سے ہمیشہ کم ہمتی، تذبذب اور کشمکش کا شکار رہی۔اقدار کی ناپختگی نے اس کے رویوں اور رُجحانات کو ناہموار بنا رکھا تھا اور اس کی مذبذب اخلاقی اقدار نے اسے قوتِ فیصلہ اور ارادوں کی استقامت سے محروم کر دیا تھا۔

بانو قدسیہ نے دکھایا ہے کہ رشو کی اخلاقی اقدار کی بنیادیں کمزور ہیں انہیں اس نے کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔یہاں اقدار کی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہوا ایک لطیف استعارہ استعمال کیا گیا ہے کہ بہاول پور سے لائے ہوئے برقع کو اُتار کر لاہور کی ریشمی سفید ٹسر کی چادر اوڑھنا دراصل اصل پرانے نظامِ اقدار کو رَد کر کے نئی اقدار کو قبول کرنے کا اظہار ہے۔

برقع اُتارتے ہی پرانے نظامِ اقدار کی شکستگی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔بہاول پور کی اقدار ناقابلِ بھروسہ اور ناقابلِ اعتبار نظر آتی ہیں۔ایک ایک کر کے ان سب میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پختہ اقدار کی عدم

موجودگی سے اس کے اندر کسوٹی کا خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے پاس اقدار کا پیدا کردہ کوئی ایسا ٹھوس نظامِ فکر باقی نہ رہا جس کی روشنی میں وہ اپنے لیے راہِ عمل متعیّن کر سکتی۔

بانو قدسیہ نے دکھایا ہے کہ کسی نظامِ اقدار کی غیر موجودگی نے رشو کو ایسا کورا کاغذ بنا دیا جس پر کوئی بھی تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''رشو باجی نے بھی بھالو کو دیکھتے ہی زانوئے تلمّذ تہ کیا اور پچھلی پڑھی بانی جی سے بھلا کر ازسرِ نو مکتب میں داخل ہو گئی!''(۱۲۶)

اس جملے سے ہم بانو قدسیہ کے نظریۂ اقدار کو دریافت کر سکتے ہیں۔

بھالو لاہور شہر ہے۔ جس کا اپنا مخصوص مزاج، تہذیب اور سماجی حالات ہیں۔ یہ اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی بنا پر دوسرے شہروں پر برتری رکھتا ہے۔ اس کی برتری کا دوسرا سبب اس کی جدّت پسندی ہے۔ قدیم تہذیب و ثقافت اور جدید رُجحانات کے امتزاج نے لاہور کو مخصوص اور مختلف اقدار کا شہر بنا دیا ہے۔ یہ اقدار بڑی توانا اور دل افروز ہیں، دوسرے شہروں کی معاشرتی اقدار اِن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

بانو قدسیہ نے ان امکانات کو اُجاگر کیا ہے کہ کسی شہر کی اقدار انسانی کردار کو کس حد تک متاثر کر سکتی ہیں۔

بانو قدسیہ نے لکھا ہے کہ رشو پچھلی پڑھی بانی کو جی سے بھلا کر ازسرِ نو مکتب میں داخل ہو گئی۔ رشو کی پچھلی پڑھی بانی وہ پرانی اقدار و روایات ہیں جو اس نے بہاول پور سے اب تک کی زندگی میں حاصل کی تھیں۔ مصنفہ جانتی ہیں کہ جب تک پرانی اقدار کو فراموش نہ کر دیا جائے گا، نئی اقدار کو اپنانا مشکل ہو گا۔ نئی اقدار کو اپنانے کی خواہش اسی وقت جنم لیتی ہے جب پرانی اقدار حالات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہوں۔ اگر پرانی اقدار بہت پختہ ہوں تو تصادمِ قدر کی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن رشو کے معاملہ میں صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ اس کی اقدار اتنی متزلزل تھیں کہ انہیں فراموش کرنے میں اسے کسی دِقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

پرانی اقدار کو فرسودہ سمجھنے والی رشو لاہور کے مکتب میں داخل ہو گئی۔ لاہور کی معاشرتی زندگی صبح شام اسے نئی اقدار کا سبق دینے لگی۔

مصنفہ آگے چل کر پچھلی بانی کو بھلانے اور نیا سبق حاصل کرنے کے جو نتائج ہمارے سامنے رکھتی ہیں، وہ قابلِ ذکر ہیں۔

انسانی کردار پر اِقدار بڑے دوررَس اثرات مرتّب کرتی ہیں۔نئی اقدار کو اپنانے کا مرحلہ بظاہر بہت آسان نظر آتا ہے لیکن ان کو اپنے مزاج کا حصہ بنانا ان کی مدد سے اپنے لیے زندگی کے نئے معیار اور ضابطے وضع کرنا ایک طویل المدت عمل ہے۔اقدار کے ترازو سے متوازن زندگی کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جب ان اقدار کو رہن سہن اور تجربے کی کسوٹی پر برسوں پَرکھا گیا ہو۔کسی شہر کے باسیوں کے لیے اس شہر کی اقدار نئی نہیں ہوتیں۔نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ وہ ان تک منتقل ہوتی ہیں۔وقت کے ساتھ ساتھ ان میں واقع ہونے والی تبدیلیاں فطری عمل کا حصہ ہوتی ہیں۔نو واردوں کے لیے کسی شہر کی اقدار اجنبی ہوتی ہیں۔بے سوچے سمجھے انھیں جوں کا توں قبول کر لینا کردار پر مضر اثرات مرتّب کر سکتا ہے۔ ایسے موقع پر کہاوت استعمال کی جاتی ہے،''کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا''۔کوّے کو ہنس کی چال چلنا راس نہیں آ سکتا، کیونکہ وہ اپنی چال بھول کر اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔رشو کو بانو قدسیہ نے اسی صورتِ حال میں گھِرا دکھایا ہے۔مصنفہ یہ پیغام دیتی ہیں کہ انسان اپنی شناخت کھو کر اور اپنی اصلیت سے دور ہو کر کبھی حقیقی مسرت حاصل نہیں کر سکتا۔

رشو نے پرانی اقدار کو پسِ پشت ڈال کر خود کو نئی اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، لیکن اقدار کی شکست و ریخت کے اس عمل سے اس کی ذات کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

بانو قدسیہ رشو کے کردار کے ذریعے یہ ثابت کرتی ہیں کہ انسان بچپن میں جن اقدار کے ساتھ پرورش پاتا ہے وہ اس کے لاشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔بظاہر کمزور نظر آنے والی اقدار بھی ذہن میں گہری جڑیں رکھتی ہیں۔اگر انسان کبھی ان اقدار کو کاٹ کر الگ کر دینا چاہے تو بہت سے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔

بانو قدسیہ نے دکھایا ہے کہ رشو آخر میں معاشرتی تنہائی اور پچھتاوے کا شکار ہو کر schizophrenia کی مریض بن جاتی ہے۔اس کا پچھتاوا اپنی اقدار سے کٹ کر ماضی سے الگ ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا۔وہ اپنی ماں کو یاد کرتی ہے اور احساسِ ندامت سے بھر جاتی ہے۔کالج میں گزارے ہوئے سیدھی سادی زندگی کے دن اس کے ذہن پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔ظفر کی بھولی بسری محبت اس کے حواس پر چھا جاتی ہے۔وہ اپنے ماضی سے کٹ کر اُس کی یاد سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔وہ اپنے ماضی اور اُس سے وابستہ زندگی سے ناطہ توڑ کر وہموں، اندیشوں اور وسوسوں کا شکار ہو جاتی ہے۔اپنی گمشدہ شناخت کی تلاش میں وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔اس کے ذہنی انتشار کی انتہا یہ ہے کہ پہلے وہ منشیات کا شکار ہوئی اور آخر میں اپنے شوہر کو قتل کر کے مکمل طور پر ذہنی توازن کھو بیٹھی۔

رشو کا اپنے شوہر کو قتل کرنا بڑا معنی خیز ہے۔ ذہنی انتشار کے عالم میں وہ اپنے آپ کو بھی ختم کر سکتی تھی، لیکن خودکشی کی بجائے شوہر کو قتل کرنا لاشعوری طور پر اُن اسباب کو ختم کرنے کی شدید خواہش ہے جنھوں نے اس کی زندگی کا رُخ موڑ دیا تھا۔ وہ اس نئی زندگی کا خاتمہ چاہتی ہے جس کی علامت اس کا شوہر ہے۔ اس شادی نے ماضی اور اس سے وابستہ تمام رشتوں اور اس ماحول سے اس کا رشتہ توڑ دیا جو اس کے لیے ذہنی آسودگی، سکونِ قلب اور حقیقی مسرت کا باعث ہوا کرتا تھا۔ نئی زندگی نے اسے ذہنی انتشار، اضطراب اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔

اس انجام کے ساتھ بانو قدسیہ یہ نظریہ دیتی ہیں کہ جدتِ شہر کے فتنے سے بچنے کا ایک ہی راز ہے کہ اپنی بنیادی اخلاقی اقدار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ جو انسان ان قدروں کے امیں ہوتے ہیں وہی شہر کے کفر سے اماں حاصل کر کے نروان حاصل کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ: شہرِ بے مثال، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵، ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۲-۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۷۔ ایضاً، ص ۵۸

۸۔ ایضاً، ص ۳۲

۹۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴، ۱۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۸۔ ایضاً،ص۶۴

۱۹۔ ایضاً،ص۶۷

۲۰۔ ایضاً،ص۶۴-۶۵

۲۱۔ ایضاً،ص۲۴۶

۲۲۔ ایضاً،ص۲۷۲

۲۳۔ ایضاً،ص۳۲

۲۴۔ ایضاً،ص۱۷۱

۲۵۔ ایضاً،ص۱۹۴

۲۶۔ ایضاً،ص۲۰۹

۲۷۔ ایضاً،ص۲۲۶-۲۲۷

۲۸۔ ایضاً،ص۲۳۲

۲۹۔ ایضاً،ص۲۳۶-۲۳۷

۳۰۔ ایضاً،ص۱۰۶

۳۱۔ ایضاً،ص۱۰۷

۳۲۔ ایضاً،ص۲۳۷

۳۳۔ ایضاً،ص۲۱۲

۳۴۔ ایضاً،ص۲۴۰

۳۵۔ ایضاً،ص۲۴۱

۳۶۔ ایضاً،ص۹۶

۳۷۔ ایضاً،ص۶۱

۳۸۔ ایضاً،ص۹۵

۳۹۔ ایضاً،ص۹۶

۴۰۔ ایضاً،ص۱۴۸

۴۱۔ ایضاً،ص۹۶

۴۲۔ ایضاً،ص۱۸۰

۴۳۔ ایضاً،ص۱۲۲

۴۴۔ ایضاً،ص۱۰۰-۱۰۱

۴۵۔ ایضاً،ص۱۰۱

۴۶۔ ایضاً،ص۸۱

۴۷۔ ایضاً،ص۹۷

۴۸۔ ایضاً،ص۹۸

۴۹۔ ایضاً،ص۹۹

۵۰۔ ایضاً،ص۹۹-۱۰۰

۵۱۔ ایضاً،ص۲۲۷

۵۲۔ ایضاً،ص۲۰۰

۵۳۔ ایضاً،ص۲۰۰-۲۰۱

۵۴۔ ایضاً،ص۲۰۱-۲۰۲

۵۵۔ ایضاً،ص۲۰۲

۵۶۔ ایضاً،ص۲۷۱

۵۷۔ ایضاً،ص۲۶۲

۵۸۔ ایضاً،ص۲۲۹

۵۹۔ ایضاً،ص۶۶

۶۰۔ ایضاً،ص۶۹

۶۱۔ ایضاً،ص۱۴۷-۱۴۸

۶۲۔ ایضاً،ص۱۹۹

۶۳۔ ایضاً،ص۲۰۳-۲۰۴

۶۴۔ ایضاً،ص۲۵۴-۲۵۵

۶۵۔ ایضاً،ص۲۶۲

۶۶۔ ایضاً،ص۲۶۵

۶۷۔ ایضاً،ص۲۵۶

۶۸۔ ایضاً،ص۲۵۷-۲۵۸

۶۹۔ ایضاً،ص۷۰

۷۰۔ ایضاً،ص۵

۷۱۔ ایضاً،ص۱۷

۷۲۔ ایضاً،ص۷۱

۷۳۔ ایضاً،ص۵

۷۴۔ ایضاً،ص۷-۸

۷۵۔ ایضاً،ص۷

۷۶۔ ایضاً،ص۹-۱۰

۷۷۔ ایضاً،ص۲۱۵

۷۸۔ ایضاً،ص۲۱۴

۷۹۔ ایضاً،ص۷۱-۷۲

۸۰۔ ایضاً،ص۷۱

۸۱۔ ایضاً،ص۵

۸۲۔ ایضاً،ص۲۴

۸۳۔ ایضاً،ص۲۵

۸۴۔ ایضاً،ص۲۶-۲۷

۸۵۔ ایضاً،ص۱۲-۱۳

۸۶۔ ایضاً،ص۳۲

۸۷۔ ایضاً،ص۳۲

۸۸۔ ایضاً،ص۳۰

۸۹۔ ایضاً،ص۱۶

۹۰۔ ایضاً،ص۵۰

۹۱۔ ایضاً،ص۵۲

۹۲۔ ایضاً،ص۵۱

۹۳۔ ایضاً،ص۵۳

۹۴۔ ایضاً،ص۷۳

۹۵۔ ایضاً،ص۷۰

۹۶۔ ایضاً،ص۷۳

۹۷۔ ایضاً،ص۱۳۶-۱۳۷

۹۸۔ ایضاً،ص۶۰

۹۹۔ ایضاً،ص۱۳۷

۱۰۰۔ ایضاً،ص۱۴۳

۱۰۱۔ ایضاً،ص۱۶۶

۱۰۲۔ ایضاً،ص۱۷۱

۱۰۳۔ ایضاً،ص۱۸۹

۱۰۴۔ ایضاً

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۹۰

۱۰۶۔ ایضاً،ص۲۱۶

۱۰۷۔ ایضاً،ص۲۲۶

۱۰۸۔ ایضاً،ص۲۲۷-۲۲۸

۱۰۹۔ ایضاً،ص۸۰

۱۱۰۔ ایضاً،ص۲۳۸

۱۱۱۔ ایضاً،ص۲۴۱

۱۱۲۔ ایضاً،ص۲۴۳

۱۱۳۔ ایضاً،ص۲۴۷

۱۱۴۔ ایضاً،ص۲۲۸،۲۲۹

۱۱۵۔ ایضاً،ص۲۲۷

۱۱۶۔ ایضاً،ص۲۶۱-۲۶۲

۱۱۷۔ ایضاً،ص۲۶۱

۱۱۸۔ ایضاً،ص۲۵۹

۱۱۹۔ ایضاً،ص۲۶۲-۲۶۳

۱۲۰۔ ایضاً،ص۲۶۰-۲۶۱

۱۲۱۔ ایضاً،ص۲۶۱-۲۶۲

۱۲۲۔ ایضاً،ص۲۶۶

۱۲۳۔ ایضاً،ص۲۷۰

۱۲۴۔ ایضاً

۱۲۵۔ ایضاً،ص۲۷۲

۱۲۶۔ ایضاً،ص۲۱

باب سوم

راجہ گدھ

راجہ گدھ پہلی مرتبہ ۱۹۸۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ناول کا موضوع پیچیدہ اور تہہ دار ہے۔ خود مصنفہ نے اپنے ایک انٹرویو میں اس کے موضوع کا تعیّن کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس ناول کا موضوع رزقِ حرام اور حلال کا مسئلہ ہے۔

''سوال: جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، راجہ گدھ کا مرکزی خیال رزقِ حلال کے اسلامی تصور سے عبارت ہے۔ انفرادی سطح پر فرد اور اجتماعی سطح پر معاشرہ اخلاقی اور روحانی زوال سے اس لیے دوچار ہے کہ رزقِ حرام کو فروغ مل رہا ہے۔

بانو قدسیہ: جی ہاں، اس ناول کا بنیادی خیال یہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں استدلال کی سطح پر ہی سہی لیکن ہمارے لیے اہلِ مغرب کو رزقِ حلال کی اہمیت سمجھانا اور قائل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مذہب کے بہت سے احکامات ایسے ہیں جن کا ادراک محال ہے۔ اس لیے ادب میں ماننے کا مقام ہے، جاننے کا نہیں......

میں نے اپنے ناول میں یہی کہنا چاہا ہے کہ اگر ہم مغرب کے اثرات سے نکل کر رزقِ حلال کے عادی ہو جائیں تو صرف اسی ایک تبدیلی کے زیرِ اثر ہماری معاشرتی زندگی سے تمام خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی میں ان تمام بے چینیوں کا سبب، جو بالآخر لوگوں کو جرائم اور خودکشی کی طرف مائل کرتا ہے، رزقِ حرام ہے۔ میں نے ناول میں رزقِ حرام کے مختلف روپ دکھائے ہیں۔ زنا بھی اسی کا ایک روپ ہے، جو انسان کو آخرکار مایوسی اور ناکامی کے اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔''(۱)

ڈاکٹر سلیم اختر اس کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کا موضوع انسان کا اخلاقی زوال ہے جسے عورت کی صورت میں عشقِ لاحاصل اور مرد کی صورت میں جنس سے واضح کیا گیا ہے۔ مگر بانو قدسیہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسے محض مرد عورت کے جنسی تعلقات کی عام سطح تک نہ رہنے دیا بلکہ اسے انسان سے انسان

کے جذباتی تعلق کا رَزمیہ بنا دیا۔''(۲)

نیلم فرزانہ اس کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''اس ناول میں رزقِ حرام و حلال کا مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ موجودہ دَور میں حرام کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور پورا معاشرہ جس طرح اس کی لپیٹ میں ہے، اس نے انسان کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ وہ مذہبی اور اخلاقی ہر قید سے آزاد ہو کر زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے جو صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کر سکے......لیکن مصنفہ کی نظر میں دیوانگی کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ ان کا نقطۂ نظر ہے کہ انسان جب ترقی کرتا ہے تو دیوانگی کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی یہ دیوانگی منفی بھی ہو سکتی ہے اور مثبت بھی۔ سائنس کی عظیم ایجادات انسانیت کے لیے قاتل بھی ہو سکتی ہیں اور انسان کی فلاح بھی کر سکتی ہیں تو پھر کیوں نہ انسان اپنی ذہنی اختراعات اور اپنی طاقت کو انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔ زندگی کے تیئں یہی مصنفہ کا نقطۂ نظر ہے جو ناول میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔''(۳)

اس کے موضوع کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا خیال ہے:

''اس کے کرداروں مثلاً قیوم، سیمی، امتل اور پروفیسر سہیل کی کہانی سے عشقِ لاحاصل اور رزقِ حرام سے انسانوں میں جنم لینے والی دیوانگی اور اس سے اقدار میں پڑنے والے دراڑوں پر روشنی پڑتی ہے۔''(۴)

''یہ سارا کھیل عشقِ لاحاصل کے اشتہا میں صرف اپنی شہوت کا سفر ہے۔ مکانی حوالوں سے مشرق و مغرب کے Seneries پر پھیلا ہوا یہ ناول وقت کے تین دورانیوں سے گزرتا ہوا حیات سے موت کا سفر کرتا ہے۔ محسوسات کے لطیف کوائف، ہیجان کے بڑے بڑے جھٹکے سہہ جانے کی عام لوگوں والی سطح، دانش وروں کی نکتہ آفرینیاں، جنس کی ہر Taboo سے آزاد صورت سب ایک بڑے تصوف میں جا اُترتے ہیں۔''(۵)

نیلم فرزانہ کے خیال میں رزقِ حرام و حلال کے تصور اور اخلاقی زوال کے ساتھ ساتھ ناول کا موضوع جدید مادی معاشرے میں فرد کی تنہائی بھی ہے۔ تنہائی کے اس تجربے میں ناول کے تمام اہم کردار قیوم، سیمی، سہیل اور امتل شریک

ہوتے ہیں۔ وجود کی معنویت کی تلاش میں یہ کردار المیاتی واقعات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان سب کا انجام یہ ہے کہ ان کے ذہن وروح میں زندگی کی بے معنویت کا احساس اور موت سے ہم آغوشی کی خواہش جاں گزیں ہو جاتی ہے۔

ان تمام نقادوں کی رائے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''راجہ گدھ'' کا موضوع حرام وحلال کے اسلامی تصور کو واضح کرنا ہے۔ رزقِ حرام کے منفی اثرات کو اُجاگر کر کے بانو قدسیہ اسے دیوانے پن، اخلاقی زوال اور قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کا سبب قرار دیتی ہیں۔ مصنفہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ رزقِ حرام کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دونوں ہی زوال اور پستی کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہر چند ناول کا موضوع فرد کی تنہائی اور وجود کی معنویت کی تلاش بھی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ہم قدروں کے زوال اور فرد و معاشرے پر اِس کے اثرات کے حوالے سے ناول کا جائزہ لیں گے۔

ناول میں پیش کردہ رزقِ حرام کی تھیوری ہو یا دیوانہ پن، معاشرتی زوال ہو یا اخلاقی پستی، دراصل یہ سب قدروں کے زوال کا شاخسانہ ہیں۔ سیمی، قیوم، امتل وغیرہ سب کے سب شکستہ قدروں کے المیہ سے دوچار ہیں۔ اخلاقی پستی سے قدروں میں پڑنے والے دراڑیں اور ان کے اثرات ہی ہمارا موضوع ہیں۔ بانو قدسیہ فکری لحاظ سے انسان کے جنسی، فکری، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کا کیا نظریہ پیش کرتی ہیں؟ ہم اس کا جائزہ بھی پیش کریں گے۔

> ''ناول میں پیش کردہ کہانی کا جائے وقوع پاکستان ہے۔ یہ پاکستان کی نوجوان نسل (جو ۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی) کی ذہنی و جذباتی پیچیدگیوں اور روحانی اضطراب کی کہانی ہے، ۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد جو معاشرہ پروان چڑھا اُس کی بنیاد مادّیت پر رکھی گئی۔ رفتہ رفتہ جاگیرداروں اور نوابوں کی جگہ سرمایہ دار طبقہ اُبھرا۔ مادہ پرستی اور ظاہری آرائش و زیبائش کا زور بڑھتا گیا۔ نتیجے میں حسّاس ذہن رکھنے والے انسانوں کے اندر ایک روحانی اضطراب اور کشمکش کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس ناول میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ پاکستان کی اسی موجودہ صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔''(۶)

ناول کا پہلا حصہ سیمی کی کہانی ہے جو ''عشقِ لاحاصل'' کے عنوان سے بیان کی گئی ہے۔ سیمی ماڈرن، تعلیم یافتہ اور ذہین لڑکی ہے۔ ساتھ ہی وہ نہایت حسّاس، جذباتی اور محبت کی متلاشی روح ہے۔ جسے نہ والدین کی محبت ملتی ہے اور نہ محبوب کی۔ سیمی کے والدین مادہ پرست اور تضادات سے بھرے معاشرے کی علامت ہیں۔ اس کا باپ مادی آسائش کی جستجو میں

اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ اسے اپنی بیٹی کے مسائل اور اس کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ماں بھی اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش میں اپنے اندر اُبھرنے والے تضادات سے نبرد آزما ہے۔ یہ دونوں اپنے ذاتی مسائل میں اس قدر مصروف ہیں کہ ان کے پاس اپنی بیٹی کے لیے وقت نہیں ہے۔ سیمی اپنے باپ کے بارے میں کہتی ہے:

''پاکستان کا اونچا بیوروکریٹ یہ تھوڑی سوچتا ہے کہ اس کی بیٹی کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ اس کے اپنے ذاتی مسائل کی کھیپ اتنی زیادہ ہے کہ وہ کسی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔''(۷)

سیمی، آفتاب سے محبت کرتی ہے۔ آفتاب بھی اسے چاہتا ہے لیکن کسی اور لڑکی سے شادی کر کے لندن چلا جاتا ہے۔ آفتاب کی بے وفائی کے بعد بھی سیمی کے دل سے اس کی محبت ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس کے بعد اس سے شدید قسم کی جذباتی بلکہ روحانی محبت کرتی ہے۔ اس کے نزدیک آفتاب کی محبت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ آفتاب سے بچھڑ جانے کے بعد قیوم کی رفاقت صرف اس لیے قبول کر لیتی ہے کہ اس کے ساتھ مل کر آفتاب کی یادوں کو زندہ کیا کرے۔ قیوم یہ جانتا ہے کہ سیمی اس سے محبت نہیں کرتی، وہ ایک زندہ لاش کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کا غم بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ یہاں عشقِ لا حاصل کا شکار سیمی بھی ہے اور قیوم بھی۔ دونوں مردہ آرزوؤں کے جال میں اسیر ہیں۔ آفتاب کی بے وفائی کے بعد سیمی کے لیے اپنے وجود کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ اسے نہ اپنی جان کی پرواہ ہوتی ہے نہ اپنے جسم کی۔ وہ مسلسل بیمار رہنے لگتی ہے۔ مگر اسے اپنے آپ کی فکر نہیں ہے۔ وہ قیوم کے ساتھ جسمانی تعلقات بھی قائم کر لیتی ہے۔ یہ اس کا اپنے جسم سے انتقام تھا۔ اپنے زخموں کو کرید کرید کر وہ عجیب سی لذت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ اس کے اندر موت کی آرزو اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ پہلے وہ بیمار ہوتی ہے اور پھر خودکشی کر کے اپنی زندگی کو ختم کر لیتی ہے۔

قیوم، سیمی کی موت کے تجربے کا زہر اپنی رَگوں میں بسائے مزید جینے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا کہ اس کی ملاقات عابدہ سے ہو جاتی ہے۔

عابدہ مڈل کلاس گھرانے کی باتونی اور متجسّس عام سی گھریلو خاتون ہے۔ وہ اپنے اور قیوم کے تمام نجی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاتی۔ عابدہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اولاد سے محروم ہے۔ وہ اپنے دل میں بچے کی شدید تمنا رکھتی ہے اسی لیے وہ اپنے شوہر سے بھی متنفر ہے۔

قیوم مختلف تجربات میں زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے یوگا کے ناطے عابدہ سے جنسی

تعلق قائم کر لیتا ہے۔ بچے کی خواہش میں عابدہ بھی اس کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے بعد وہ ذہنی کشمکش اور احساسِ گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب اس کا شوہر اُسے لینے آتا ہے تو خوشی خوشی اس کے ساتھ جانے پر رضا مند ہو جاتی ہے۔ عابدہ کے ساتھ قیوم کی تنہائی کچھ دیر کے لیے کم ہوئی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اسے مزید مایوسی اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی اس تنہائی سے فرار حاصل کرنے کے لیے ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہو جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات امتل سے ہوتی ہے۔ امتل ایک عمر دراز طوائف ہے۔ ابتدا میں قیوم اس سے دور دور بلکہ بیزار سا رہتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ امتل کی شخصیت کی چھوٹی چھوٹی خصوصیات اسے متاثر کرتی ہیں۔ ایک مرحلے پر وہ امتل سے بے حد قربت محسوس کرتا ہے۔ امتل کی پوری زندگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس نے بہتر زندگی گزارنے کا خواب دیکھا، لیکن وہ اسے اپنی آزادی کی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ امتل نے اپنی آزادی کا سودا کرنے کی بجائے تنہائی کا راستہ اختیار کیا۔ زندگی کے برتاؤ نے امتل کے اندر کی عورت کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ اب بھی شفقت و محبت کا جذبہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ جب قیوم اور امتل ایک دوسرے کو اپنے ماضی کے تجربات میں شریک کرتے ہیں، قیوم کے ساتھ امتل کی یہ آخری ملاقات تھی۔ اس رات امتل نے یہ دعا کی تھی کہ اس کی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے نہ گزر سکی لیکن اس کی موت کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔ اس کی دعا پوری ہوئی اور اسی رات اس کے بیٹے نے، جو نیم دیوانہ تھا، اُسے قتل کر ڈالا۔

امتل کے قتل کے بعد قیوم کی زندگی ایک بار پھر خلاؤں میں بھٹکنے لگتی ہے۔ وہ سنبھلنے کی کوشش میں اپنی بھابھی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی شادی کسی باکرہ لڑکی سے کرا دے۔ وہ سوچتا ہے کہ اپنی زندگی کی تمام تلخیاں اور روح کا اِنتشار بیوی میں انڈیل کر وہ ہلکا پھلکا ہو جائے گا۔ لیکن شادی کی رات اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی ہے اور اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اور یہ کہ اس کی شادی قیوم کے ساتھ زبردستی کر دی گئی ہے۔ یہاں قیوم کے سنبھلنے کا آخری سہارا بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ زندگی کے اتنے روپ دیکھ کر، اتنے تجربے حاصل کر کے اس کے اندر ایک بے نیاز قسم کی انسانیت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بظاہر اس صورتِ حال پر کوئی شدید ردّ عمل ظاہر نہیں کرتا اور بڑے سکون سے اپنی بیوی کو تسلی دینے اور اس مسئلے کا حل سوچنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اس کے قلب و ذہن کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔

''بس جی بارڈر لائن کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی مریض ہمارے پاس واپس آ جاتا ہے کبھی ادھر چلا جاتا ہے ایب نارمل لوگوں میں۔

آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے؟......روشن نے سوال کیا۔

کر رہے ہیں بی بی......ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن ایسا کیس ہمارا نہیں ہوتا......انہیں کسی سائیکوتھر پسٹ کی ضرورت ہے......سرِ دست جو کچھ بھی ممکن ہے کر رہے ہیں......''(۸)

روشن کو اس کی منزل پر پہنچانے کے بعد سائیں جی کی معیّت میں قیوم نے روحانی سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان کی مدد سے سیمی کی روح سے مل کر اُن سوالوں کے جواب چاہتا تھا جنہوں نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ روحوں کے ساتھ مل کر زندگی اور موت کے لاینحل سوالات حل کرنا چاہتا تھا۔لیکن آخری مراحل میں سائیں جی کی دھنسی ہوئی قبر نے یہ راستہ بھی گم کر دیا۔

ناول کے آخر میں آفتاب اپنے عجیب الخلقت ایب نارمل بچے کے ساتھ لندن سے پاکستان واپس آتا ہے۔ وہ اسے سکائی ٹرسٹ کو دکھانا چاہتا ہے لیکن قیوم، جو دیوانگی کی بہت سی منزلوں سے گزر چکا ہے، آفتاب کو سمجھاتا ہے کہ اس کی دیوانگی عام پاگلوں جیسی نہیں ہے، کیونکہ اس پر تمام حجابات کھلے ہوئے ہیں اور وہ اس دنیا سے پرے کی چیزیں بھی دیکھ سکتا ہے۔اس کی حسیات وہ چیزیں محسوس کرنے پر قادر ہیں جنہیں ایک عام انسان محسوس نہیں کرسکتا۔قیوم آفتاب سے کہتا ہے کہ افراہیم ایب نارمل نہیں بلکہ سپر نارمل ہے۔قیوم آخر میں کہتا ہے:

''افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سربسجود تھا۔ میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر مجبور کھڑا تھا۔اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقاء کھنچی کمان کی مانند تنا تھا۔انسان کو ایب نارمل سے سپر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟''(۹)

سیمی

ناول کی ہیروئن سیمی کا تعارف مصنفہ یوں کراتی ہیں:

''چولستانی ہرنی اٹھی، اس نے کرسی پر ایسے بازو رکھا جیسے موٹر سائیکل کے سہارے کھڑی ہو۔ سر میرا نام سیمی شاہ ہے، میں نے کینرڈ کالج سے بی اے کیا ہے اور میرے سبجیکٹ سائیکلوجی اور ہسٹری تھے۔''(۱۰)

''وہ گلبرگی معاشرے کی پیداوار تھی۔اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر سفید وائل کا

کُرتا پہن رکھا تھا۔ گلے میں حمائل مالا نما لاکٹ ناف کو چھو رہا تھا۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ اسٹک، ٹشو پیپر تھے۔ ایک ایسی ڈائری تھی جس میں کئی فون نمبر اور برتھ ڈے کے دن درج تھے...... اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔''(۱۱)

سیمی کا تعلق گلبرگ کے طبقۂ اشرافیہ سے تھا۔ وہ ناز و نعم میں پلی مکمل ماڈرن شہری لڑکی تھی۔

''اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوز ویک پڑھتی، ٹی وی پر امریکی سیریز دیکھتی۔ اس کی وارڈ روب میں گنتی کے شلوار قمیض تھے۔ وہ شیمپو، ہیئر سپرے، ٹشو پیپرز، کولون اور سینٹ سپرے کے بل بوتے پر سنگھار کرتی تھی۔ اس نے کبھی لوٹے اور بالٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ بیک برش اور شاور سے نہانے والی اس دخترِ گلبرگ کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک کشمیری بچے اور وہ بھی اندرونِ شہر کے رہنے والے سے، جب وہ عشقِ لاحصل کا نعرہ لگا رہا تھا، مات کھا گئی۔''(۱۲)

قیوم سیمی کا ذکر یوں کرتا ہے:

''میں نے اس سے پہلے اتنی مکمل شہری لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں اشتہاروں کی دنیا میں پہنچ گیا اور وہ مجھے...... اس کا لب ولہجہ، لباس، اٹھنا بیٹھنا، جسم سے اٹھنے والی خوشبو سب اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ مجھ سے زیادہ مہذب ہے۔''(۱۳)

سیمی ایک ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس کی ذات خوش اعتمادی اور خودسری کے خمیر سے گوندھی گئی ہے۔

''سوشیالوجی کی کلاس میں وہ سب سے باتونی لڑکی تھی۔ پروفیسروں کے نظریات سے ٹکر لینا اور چھوٹے سے لطیفے پر دیر تک ہنستے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ دراصل اس میں وہ خوش اعتمادی کا خمیر تھا جس سے اس کی شخصیت کی تمام دلآویزی میں پھول لگے تھے۔''(۱۴)

سیمی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قیوم کہتا ہے:

''سیمی آسانی سے قابو میں آنے والی لڑکی نہ تھی۔ وہ خودسر، ضدی، خوب پڑھی لکھی اور فیشن ایبل تھی۔ اس کی باتوں میں واشنگٹن ڈی سی کا دبکا تھا۔ اپنی رائے، چاہے وہ کیسی بھی دور

پار یا انوکھی کیوں نہ ہو، اس کے اظہار کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ یونین کے الیکشنوں میں اس نے پوسٹر بنائے، تقریریں کیں، ووٹروں کے ساتھ گھومی پھری، جھنڈے اٹھا کر نعرے لگائے...... وہ اصلی معنوں میں ماڈرن تھی، کیونکہ ہر ننگے لباس میں وہ ڈھکی ہوئی رہتی تھی۔''(۱۵)

سیمی اظہار کی قائل تھی، خواہ یہ اظہارِ اشتہا ہو یا اظہارِ عشق۔ وہ ایک آزاد خیال اور بے باک لڑکی تھی۔ کلاس کے لڑکوں کے ساتھ بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں اس نے کبھی جھجھک کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''دراصل سیمی جیسی لڑکیوں پر محبت کرنے کا کبھی شک بھی گزر نہیں سکتا...... وہ شرماتی لجاتی تو ہیں نہیں کہ آدمی اندازے لگا سکے۔ ہم پانچوں طالب علموں کے ساتھ اس کی خوب بحثا بحثی رہتی تھی۔

فرزانہ اور طیبہ متوسط گھرانے کی لڑکیاں تھیں، اس لیے ان میں جرأت کی کمی بھی تھی اور سچائی کی بھی...... کوثر درمیان میں تھی...... کبھی ماڈرن ہو کر مذاق کر لیتی، کبھی دقیانوسی بن کر کسی کی بات پر منہ بنا لیتی...... صرف سیمی جلتا کوئلہ تھی...... بھڑکتا سرخ......''(۱۶)

سیمی کے جذبے منہ زور اور شدید تھے۔ اس کے متعلق کوثر کا کہنا ہے:

''Competition تو ذرا برداشت نہیں کرتی، کیسے بھاگی ہے ہار کے...... ابھی تو چاٹی ریس ہاری ہے جب آفتاب ریس ہارے گی تو پتہ نہیں کیا حشر ہوگا اس کا......''(۱۷)

آفتاب اس کے متعلق کہتا ہے:

''سیمی سمجھتی ہے کہ وہ اپنے رویے سے، اپنی سوچ سے، اپنی پسند سے خوشی اور غم لانے کی ضامن ہے...... تو وہ ایسی ضدی ہے کہ اپنی آرزو کے سامنے اللہ کی ساری کائنات توڑ پھوڑ سکتی ہے۔

میں بھی ایسی ہی سمجھتا ہوں......''(۱۸)

''انسان جامد نہیں ہے، بڑھنے والا ہے، اوپر، دائیں، بائیں...... اس کی ضروریات کو تم پابند نہیں کر سکتے...... لیکن سیمی بڑی ضدی ہے...... بہت زیادہ...... وہ محبت کو کسی جامد لمحے میں

بند کرنا چاہتی ہے۔''[۱۹]

سیمی جیسی ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی کے بارے میں کسی کو یہ شبہ تک نہ تھا کہ وہ کسی سے شدید محبت کر سکتی ہے۔

''شروع شروع میں سیمی ایسی Sporty لڑکی نظر آئی کہ کلاس والوں کو شبہ تک نہ ہوا کہ وہ آفتاب کی ہپ پاکٹ میں ہے۔ ان دنوں میں ہر روز اُس میں کوئی نئی بات کوئی نئی ادا دریافت کرنے کی سٹیج میں تھا۔ میری یہ سٹیج تحیر کی تھی، جو کچھ مجھے نظر آتا میں اسے پوری طور ہضم بھی نہ کر پاتا کہ دوسرے دن اس میں کچھ اور نیا، کچھ اور دلچسپ اور حیران کن نظر آ جاتا۔''

''سیمی کی ہر بات کو غلط سمجھنا آسان تھا۔ وہ ہر لڑکے کو دلچسپی اور تجسّس سے دیکھنے کی عادی تھی۔ جنسِ مخالف سے ایک خاص حد تک دوستی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو گھر آئی محبت کو سوغات کی طرح سمجھ کر تھینک یو کر کے رکھ لیتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسے رویے سے معتوب عاشق اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی ہے حالانکہ وہ صرف Nice ہو رہی ہوتی ہیں۔''[۲۰]

جب سیمی، آفتاب کی محبت میں تڑپتی ہے تو قیوم اس پر حیران ہو کر کہتا ہے:

''سنو سیمی تم ماڈرن لڑکی ہو...... تمہارے بال کٹے ہوئے ہیں۔ لباس چال ڈھال سب ماڈرن ہے۔ تم نے آفتاب کی نقل میں اپنے آپ کو مشرقی کر لیا ہے۔ اُردو سیکھ لی ہے۔ یہ اور بات ہے...... لیکن اندر سے تم Liberated لڑکی ہو۔ خدا کی قسم ایسی لڑکی قتل کرتی تو اچھی لگتی ہے، قتل ہوتی کچھ اوپری سی لگتی ہے۔''[۲۱]

سیمی بظاہر ایک لاپرواہ اور لااُبالی سی لڑکی دکھائی دیتی ہے جو سنجیدگی سے محبت نہیں کر سکتی۔ بقول پروفیسر سہیل، وہ محبت میں وفادار نہیں ہو سکتی۔

''ہاں میں ہی وجہ بنا...... میں...... سیمی میری طرف شروع شروع میں مائل تھی لیکن آفتاب کو میں نے یقین دلا دیا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ سیمی میں محبت تو تھی وفا نہیں تھی۔

یہ آپ نے کیا کیا؟......وہ تو سر سے پاؤں تک وفاتھی سر......اس نے تو آفتاب کے لیے جان دے دی۔''(۲۲)

سیمی کی آزادخیالی اور ماڈرن انداز سے سبھی نے دھوکہ کھایا۔ وہ شدید محبت کرنے والی وفادارلڑکی ثابت ہوئی جو آفتاب سے بچھڑ کر ہمیشہ محبت کی آگ میں جلتی سلگتی رہی۔محبت کے بارے میں خوداُس کا کہنا ہے:

''ہاں...... ہاں...... ہاں...... میں بچپن سے بہت Pampered ہوں قیوم۔ میں محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی،لیکن......اب زندہ رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے......''

سیمی کے جذبۂ محبت کے بارے میں آفتاب ایک موقع پر کہتا ہے:

''سیمی کبھی نہیں سمجھ سکتی...... وہ بہت زیادہ زندہ ہے......محبت کرتی ہے جی جان سے...... زندگی حساب کا سوال نہیں ہے لیکن وہ اسے کسی فارمولے سے حل کرنا چاہتی ہے۔''(۲۳)

محبت کے لیے سیمی کی تڑپ کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

''محبت پانے والا کبھی اس بات پر تو مطمئن نہیں ہو جاتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل طور پر ایک شخص کی محبت حاصل ہوئی تھی۔محبت تو قیوم ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو،تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے......روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔اسی طرح جس روز محبت کا آفتاب طلوع نہ ہو، رات رہتی ہے......تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے...... مجھے غم نے فلسفی بنا دیا ہے......تمھیں کیا پتہ زمین کا ہر قطعہ سورج کیوں مانگتا ہے......جس شخص سے محبت ملے ہمیشہ اسی کے پاس رہنے کو کیوں جی چاہتا ہے......''(۲۴)

سیمی،آفتاب سے بچھڑ کر اُس کی محبت میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہی۔ وہ رہ رہ کر اس کے ساتھ گزارے دنوں کو یاد کر کے اپنے زخم کریدتی رہتی ہے۔

''اسے مجھ سے بڑی محبت تھی قیوم......اب تو...... میں کوئی ثبوت بھی نہیں دے سکتی......لیکن ففتھ ایئر میں وہ مجھ سے بڑی شدید محبت کرتا تھا......کبھی کبھی مجھے لگتا میرے بعد وہ مر جائے گا......یا شاید......یا شاید یہ بھی میرا وہم تھا......''

''ان باتوں سے حاصل سیمی؟اس توڑ پھوڑ سے کیا بنے گا۔''

''مجھے اب اپنا کچھ نہیں بنانا قیوم۔''

''تم اسے خط لکھنا چاہو گی۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا ملے گا خط لکھ کر؟ میرے خط تو شاخوں پر ہی سوکھ گئے۔ نہ میں نے انہیں گلدان میں سجایا نہ کسی نے انہیں گلے کا ہار کیا۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس طرح کسمسائی جیسے غلطی سے ٹھنڈے پانی کا شاور سردیوں میں اپنے اوپر کھل جائے۔

''سنو سیمی! تم ماڈرن لڑکی ہو...... تمہارے کٹے ہوئے بال ہیں......''

''خدا قسم ایسی لڑکی قتل کرتی تو اچھی لگتی ہے، قتل ہوتی کچھ اوپری سی لگتی ہے۔''

''پھر میں کیا کروں، کیا کروں قیوم...... اس نے زیبا کو مجھ پر ترجیح کیوں دی، کیوں کیوں کیوں؟''

''اس کی خاطر میں نے ایم اے چھوڑا...... گھر چھوڑا...... اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا دل مانے بھی...... دل مانتا ہے تو مر جانے کو جی چاہتا ہے...... آفتاب چلا گیا، اب کچھ ہو تھوڑا سکتا ہے......''(۲۵)

محبت کی ناکامی سے سیمی کے اندر جوار بھاٹا پھٹ پڑا۔ وہ آفتاب کی یاد میں تڑپتی تلملاتی رہی۔ آفتاب کی بے وفائی سیمی جیسی حسّاس لڑکی کے لیے ناقابلِ قبول اور ناقابلِ برداشت تھی۔ سیمی کی تشفی کے لیے قیوم اسے طرح طرح سے سمجھاتا ہے، دلاسے دیتا ہے، لیکن کوئی بھی حرف سیمی کے زخموں کا پھاہا نہ بن سکا۔

''سنو سیمی! آفتاب اس وقت اسّی فیصد خوش ہے...... بیس فیصد خوشی اسے رفتہ رفتہ مل جائے گی کیونکہ وہ زیادہ شدید نہیں ہے...... مسئلہ تمہارا ہے، تمہیں خوش رہنے کے لیے کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔''

وہ کسی قسم کے بندوبست کے لیے تیار نہ تھی۔

''وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتا...... وہ ایسا بے وفا نہیں ہے قیوم...... ہم دونوں تو ایک دوسرے کے علاوہ کسی اور کے ساتھ خوش رہ ہی نہیں سکتے تھے...... پھر یہ کیسے ہوا کہ وہ توزیبا کو پا کر خوش ہو گیا اور میں......اور میرے لیے خوشی ایک مسئلہ بن گئی...... کیسے؟''

''تمہیں بھی اپنے لیے خوشی کی کوئی راہ تلاش کرنی ہو گی سیمی...... پیچھے رہ جانے والوں کے لیے اور کوئی صورت نہیں ہوتی!''

وہ محبت کے ترازو میں برابر کا تلنا چاہتی تھی اور دوسری طرف کے پلڑے میں مجھے ایسا کوئی بٹہ رکھنا نہیں آتا تھا جس کی وجہ سے اس کا توازن ٹھیک ہو جاتا۔ اگر میں آفتاب کو خوش ظاہر کرتا تو وہ تنفر کی صورت میں بے قابو ہو جاتی۔ اگر میں اسے اداس ظاہر کرتا تو بے یقینی، نا اُمیدی اور شدید غم تلے دَب کر آہیں بھرنے لگتی، محبت کا آرا اوپر تلے اس کے تختے کاٹتا چلا جا رہا تھا......''(۲۶)

آفتاب سے بچھڑ کر سیمی جس کرب کا شکار تھی، اس کا اظہار وہ خود یوں کرتی ہے:

''تم نے کبھی محبت کی ہو......تو تمہیں پتہ ہو آدمی کس کرب سے نکلتا ہے۔ تم کو ہر وقت پڑھائی کی پڑی رہتی ہے......اپنی تھیوریاں بنانے میں لگے رہتے ہو......تم کو کیا پتہ کہ ایک وقت ایسا بھی انسان پر آتا ہے جب وہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے باوجود خودکشی کر لیتا ہے......تم کو کیا پتہ......سب کچھ معاشرہ نہیں ہوتا۔ معاشیات سے انسان کی فلاح مکمل طور پر بندھی ہوئی نہیں ہے......تمہیں کیا پتہ......''(۲۷)

قیوم، سیمی سے محبت کرتا ہے لیکن سیمی اس کی محبت کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اسے صرف آفتاب کی محبت اور توجہ درکار ہے۔

''اس نے اپنا پرس تلاش کیا، لکڑی کی ہیل والے جوتے پہنے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تمہیں میری بات سننا ہو گی...... میں نے بھی محبت کی ہے کسی سے...... شدت کے ساتھ......آج تمہیں میری طرف کی کہانی بھی سننا پڑے گی سیمی......''

''سنوں گی قیوم لیکن آج نہیں......دیکھو ناں آج میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اِلتجا کی......''صرف ایک جملہ......''

''آج نہیں قیوم۔ پتہ ہے آج ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے......آج ہی تو لینڈ سلائیڈ ہوا ہے زبردست قسم کا......'' (۲۸)

''مجھے تم سے محبت ہے......سیمی......کیا یہ تمہارے لیے کافی ہو سکتی ہے؟'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''آئی ایم سوری لیکن میں تمہاری محبت کو کیا کروں قیوم......اس کا تو نکاح ہو گیا...... پورا اور اصل...... پکے کاغذ والا...... ہائے میں مر جاؤں سیدھا نکاح......دو گواہوں والا...... برات والا......ہم میں تو کبھی لڑائی بھی نہیں ہوئی تھی......ہم تو کبھی ایک دوسرے سے ناراض بھی نہیں ہوئے......پھر یہ کیسی سزا دی مجھے......کیوں قیوم کیوں؟'' (۲۹)

قیوم کی محبت سیمی کے دل سے آفتاب کا خیال محو نہ کر سکی۔ قیوم کے ساتھ سیمی کا میل جول صرف اس لیے تھا کہ وہ قیوم کے ساتھ مل کر آفتاب کو یاد کر سکے۔ قیوم کا اظہارِ محبت اس کے لیے بے معنی تھا۔ آفتاب کی شادی نے اسے ایسی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا جو کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔ وہ آفتاب کی محبت کو یاد کر کر کے اپنے زخم کریدتی رہتی۔

آفتاب کی بے وفائی نے سیمی کو خود بیں بنا دیا۔ اسے نہ اِردگرد کا کچھ ہوش تھا، نہ اپنی ذات کی خبر تھی۔ وہ اپنے نفع نقصان سے لاپرواہ ہو چکی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کا تجزیہ بانو قدسیہ اس طرح کرتی ہیں:

''دراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کششِ ثقل سے آزاد ہو گئی تھی......لیکن کششِ ثقل سے آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی ٹریننگ نہ دی گی تھی......سیمی کے اندر کا پریشر بہت بڑھا ہوا تھا۔ سیمی کششِ ثقل سے آزاد ہو چکی تھی۔ لیکن بے سمت زندگی گزارنے کی ابھی تک اسے کوئی ٹریننگ نہ ملی تھی۔ وہ گویا ان دنوں مارفیا تلے سانس لے رہی تھی، جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی۔ کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی کی گڑیا کی طرح اس طرف دیکھتی جاتی۔ ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔ اس خلائی دور سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوئیں۔ خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی غرضیکہ آفتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں......لیکن

ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا۔ خاموشی ہوتی......اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا......‘‘ (۳۰)

آفتاب کی محبت سیمی کی قلب ماہیت کا باعث ہوئی۔ محبت کی ناکامی نے سیمی کے اندر کئی جہتیں پیدا کر دیں۔ اس کی خود بینی نے اسے فلسفی بنا دیا۔ اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں ڈوب کر وہ منظر دیکھ لیتی جو کبھی اس کے سامنے نہیں آئے تھے۔

’’قیوم تم مانو گے نہیں......لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا پہلے ہی اس کی شادی کس دن ہو گی۔ میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی......تمہیں کیسے شک تھا......کیسے؟ بس مجھے معلوم تھا......کہ وہ چودہ تاریخ کو شادی کرے گا...... چودہ تاریخ...... اتوار کا دن......آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات کو بارش ہو گی گرج چمک کے ساتھ......تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر......‘‘ (۳۱)

’’میں نے اس لاش کو ہاتھ لگایا۔

’’تم ہو ناں قیوم......‘‘ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

’’ہاں......‘‘

’’میں جانتی تھی تم آؤ گے...... مجھے پتہ تھا تم ویسے نہیں ہو......‘‘

تمہیں کیسے پتہ تھا سیمی......‘‘ میں نے حیران ہو کر کہا۔

’’بس پتہ ہوتا ہے...... پتہ چلتا رہتا ہے۔‘‘

’’لیکن پھر بھی......کیسے؟‘‘

’’مجھے پتہ تھا پہلے تم ایئر پورٹ جاؤ گے پھر یہاں آؤ گے۔‘‘

’’میں نے ہی......تو تمہیں ایئر پورٹ بھیجا تھا قیوم...... جب تم......موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے......تو میں نے ہی تو تمہیں آواز دی تھی...... بلایا تھا زور سے پوری طاقت سے۔‘‘

’’کیا......کیا کہہ رہی ہو تم......تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں......میں......‘‘

’’تمہیں شاید معلوم نہ ہو...... کہ صبح آفتاب نے جب شیو کی تو اس کی ٹھوڑی پر گہرا کٹ لگ گیا تھا......تم نے دیکھا نہیں کہ اس کی ٹھوڑی پر زخم تھا جاتے وقت......‘‘

میں ہکا بکا رہ گیا...... جب آفتاب رخصت ہوا تو واقعی اس کی ٹھوڑی پر تازہ زخم کا نشان تھا...... اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پر وہ حیات کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ جانتی تھی۔''[۳۲]

سیمی کے عشق نے اسے عرفان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔

''ایک بات بتاؤں۔''

''کہو......''

''زیبا حاملہ ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''بس مجھے پتہ چل جاتا ہے۔ پہلے ہی...... مجھے ہوتا ہے ناں پتہ...... وہ آج کل سونف کھاتی ہے سارا دن...... ہتھیلی پر لیے پھرتی ہے سونف......''

''چپ کرو''

''مجھے نظر آتی ہے زیبا...... میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی Pregnancy کے ساتھ۔''

''لیکن تم نے تو اسے دیکھا نہیں۔''

''دیکھا ہے دیکھا...... ہے میں تو اسے فوراً پہچان لوں لاکھوں میں۔''[۳۳]

قیوم کے ساتھ سیمی کا تعلق بہت انوکھا اور منفرد تھا۔ سیمی اسے اپنا دوست، غمخوار اور ہمراز سمجھتی تھی۔ آفتاب سے بچھڑنے کے بعد سیمی کے لیے قیوم ایک جذباتی سہارا تھا۔ قیوم اپنے اور سیمی کے تعلق کے بارے میں کہتا ہے:

''میں اس کا کریڈٹ کارڈ تھا، جسے دکھا کر بھنوا کر وہ ہمیشہ آفتاب حاصل کرتی تھی۔ میں ہز ماسٹرز وائس تھا۔ جونہی اس کی سوئی مجھ پر پڑتی، میں آفتاب پکارنے لگتا۔ اس سے پرے کچھ نہ تھا۔ اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس کے سامنے بالکل بے بس تھا۔''[۳۴]

سیمی کا قیوم سے تعلق محض آفتاب کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے تھا۔

''شکر ہے لاہور میں تم ہو قیوم...... اگر تم نہ ہوتے تو میں آفتاب کی باتیں کس سے کرتی۔ تم

میری بڑی ضرورت بن گئے ہو قیوم...... سچی میں کسی حیدر کے ساتھ اب نہیں رہ سکتی...... کیا کسی وقت آفتاب بھی مجھے اسی شدت سے یاد کرتا ہوگا؟''

''شاید کچھ اور لوگ تمہیں اس طرح یاد کرتے ہوں؟''

''مثلاً؟''

''مثلاً میں......'' میں نے جرأت کے ساتھ کہا۔

اسے ملک کی سیاست، مہنگائی، ریلوے اور پی آئی اے کی ٹکٹ ریٹس، سکول کالجوں کے نتیجے، اغوا ڈکیتی چوری کی وارداتیں، فلموں کے اشتہار، نئی کاروں میں کوئی دلچسپی نہ تھی...... وہ کسی بیرونی انڈیکس کو نہ پہچانتی تھی۔ اسی طرح میری محبت کا ذکر بھی جملہ بیرونی حادثات میں سے ایک تھا۔ ایسے میں وہ روہانسی ہوکر غائب ہو جاتی...... اس کے قلب کا شٹر بند ہو جاتا اور اصلی سیمی اپنا آپ چھپا کر کہیں اوپر لفٹ میں چلی جاتی۔ جب کبھی میں اس سے گلہ کرتا کہ وہ بھی میرے لیے ویسے ہی ضروری ہے جیسے آفتاب اس کے لیے تھا تو وہ مجھے تھپتھپانے لگتی۔ ایک ایسی نادار ماں کی طرح جو بچے کی ضد پوری نہ کر سکتی ہو اور روتے بچے کو تھپک تھپک کر سلانے لگے۔ پھر کسی طرح آفتاب کے بٹن پر میرا ہاتھ پڑ جاتا۔ سیمی کی لفٹ نیچے آنے لگتی......

صرف آفتاب کے استقبال کے لیے۔ (۳۵)

پھر سیمی اور قیوم کے رشتے میں جسمانی رفاقت کا بانجھ تعلق قائم ہوگیا۔

''کافور کے درخت تلے سیمی سے میں ہمیشہ کے لیے منسلک ہوگیا۔ جیسے اسی کے جسم کا حصہ تھا اور وہ اپنے آپ کو میری تحویل میں دینے کے باوجود الگ تھلگ رہی...... جیسے بنک کا ٹوکن...... آپ کی مٹھی میں ضرور ہوتا ہے لیکن آپ کی ملکیت نہیں ہوتا......'' (۳۶)

اس بانجھ رفاقت اور تعلق کو سیمی نے آفتاب سے بدلہ لینے کا ایک ذریعہ بنالیا۔

''جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب اسے فکر نہ تھی کہ کون اس کوڑے کے ڈھیر پر اپنی غلاظت پھینکتا ہے۔ اپنا جسم میرے سپرد کرنے سے

پہلے وہ ملامتیہ فرقے میں شامل ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر سے بے دیار ہوگئی......جس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے، ہم مکمل طور پر کھوکھلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ سیمی کبھی میری نہ ہو سکے گی۔ وہ غالباً سمجھتی تھی کہ اپنے ساتھ میری لعنت لگا کر اس نے آفتاب سے بدلہ لے لیا ہے۔شاید وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے ہی اپنی ذات کو کچھ دیر کے لیے بچا سکتی تھی۔'' (۳۷)

سیمی، آفتاب کی محبت میں دربدر ہوئی۔اس نے ایم اے کیے بغیر کالج چھوڑ دیا۔ پہلے راولپنڈی میں ایک ٹریولنگ ایجنسی میں نوکری کی، آفتاب کے لندن چلے جانے کے بعد نوکری چھوڑ کر لاہور آ گئی اور وائی ڈبلیوسی اے میں کمرہ لے کر رہنے لگی۔ وہ ایک بے سمت اور بے مقصد زندگی گزار رہی تھی۔اس کی روح کے اندر ایک ریگستانی سفر جاری تھا۔سیمی باہر سے بالکل بے حس تھی لیکن جذباتی سیڑھی پر اس کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔وہ اپنی محبت میں کئی ریگستان چھان چکی تھی۔ اس کی روح نڈھال ہو چکی تھی۔

''شام پڑنے لگی تھی اور ہم نے دس گیارہ بجے سے یہاں ڈیرے ڈال رکھے تھے...... یکدم مجھے شام کی روشنی میں سیمی کی آنکھیں املتاس کے پھولوں کی طرح زرد نظر آنے لگیں۔'' (۳۸)

سیمی شدید بیماری کی وجہ سے کوما میں چلی گئی اور پھر جینے کی خواہش کے خاتمے پر موت کے منہ میں چلی گئی۔سیمی عشق کی لاعلاج بیماری میں مبتلا تھی اور اس کا ایک ہی علاج تھا۔اس نے موت کو گلے لگا کر ان تمام اذیتوں اور عذابوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا جن کے نیچے دَب کر وہ زندگی بھر کراہتی رہی تھی۔سیمی کی موت کی خبر اخبار میں اس طرح چھپی:

''میں نے غور سے خبر پڑھی۔لکھا تھا کہ یوسی ایچ میں زیرِ علاج ایک تعلیم یافتہ لاوارث لڑکی نے اپنی بیماری سے تنگ آ کر سلیپنگ پلز کھا لیں۔تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ایک معزز بیوروکریٹ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پوسٹ مارٹم کرنے پر ہسپتال والے اس نتیجے پر پہنچے کہ موت طبعی نہیں تھی۔ مریضہ نے زیادہ تعداد میں سلیپنگ پلز کھا لی تھیں۔

عشقِ لاحاصل کی طبعی موت! خودکشی! دیوانہ پن کی معراج۔'' (۳۹)

سیمی عام روِش سے ہٹا ہوا کردار ہے جو گلبرگی معاشرے کی کج روی کا نتیجہ ہے۔اس نے جس معاشرے میں آنکھ

کھولی وہ تضادات کی آماجگاہ ہے۔ وہ حرص وہوس میں گرفتار ایک اعلیٰ گھرانے میں پیدا ہوئی جبکہ خود وہ ایک حسّاس اور ذہین لڑکی ہے۔ گھریلو زندگی سے اسے وہ جذباتی آسودگی حاصل نہ ہوسکی جس کی وہ ہمیشہ طلبگار رہی۔ اس کی جذباتی ناآسودگی نے ہمیشہ اس کی روح کو مضطرب و بےچین رکھا۔ آفتاب کی محبت نے وقتی طور پر اِس خلا کو پورا کیا لیکن اس کی محبت چھن جانے کے بعد وہ جس خلا کا شکار ہوئی وہ اس کی پوری زندگی پر محیط ہوگیا۔ اسی خلا میں اس کی زندگی بھٹکتی رہی اور پھر خودکشی کے ذریعے ہمیشہ کے لیے اس میں کھوگئی۔ سیمی نے تضادات سے بھرپور معاشرے میں آنکھ کھولی۔ اس کا حسّاس دل معاشرتی زوال اور عہد کے انتشار پر کڑھتا ہے۔ وہ کہتی ہے:

''غور کرو......سوچو ذرا...... تجزیہ کرو ساری سچوایشن کا۔ پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ ۴۷ء میں جوان تھا اور غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ادھر آکر یعنی ادھر پاکستان میں Migrate کرنے کے بعد سوسائٹی کے ہر خلا کو پُر کیا۔ چونکہ ہندو سے مقابلہ نہ تھا، اس لیے یہ طبقہ، یہ Ambitious طبقہ بہت آگے نکل گیا۔ اس نے قیوم...... ذرا غور سے سوچو، اس طبقے نے افسر شاہی کی وہ روایتیں اپنائیں جو انگریز کی تھیں۔ اس نے وہ تجارت پیشہ پیدا کیے جو آج Business Magnets ہیں۔ اس نے ان بینکروں کو جنم دیا جنھوں نے سارے ملک کو نوٹ زدہ کردیا...... اس طبقے سے وہ پروفیسر اُٹھے جنھیں تعلیم سے زیادہ گریڈوں کی فکر تھی۔ وہ ڈاکٹر سامنے آئے جو بیرونی ممالک میں اس لیے عمریں گزارتے ہیں کہ وہاں پیسہ زیادہ ہے...... اس طبقہ ہی سے وہ دانشور پیدا ہوئے جن کی اپنی کوئی Conviction نہیں۔ ان کی سوچ چاہے سرخ چین سے آئے یا سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی اپنی نہیں ہوتی۔ Greed میں مبتلا یہ لوگ ہمیں ایک ہی میراث دے سکتے ہیں، Conflict، اندر کا تضاد، حالات کا تضاد، شخصیتوں کا تضاد...... تم کیوں چاہتے ہو میں اس گھر میں واپس چلی جاؤں جہاں سے اور کچھ نہیں مل سکتا، سوائے تضاد کے۔'' (۴۰)

سیمی کی شخصیت نے اس تضاد زدہ معاشرے سے کج روی اور Conflict کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ سیمی نے جس خاندان میں پرورش پائی وہاں کی اقدار حرص وہوس اور مادّہ پرستی سے پھوٹتی ہیں۔

''یہ لوگ...... یہ پاکستان بنانے والے میرے ماں باپ جب اِدھر آئے، پاک سرزمین پر

تو......تو یہاں آ کر اُن لوگوں نے جفاکش محنتی بیویاں بیاہیں...... نیا ملک بسانے کے لیے......اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لیے...... یہ عورتیں مردوں کو مجازی خدا سمجھتی تھیں۔ انہوں نے مردوں کا ساتھ دیا۔غریبی دور ہوتی گئی...... جیسے روشنی قریب آتی جائے تو سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے......لیکن Ambitious آدمی کو یہ مار ہوتی ہے قیوم، وہ کسی جگہ جا کر حد مقرر نہیں کرسکتا۔ان لوگوں کے بینک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں۔لیکن یہ مرض الحرص میں مبتلا لوگ کمائے جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں گھروں میں ہیں پر یہ عشق کیے جاتے ہیں......تمہیں پتہ نہیں I have gone through all۔'' (۴۱)

سیمی نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ قدروں کی شکست وریخت اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار گھرانہ ہے۔ ماں اور باپ کے تعلقات میں گرمجوشی اور محبت کا رِشتہ ختم ہو چکا ہے۔ان دونوں کے رشتے میں پڑنے والی دراڑوں سے گھر کی فضا مکدر ہو چکی ہے۔

''تمہیں اپنے والدین پر ترس نہیں آتا۔''

''آتا ہے...... بہت آتا ہے۔ دراصل تعلیم یافتہ اولاد کبھی والدین کے ساتھ رہ ہی نہیں سکتی......ہم تینوں اکٹھے رہنے کے Process میں ایک Saturated پوائنٹ پر آ گئے تھے۔''

''یہ کیا فلسفہ ہے۔''

''سانجھی فیملی لائف میں ہر روز گھر کا ہر فرد کچھ نہ کچھ Pool کرتا ہے۔مالی، جذباتی، روحانی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہر شخص معذور ہو جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ Pool نہیں کرسکتا یہ Saturated کیفیت Crystals کو جنم دیتی ہے۔ پہلے خاندان محلول ہوتا ہے پھر دانہ دانہ ہو کر بکھرنے لگتا ہے۔گھر کی اس حالت کو چھوڑ کر بھاگتا ہے......افسوس پناہ کہیں بھی نہیں ملتی۔'' (۴۲)

سیمی کا بیوروکریٹ باپ اپنی بیٹی کو آسائش کی زندگی تو مہیا کرسکتا ہے لیکن اس کی جذباتی زندگی کے مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ باپ کا روایتی کردار جس سے احساسِ تحفظ، محبت وشفقت، فکری و ذہنی رہنمائی اور گھرانے کی سربراہی کا

تصور وابستہ ہے، اس گھر میں ناپید ہے۔ گھر کے تینوں افراد میں ذہنی و جذباتی ہم آہنگی ٹوٹ چکی ہے۔ سیمی کو باپ کی محبت مالی معاونت کی صورت میں تو حاصل ہے لیکن جس توجہ اور جذباتی سہارے کی اسے ضروری ہے وہ باپ مہیا نہیں کر سکتا۔

''بیوقوف آدمی ...... پاکستان کا اونچا بیوروکریٹ یہ تھوڑی سوچتا ہے کہ اس کی بیٹی کے کچھ مسائل ہیں......اس کے اپنے مسائل کی ذاتی کھیپ اتنی زیادہ ہے کہ وہ کسی کے متعلق کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔ جب پاپا صبح اٹھتے ہیں تو ان کے دماغ میں آفس، فائلیں، اپنی ساکھ، پوزیشن، سٹیٹس...... اَن گنت مسئلے ہوتے ہیں۔ دفتر پہنچ کر وہ کام نہیں کر سکتے۔ وہاں بھی فون کالز، میٹنگیں، میل ملاقاتی، دفتری مسائل میں وقت گزرتا ہے۔ شام کو اپنی برادری کے ساتھ Communication، فنکشنوں کا جائزہ، اپنی ساکھ کو مزید تقویت دینے کے مسائل ہوتے ہیں۔ احمق آدمی اتنے سارے ملبے میں اگر کبھی اسے مسرت کی تلاش بھی کرنی پڑے تو وہ بیٹی کے پاس بھاگا بھاگا تھوڑا آئے گا...... وہ کسی نوجوان لڑکی کو نہ تلاش کرے گا۔''(۴۳)

باپ کی شفقت و محبت اور توجہ کی کمی نے سیمی کے اندر احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے۔ اس تشنگی نے اس کی ذات کو شدت پسند بنا دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

''مجھ سے میرے گھر والوں کی بات نہ کرو...... یہاں مصیبت ہی ان لوگوں نے پیدا کی ہے......''(۴۴)

ماں کے روایتی کردار کی عدم موجودگی نے سیمی کے اندر احساسِ محرومی پیدا کیا ہے۔ وہ ایسی ماں کی متلاشی ہے جو اپنی آغوش میں لے کر اُس کی جذباتی آسودگی کا سامان مہیا کر سکے۔ لیکن جو ماں اس کے گھر میں موجود ہے وہ اس فریضہ کو ادا نہیں کر سکتی۔ ماں کے حقیقی وجود کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا نے سیمی کی شخصیت کو منتشر کر دیا ہے۔

''تمہارا جی نہیں چاہتا ماما سے ملنے کو؟''

سیمی دُکھ سے ہنسنے لگی۔

''چاہتا ہے......لیکن جس ماں کو میں ملنا چاہتی ہوں وہ کہیں موجود نہیں ہے...... میں گلبرگ کی ایک سجی سجائی کوٹھی میں کسی بوڑھی خوفزدہ بھتنی سے ملنے نہیں جا سکتی۔''(۴۵)

ماں اور باپ کے غیر روایتی مصنوعی کردار نے سیمی کی شخصیت کو غیر متوازن بنا دیا تھا۔ وہ کھوکھلی گھریلو زندگی سے دلبر داشتہ ہو کر ہوسٹل میں رہتی ہے۔ خاندانی زندگی کے مرکز سے آزاد ہو کر آوارگی سیمی کا مقدر بن گئی۔ اس کے ذہن میں کسی سماجی اور اخلاقی قدر کا کوئی تصور موجود نہ رہا۔ وہ صرف اور صرف اپنے منہ زور جذبوں اور نفس کی تابع تھی۔ جہاں اس کی آشفتہ خیالی اسے لے جاتی وہ اس راہ پر چل پڑتی۔ اس کی اوّل و آخر قدر محبت تھی۔ یہی اس کا پیر و مرشد اور یہی قبلہ و کعبہ تھی۔

سیمی گلبرگ کے آزاد اور ماڈرن معاشرے کی آزاد خیال لڑکی تھی۔ جدید تعلیم نے بھی اس کی روشن خیالی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ سیمی کی جنسی بے راہ روی کے اسباب اوّل تو اخلاقی قدروں کی عدم موجودگی میں تلاش کیے جا سکتے ہیں، دوم جدید مغربی تعلیم نے اس کے اندر جسم کی حرمت کا تصور ختم کر دیا تھا۔

> ''یہاں سیمی سے میرا نیا تعلق پیدا ہوا۔ جسمانی رفاقت کا بانجھ سفر۔ سیمی کو اپنی پرواہ نہ تھی۔ وہ آفتاب کے بعد کس کی تھی، کیوں تھی؟ اس بات کی اسے خبر نہ تھی۔ دراصل مغربی تعلیم نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی منفرد وفا پیدا کر دی تھی جس کا تعلق صرف روح سے تھا۔ اسے جسمانی تعلقات کی رتّی برابر پرواہ نہ تھی۔''(۴۶)

سیمی کے اخلاقی زوال کی جڑیں، خاندانی زندگی، مادہ پرست معاشرہ، کھوکھلے اور تضادات سے بھرپور گلبرگی کلچر اور جدید مغربی تعلیم میں موجود ہیں۔ اس پر مستزاد عشقِ لاحاصل کی واردات جس نے اس کی اخلاقی بنیادوں کو بالکل ہی ملیامیٹ کر دیا۔

عشقِ لاحاصل کی واردات نے سیمی کو منفی اور مثبت دونوں طرح سے متاثر کیا۔

عشق کی مثبت قدروں نے سیمی کو خود شناسی و خود آگاہی عطا کی۔ عشق کے استغراق سے سیمی نے ذات کی پہنائیوں میں اتر کر تیسری روشن آنکھ کو دریافت کیا۔ عشق نے اس کی حسّیات کو جگا کر اِس کے مثبت خصائص کو اُجاگر کیا۔ عشقِ لاحاصل سیمی کے لیے قلبِ ماہیت کا عمل ثابت ہوا۔

> ڈرتے ڈرتے میں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔
>
> ''تمہاری اس خوبی کا کالج میں تو پتہ نہیں تھا کسی کو......''
>
> ''تب مجھ میں یہ خوبی تھی ہی نہیں...... یہ Sensivity مجھ میں اب پیدا ہوئی ہے...... آفتاب کو کھو کر......''

''لیکن کیسے کیسے...... کیسے تمہیں ان باتوں کی اطلاع ہوتی ہے؟''

''محبت کرنے والے دِلوں پر کئی بھید کھلتے رہتے ہیں آپی آپ قیوم......آپی آپ......''

عشق کی دیوانگی سے سیمی نے روحانی ارتقاء ضرور حاصل کیا لیکن اس کی دیوانگی مثبت سمت برقرار نہ رکھ سکی۔سیمی کی شخصیت میں ایسی منفی قدروں کی آمیزش ہے جو اس کے روحانی سفر کو کھوٹا کر دیتی ہیں۔اس کے پاس عشقِ لاحاصل کی مقدس دیوانگی تو موجود تھی لیکن اخلاقی پراگندگی نے اسے عرفان کی منزلوں تک نہ پہنچے دیا۔سیمی کے ناجائز جسمانی تعلق نے اس کے روحانی عمل کو زمین میں اَرتھ کر دیا تھا۔

سیمی کو ماں باپ اور معاشرے کی طرف سے کھوکھلی، شکستہ اور متضاد اِقدار ورثے میں ملی تھیں۔اس کی ذہنی اور جذباتی تربیت ایسی نہیں تھی کہ وہ عشقِ لاحاصل کی جنوں خیز واردات سے سنبھل پاتی۔اس کے بچپن کی محرومیوں اور تشنگیوں نے اس کی ذات کو پہلے ہی ریزہ ریزہ کر رکھا تھا۔عشق کی ہلاکت خیزی نے اسے بالکل ہی اَدھ موا کر دیا۔اس کربناک دور میں قیوم نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن چونکہ قیوم خود بھی اخلاقی و روحانی قدروں سے عاری فلسفہ زدہ نوجوان ہے اس لیے وہ بھی اس کڑے وقت میں سیمی کی ذات کو توڑ پھوڑ سے بچا کر صحیح سمت کی طرف اس کی رہنمائی نہ کر سکا۔سیمی کے عشقِ لاحاصل کا معراج، دیوانہ پن، رزقِ حرام کی آمیزش سے تعفّن کی شکل اختیار کر گیا تھا۔محبت میں ناکامی کے بعد سیمی ہر وقت تلملائی رہتی تھی۔کبھی حسد میں جلتی، کبھی نفرت میں اس کی زخمی اَنا کو خوش اعتمادی کا مرہم چاہیے تھا اور اِس مرہم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے قیوم کے ساتھ ایک مردار تعلق قائم کیا۔اپنی بےقرار و بےچین روح کے قرار کے لیے اس نے سچائی کے رستے کو خیرباد کہا اور یہی اس کا سب سے بڑا احرام فعل تھا جس نے اس کی روح کی پاکیزگی کو آلودہ کر کے اس کی دیوانگی کو منفی سمت میں موڑ دیا۔سیمی کو مقطر اور طیّب محبت کی ضرورت تھی لیکن اس کے بجائے حاصل ہونے والے جنسی تجربے نے اسے قلبی تھکن اور ذہنی پراگندگی سے دوچار کر دیا تھا۔اس کی بےچینیوں اور اضطراب کا نتیجہ خودکشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

سیمی کے دیوانے پن کا معراج خودکشی تھی۔اس کا دیوانہ پن مقدس نہ ہو سکا، وہ فرہاد کی طرح دودھ کی نہر نہ بہا سکا، ماؤنٹ ایورسٹ فتح نہ کر سکا، اسے دنیا کا عرفان حاصل نہ ہو سکا کہ وہ شاعری، مصوری، موسیقی اور آرٹ کو جنم دے سکتی۔اس کی قوت تیز تھی اور اسے دنیا بھی درکار نہ تھی لیکن اس کا دیوانہ پن عرفان کی حدوں کو نہ چھو سکا کیونکہ وہ حرام خوری کی مرتکب ہوئی۔اس کے عشق کی قوت مقبض ہوئی اور اس نے خودکشی میں رہائی پانے کی راہ اختیار کی۔

قیوم

قیوم موجودہ عہد کی پڑھی لکھی گم گشتہ روحوں کا نمائندہ ہے۔ وہ ایک حسّاس، متفکر اور اندروں بیں انسان ہے۔ اسے زندگی میں تلخیوں، محرومیوں اور نارسائیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

قیوم بنیادی طور پر ایک دیہاتی ہے۔ آبائی پس منظر، خاندانی حالات اور نجی زندگی کی نارسائیوں نے اسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ قیوم بچپن ہی سے تضادات کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے فکری الجھاؤ کا ایک بڑا سبب اس کی ابتدائی تعلیم بھی تھی جو بعد میں احساسِ کمتری کا باعث بنی۔ قیوم کہتا ہے:

> ''سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی، لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔ ہر غلام رسول بچوں کو جینئس ...... کی کتابیں پڑھا کر عام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ خاص لوگوں کی تعلیم اور عام لوگوں کی دادا گیری۔ میرے دل کی بنچ پر ماسٹر غلام رسول کے ساتھ کئی قد آور شخصیتیں کھڑی تھیں۔ اسی تضاد کے باعث میں عمر میں بڑھنے کے باوجود اندر سے نہ بڑھ سکا۔ اور میری شخصیت اس درخت جیسی ہو گئی جسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔
>
> میں اسی لیے اس قدر محتاط تھا کہ کبھی کبھی بے عمل ہو جاتا۔ تجزیے کی حد تو ٹھیک ہے لیکن عملی زندگی میں بھی سیدھے راستوں کی بجائے میں پگڈنڈیوں پر آوارہ کتوں کی طرح سرگرداں رہتا۔ مجھے کس ایسے گرو کی تلاش تھی جو مجھے کھینچ تان کر اپنے علم جتنا بڑا کر دے۔ لیکن سکول کے بعد ایک اور ماسٹر غلام رسول مل گئے۔''(۴۷)

قیوم کو کالج میں جن اساتذہ سے واسطہ پڑا وہ خود تضادات کا شکار تھے۔ ان کی متصادم اقدار نے قیوم کے ذہن کو الجھاؤ کا شکار کر دیا۔ ایسے ہی ایک استاد کا ذکر کرتے ہوئے قیوم کہتا ہے:

> ''ان سے میری ملاقات بی اے کے پہلے سال میں ہوئی۔ پروفیسر تنویر فارن سگریٹ پیتے۔

ان کے تھری پیس سوٹ بے داغ ہوتے۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک ہوتی۔ کلاسوں کے علاوہ وہ ہمارا ٹٹوریل بھی لیتے تھے۔ انہوں نے بھی اَن گنت کتابیں پڑھی تھیں۔ ان کا مطالعہ مجھے مرعوب کرتا تھا۔ کیونکہ میری اوّلین تعلیم دیہاتی تھی اس لیے میں فیوڈل نظام پسند کرتا تھا۔ وہ پکے سوشلسٹ تھے...... تھیوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مصیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کرتے...... بی اے کے پہلے سال میں انہوں نے مجھے منہ کے بل گرا لیا۔ لیکن ایک سال ان کا سایہ بنے رہنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ایک اور قسم کے ماسٹر غلام رسول ہیں...... وہ دل سے سوشلسٹ تھے لیکن صرف کتابی طور پر...... ان کا رہنا سہنا، ملنا ملانا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کی سی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ نہ اپنے سوشلسٹ نظریے پر تنقید برداشت کرتے تھے، نہ اپنی طرزِ زندگی پر۔ اگر کوئی تضاد اُن کے شاگردوں کی نظر پڑ جاتا اور وہ اس پر رائے دے دیتے تو پروفیسر تنویر سختی کے ساتھ اُس آزادیٔ رائے کی سرکوبی کرتے، جس کے وہ پرچارک تھے۔'' (۴۸)

دیہاتی پس منظر اور روایتی تعلیمی استعداد کے ساتھ جب قیوم یونیورسٹی میں داخل ہوا تو احساسِ کمتری نے اسے گھیر لیا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیسر سہیل کی قابلیت، مکمل شہری لڑکی سیمی شاہ اور مالدار خاندانی پس منظر رکھنے والے خوبرو آفتاب سے وہ بے حد متاثر ہوا۔

قیوم لاشعوری طور پر اِس کوشش میں مصروف رہنے لگا کہ وہ اپنی علمیت سے پروفیسر سہیل پر اور محبت سے سیمی شاہ پر اپنی برتری ثابت کر سکے۔

''پروفیسر سہیل مختلف اور عجیب تھا...... میری شخصیت پر کسی نہ کسی غلام رسول نے اپنی مہر لگا رکھی تھی...... اس لیے بچے کی طرح سادہ، کسی گنوار کی طرح متحیر اور کسی مسخرے جیسے ہنسوڑ پروفیسر سہیل کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تعارفی کلاس میں ہی مجھے اپنی علم دوستی سے گلہ پیدا ہو گیا۔ مہاتما بدھ کی دھاما پادھا سے لے کر موجودہ دَور کے تازہ ترین علم پیرا سائیکالوجی تک جو کچھ پیش آیا تھا، اس سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔ کاش میں بھی سادہ سلیٹ ہوتا...... پچھلا لکھا ہوا مٹا سکتا اور پروفیسر سہیل کی دی ہوئی assignment کو اسی تازگی سے لکھ سکتا جس کی

وہ ہم سے توقع رکھ رہے تھے۔ حالانکہ ابھی میں نے مضمون نہیں لکھا تھا، لیکن ابھی سے انہیں مایوس کرنے کا دُکھ مجھے تھا۔

آفتاب کے حسن اور پروفیسر کے علم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بعد میں نے تیسرا سجدہ سیمی شاہ کو کیا...... غالباً اس میں اس کلچر کی جیت تھی جو دیہاتی لوگوں کو میسر نہیں آتا۔ اب میری اَنا کا مسئلہ تھا کہ میں اس لڑکی کو پچھاڑ دوں اور اسے دیہاتی بیک گراؤنڈ میں گھسیٹ کر لے جاؤں جہاں وہ میری وجہ سے پچھاڑ کھا کر گرے اور مکمل طور پر دیہاتی ہو جائے۔

پھر اُس کے صبح و شام ماں کی طرح لسّی پیتے، دودھ دوہتے، چرخہ کاتتے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے صَرف ہوں۔'' (۴۹)

قیوم تعارفی کلاس والے دن سے سیمی شاہ کی محبت میں مبتلا ہوا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سیمی، آفتاب سے محبت کرتی ہے۔ وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

''جوں جوں ان دونوں میں فاصلے کم ہوتے گئے، اتنا ہی بلاوجہ...... بغیر سوچے سمجھے اور اپنی بہتری کے خلاف میں سیمی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ دل بھی عجیب چیز ہے جب ماننا نہ چاہے تو لاکھ ثبوت پیش کرو، ہزاروں دلائل ہوں کچھ نہیں مانتا۔ آفتاب اور سیمی ساتھ ساتھ بیٹھتے تھے۔ ان کے نوٹ سانجھے تھے۔ کتابیں ایک تھیں، وہ ایک پن سے باری باری لکھتے تھے، موٹر سائیکل پر میں نے انہیں آتے جاتے کئی بار دیکھا، کیفے ٹیریا پر وہ ایک گلاس میں دو سٹرو ڈال کر مشروب پیتے، کالج میں تمام ایک کی خیریت دوسرے سے پوچھتے، اس کے باوجود مجھے شبہ تک نہ تھا کہ سیمی آفتاب سے محبت کرتی ہے...... کیونکہ میرا دل اس بات کی گواہی دیتا رہتا تھا کہ یہ سب چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔'' (۵۰)

سیمی کا قلبی رشتہ آفتاب سے بندھا تھا۔ وہ قیوم کو دوست تو رکھتی تھی لیکن اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ آفتاب کی شادی کے بعد سیمی کو ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اسے اپنی اَنا کی تسکین کے لیے ایک جذباتی رشتہ درکار تھا۔ وہ خود قیوم سے کہتی ہے:

''جس وقت آفتاب مجھے چھوڑ کر لندن چلا گیا، میری selfesteem بہت مجروح ہو گئی

تھی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا کہ میں مری ہوئی چھپکلی ہوں جسے کوئی چمٹے سے بھی اٹھانا نہیں چاہتا......اگر تم مجھ سے محبت نہ کرتے......جسمانی محبت تو یہ میرا confidence کیسے بحال ہوتا۔،،(۵۱)

سیمی کسی سے آفتاب کی باتیں کرنا چاہتی تھی اور قیوم کو صرف سیمی کی قربت اور توجہ چاہیے تھی۔ اس امید پر کہ شاید کبھی سیمی اس سے محبت کر سکے۔

،،میں نے پورے دو سال اس لڑکی سے یک طرفہ محبت کی تھی......ایسی یک طرفہ محبت جس میں اتنی امید بھی نہ تھی کہ میری محبت کو قبول کر لیا جائے گا۔ اب آفتاب درمیان سے نکل گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ کافور کے درخت کا اثر تھا یا شاید جان بلب سیمی کے جسم کی خوشبو تھی...... میں نے اس سارے عشق کے اظہار کا ارادہ کر لیا جو ایک عرصے سے میرے دل میں دفن تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس اظہار سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا......نہ ہمدردی، نہ محبت۔ وہ کسی اور نیوکلیس کے گرد کسی اور محور پر گھوم رہی تھی......میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کی خاطر اپنی ذات کو مٹاتا رہوں گا وہ میرے وجود کو برداشت کرتی رہے گی لیکن جہاں سے میری ذات کے تقاضے شروع ہوں گے وہ دریا کنارے کھڑی سیاہ چشمہ لگائے ڈوبنے والی کشتی کا منظر دیکھ کر ہاؤ سویٹ کہے گی اور پیٹھ موڑ لے گی۔ اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس کے سامنے مجبور تھا۔،،(۵۲)

جب قیوم کو سیمی کی محبت حاصل نہ ہو سکی تو اس نے سیمی کے جسم پر شب خوں مارا۔ بقول قیوم:

،،میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل کو صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے۔،،(۵۳)

سیمی کے ساتھ قیوم کا جسمانی تعلق وہ فعل تھا جس نے قیوم کی سائیکی کو سخت مجروح کیا۔ جسمانی رفاقت کے بانجھ سفر نے قیوم کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ کئی طرح کی نفسیاتی بیماریوں کا شکار بن گیا۔ وہ Hallucination میں مبتلا ہوا۔ اس کی ذات دو حصوں میں بٹ گئی۔ وہ سیمی کا قرب حاصل کرنے کے لیے آفتاب کا روپ دھارنے کی شعوری و

لاشعوری کوشش کرنے لگا۔ سیمی کے دُہرے رویوں نے اس کے اندر تصادم کی کیفیت کو جنم دیا۔ اسے سیمی کے جسم پر تو دسترس حاصل تھی لیکن دل کی دنیا میں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس صورتِ حال نے اس کی ذات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

''میں نے خفگی سے کہا...... ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی۔''

''ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے۔ قیوم؟...... ہیں قیوم......''

میں چپ رہا۔

جہاں تک سیمی کا تعلق تھا، وہ مجھے چومتی ضرور تھی لیکن اسے مجھ سے محبت نہ تھی، کم از کم یہاں تک وہ سچی تھی۔ سیمی باوفا تھی کیونکہ وہ صرف احساسِ تشکر میں آ کر قیوم کے وجود کو برداشت کرتی تھی...... اور میں...... میں ان دونوں کے درمیان کیا تھا؟...... میں اپنے آپ کو کس کلاس کس گریڈ میں رکھتا؟...... شاید کرگس جاتی کے لوگوں کی کوئی category نہیں ہوتی......

اس وقت سفید سفید چادر میں ملبوس نو فٹ کا ایک آدمی مشعل لیے سامنے ایک جھاڑی سے نکلا۔ اس کے سر پر کوئی بال نہ تھا اور وہ دائرے میں چلتا تھا۔ اس نے تین مرتبہ اپنی مشعل اونچی کی اور پھر واپس جھاڑی میں گھس گیا...... اس وقت پتہ نہیں کیوں میرے اندر ایک گہرا گیان پیدا ہوا۔ جیسے استخارہ کر لینے کے بعد گومگو کی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ میرے اندر آفتاب نے گھس کر دو چار ہاتھ کراٹے کے مارے اور قیوم کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد میرے اندر آفتاب ایسے بھرتا گیا جیسے بوتل میں پانی...... سر کی اخروٹی ہڈی سے لے کر پیروں کی پیچیدہ ہڈیوں تک آفتاب بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس آفتاب کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا...... جس وقت وہ چاہتا چلا جاتا اور قیوم سٹینڈ ٹو ہو جاتا۔ جس وقت وہ آتا قیوم خود ہی ڈرائیور کی سیٹ چھوڑ کر پچھلی نشست پر جا بیٹھتا۔

اس رات کے بعد مشعل والے جن کو کھلی آنکھوں دیکھنا اور آفتاب اور قیوم کی ادبی بدلی سے لطف اٹھانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا...... (۵۴)

سیمی سے کھوکھلا جسمانی تعلق قیوم کی ذہنی و جسمانی ابتری پر منتج ہوا۔

''رات گئے تک میں کوٹھے کے بیرونی صحن میں ٹہلتا رہا...... چاندرات میں گھر کی چھت سے لگ کر جب چاند مجھے دیکھتا تو لمبے کرتے میں میرا سایہ گدھ کی طرح نظر آتا۔ میری انگلیاں ہونٹ دانت سب مسلسل سگریٹ نوشی کے باعث براؤن ہو چکے تھے۔ میں نے ان لمبی راتوں میں سیمی سے لے کر Abiogenesis تک ہر مسئلے پر دماغ کھپایا تھا۔ ان سوچوں کی وجہ سے میرے دماغ کی حالت بھوسے بھرے ہوئے مردار چیتے جیسی ہو چکی تھی......میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ دیر تک نوکری کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ اندر ہی اندر مجھے شبہ تھا کہ جس طرح میں رات رات بھر تصورِ جاناں کیے بیٹھا رہتا ہوں، یہ کیفیت مجھے زیادہ دن زندہ رہنے کی مہلت نہیں دے گی۔''(۵۵)

سیمی سے جسمانی تعلق کے بانجھ سفر نے قیوم کی روح کو پارہ پارہ کر دیا جبکہ اس کی موت نے اسے ذہنی وجسمانی لحاظ سے مکمل طور پر مفلوج کر دیا۔

''سیمی کی موت کے بعد میں اس حد تک پریشان ہو گیا کہ میرے تمام اعصاب متاثر ہو گئے۔ اگر اس وقت مجھے ریڈیو سٹیشن پر نوکری مل گئی ہوتی تو شاید میرے پاس معکوس سوچ کے لیے اتنا وافر وقت نہ ہوتا، لیکن اب میں سارا دن چرس کے سگریٹ پیتا، کبھی پلنگ پر، کبھی شہ نشیں پر، کبھی فرش پر اور کبھی باہر لارنس باغ میں جا لیٹتا۔ مجھ میں اٹھ کر چلنے پھرنے کی سکت کم ہو گئی تھی۔ میری تمام حسیات اور عمل اضطراری تبدیل ہو چکے تھے۔ کھلی آنکھوں میں مچھر گھس جاتے اور میں انہیں جھپکنا بھول جاتا۔ پانی حلق کے بجائے سانس کی نالی میں جا کر غوطے کی سی کیفیت پیدا کرتا۔ چلتے چلتے فرنیچر سے ٹکرانا اور ٹخنے، پاؤں کے انگوٹھے، گھٹنے زخمی کرنا میرا معمول تھا۔''(۵۶)

قیوم شروع ہی سے ایک نیم پختہ فلسفی تھا۔ کلاس میں وہ فلسفیانہ تجزیے کیا کرتا۔ وہ اپنی گفتگو کے دوران مختلف فلسفہ ہائے فکر کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اس نے علمی حیثیت سے ایم اے بھی کر لیا ہے۔ اس کا مطالعۂ کتب بھی وسیع ہے لیکن اس سے وہ کوئی تعمیری کام نہیں لے سکا۔ سیمی کے ساتھ جسمانی تعلق کے بنجر تجربے اور محبت میں ناکامی نے اسے فکری بے راہ روی پر ڈال دیا۔ محبت کی محرومی اس کی زندگی کی سب سے بڑی نارسائی ہے جس نے اس کی روحانی، ذہنی اور جسمانی دنیا کو جھنجھوڑ کر

رکھ دیا تھا۔ قیوم کا اپنی ماں کے ساتھ گہرا قلبی رشتہ تھا۔لڑکپن میں ماں کی موت اور اُس کی محبت بھری آغوش سے محرومی اور جوانی میں سیمی کی موت سے پیدا ہونے والی محبت کی محرومی نے اسے ذہنی خلفشار کی دلدل میں دھکیل دیا۔فکری افراتفری اور ذہنی انتشار اس کے وجود کا لازمی حصہ بن گئے۔

سیمی کی موت نے قیوم پر حزن و یاس کا ایسا غلبہ طاری کر دیا جس نے اسے اعصابی وجسمانی طور پر بالکل مفلوج کر دیا۔ وہ گیسٹرک السر کا مریض بن گیا۔اس کا اپنا وجود اس کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ابتر ذہنی حالت میں وہ سارا سارا دن بے مصرف گھومتا رہتا۔ایسے سوالات سے اس کا ذہن بھر جاتا جن کا کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

''سوالات کے چکر پہلے سیمی کے مرکزی حصے میں بند تھے اور اُس کی ذات سے وابستہ تھے۔ لیکن جس طرح سوئی ریکارڈر کے پہلے دائرے سے سفر کر کے دائرہ در دائرہ اندر کو سفر کرتی ہے، میری سوچ...... نیوکلیس سے نکل کر دائرہ در دائرہ بہت دور تک باہر کو پھیلتی جاتی اور آخر...... میں سوچتا رہ جاتا۔

میں کون ہوں؟

کہاں سے آیا ہوں؟

مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے؟

اور اگر مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا اور اسی مٹی میں نائٹروجن کی بھاری مقدار بن کر واپس لوٹنا ہے تو پھر یہ ساری تگ و دو کیوں؟...... یہ سارا عذاب کس لیے؟ کائنات کیا ہے؟ کائنات سے پرے کون بیٹھا ہے؟''(۵۷)

سیمی کی موت کے بعد وجود کی بے معنویت اس پر کھلنے لگی۔ وہ ایسے ذہنی سفر پر روانہ ہوا جس کی کہیں کوئی منزل نہ تھی۔ بے نام جستجو اور بے معنی تلاش سے اس کے اندر فکری انتشار پیدا ہوا۔ قیوم کی بے سمتی اس کی پریشاں خیالی کا سب سے بڑا سبب تھا۔ پروفیسر سہیل اس کی نفسیاتی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے کہتا ہے:

''دیکھو اگر کوئی آدمی زیادہ دیر تک بے سمت ہو کر پریشان رہے تو وہ دائمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اگر غم، دکھ اور ہیجان کی ایک نقلی سی وجہ بھی ہو تو وہ اس پر قابو پا لیتا ہے۔تم کو پتہ ہونا چاہیے کہ آخر اس پراگندگی اس Anxiety اس تذبذب کی اصل بنیادی وجہ کیا ہے؟......

اگر معلوم نہیں تو ایجاد کرلو آرام میں رہو گے.....''(۵۸)

پروفیسر سہیل نے اس کی پریشاں خیالی کے لیے یوگا کا علاج تجویز کیا لیکن یہ بھی فکری و ذہنی انتشار کم کرنے میں معاون ثابت نہ ہوسکا بلکہ یوگا کو بطور علاج سمجھتے ہوئے ایک شادی شدہ عورت عابدہ سے اس کا جسمانی تعلق قائم ہوا۔ وہ یوگا کے ذریعے اپنی روح کی پہچان چاہتا ہے اور اس جسمانی تعلق کو نروان حاصل کرنے کے لیے سیڑھی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

''سنو عابدہ! میں جستجو کی بات کر رہا ہوں اپنی جستجو...... اپنی روح کی جستجو...... اپنی بقا...... انسان کو تلاش ہے......اپنی......اپنے خدا کی۔''

''سنو عابدہ!...... جب کنڈالنی چوتھے چکر میں پہنچتی ہے تو اسے اناہاتا کہتے ہیں۔ یہ دل کا کنول ہے۔ اس کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ اس میں عارفانہ بارہ رستے ہیں۔ اس کنول کے وسط میں دو تکون ہیں......اگر آدمی یہاں دھیان لگائے تو اس میں کئی روپ دھارنے کی شکتی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کائناتی محبت پانے والا بن جاتا ہے۔ اسی راستے پر وہ نروان بھی حاصل کرسکتا ہے۔''(۵۹)

قیوم سمجھتا ہے کہ یوگا کے ذریعے اسے اپنے پریشان کن سوالات کا جواب مل سکتا ہے۔ وہ جسمانی تعلق کے ذریعے خود کو وقت اور موت دونوں سے ماوراء کرنے کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یوگا اس کی تلاش کے سفر کو منزل سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ لیکن عابدہ کے ساتھ جسمانی تعلق کا انجام بھی پہلے انجام سے مختلف نہ تھا۔ اس نے قیوم کی ذہنی و جسمانی ریختگی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

''شکتی اور شوا کا ملاپ میری کنڈالنی کو اپنے سفر پر روانہ نہ کرسکا۔ میری کنڈالنی حسبِ عادت ناف سے کہیں بہت نیچے بیٹھی پھنکارتی رہی۔ ریڑھ کے سفر پر ماڑو کے پہاڑ پر چڑھنے سے اس نے انکار کر دیا، لیکن بیکار جستجو کا ایک اور دروازہ کھول کر میں نے پہلے سے ٹنڈ منڈ درخت کو سردیوں کی یخ بستہ ہواؤں کے سپرد کر دیا۔ دیوانگی کی ایک اور سمت مجھ پر کھل گئی۔''(۶۰)

عابدہ کے ساتھ حرام جسمانی تعلق نے قیوم کی ابتر ذہنی حالت کو مزید اَبتری کی طرف موڑ دیا۔ اس کی بے سمتی،

لایعنی جستجو، بے معنی تلاش اور پریشاں خیالی پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ عابدہ کی رفاقت سے قیوم کی تنہائی بظاہر کچھ کم ہوئی لیکن اس کی روح کی تشنگی کا کوئی حل وہاں بھی موجود نہ تھا۔ عابدہ کے چلے جانے کے بعد اسے مزید تنہائی اور تشنگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ معنویت کی تلاش نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

''نئے پرانے زخم آہستہ آہستہ کھل رہے تھے، کئی سوال؟...... جو کئی دن سے مجھے ستاتے نہ تھے۔ آج دوبارہ پوری آب و تاب سے ابھر آئے تھے...... سوال بڑے بھنور میں چھوٹے طلاطم بن کر گھوم رہے تھے۔ کئی حقیقتیں، کئی عزائم، کئی جھوٹ کئی سوچیں آپس میں مشین کی سلائی جیسی جڑتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب سیمی کی تلاش نہیں تھی۔ اس کا مرنا ہولے ہولے حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن اس کی موت نے کئی سوالوں کو جنم دیا تھا۔ جس طرح مشین کے پرزے کھو چلے ہو کر آوازیں دیتے ہیں اور ان میں پہلے سی تیزی نہیں رہتی، ان سوالوں نے بے نام جستجو بے معنی تلاش نے مجھے ڈھیلا کر دیا تھا۔ اب زندگی کے پیٹرن پر چلتا ہوا اندر سے آوازیں دینے لگا تھا۔ عابدہ ہوتی تو یہ آوازیں مدھم ہو جاتیں۔ لیکن کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہوتیں۔ ان ہی نے مجھ پر عجیب قسم کی وارفتگی اور دیوانہ پن طاری کر دیا تھا۔''[۶۱]

عابدہ کے چلے جانے کے بعد اس نے زندگی کو ایک پیٹرن پر لانے کی کوشش شروع کر دی۔ ریڈیو اسٹیشن کی نوکری نے اس کے اندر کچھ نظم و ضبط پیدا کیا۔ یہاں اس کی ملاقات امتل سے ہوئی۔ امتل قلندرانہ مزاج رکھنے والی عمر رسیدہ طوائف ہے۔ اس کی قربت میں قیوم وقتی آسودگی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کی تنہائی کا علاج یہاں بھی نہیں ہے۔

تنہائی پسندی اور مردم بیزاری قیوم کی ذات کا خاصہ بن چکے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک وہ تنہائی کی اذیت سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اسے کوئی ایسا ساتھی نہ مل سکا جو اس کی روح کی تنہائی کا مداوا کر سکے۔ لڑکپن میں ماں کی موت سے چندرا گاؤں اس کے لیے بے معنی ہو گیا۔ ماں سے جذباتی وابستگی اسے ماموں کے در پر لے گئی۔ بی اے تک کی تعلیم اس نے گاؤں اور باپ کے خاندان سے دور رہ کر حاصل کی۔ اس دوری نے رشتوں کے لیے ایک حجاب اس کے اندر پیدا کر دیا۔ بھائی مختار، بھابھی اور ان کے بچوں کے لیے کبھی بھی اس کے دل میں محبت کے جذبات پیدا نہ ہو سکے۔ وہ خاندانی زندگی سے کٹ کر تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں نے اس کی تنہائی پسندی میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ عابدہ ایک مرتبہ اُس سے کہتی ہے:

''آپ نیچے کیوں نہیں آتے......سب لوگوں میں کیوں نہیں کھاتے پیتے؟''

''بس شروع سے میرا محاورہ نہیں ہے......میں کبھی رشتہ داروں میں بیٹھا نہیں، ان سے بات کرنے کا مجھے ڈھنگ نہیں آتا۔''

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ رشتہ دار مارے گا تو چھاؤں میں پھینکے گا۔'' (۶۲)

''یہ تمہاری کیا عادت ہے موٹر سائیکل نیچے دھرا اور بغیر سلام دعا اوپر......'' (۶۳)

عابدہ اور امتل کے ساتھ اس کا رشتہ تنہائی کے عذاب سے باہر نکلنے کی سعیِ لاحاصل تھی۔ قیوم کے اندر انسانی روح کی ازلی تنہائی پرورش پا رہی تھی اور کوئی انسانی رشتہ اور رابطہ اس کا مداوا نہیں کر سکتا تھا۔ قیوم رہ رہ کر تنہائی کے اذیت ناک تجربے سے دوچار ہوتا تھا۔

''میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آج میں نے اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور پہلی بار مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اور میں ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے اور اب جاننے کا وقت نکل گیا ہے۔ تیل اور پانی بہم رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں حل ہونے سے قاصر رہے۔ انسان کا بھی خوب المیہ ہے۔ کبھی کبھی کسی شخص سے پورا ربط بڑھا لینے کے بعد یکدم اسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ تو حل ہونے کے بجائے سطح پر بیٹھا رہا اور ذرا سی چھیڑ چھاڑ سے اوپر کارک کی شکل میں تیرنے لگا۔ ہر انسان کو کسی اور میں حل ہو جانے کی شدید آرزو ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ ساری عمر ہم جنسوں، ہم زبانوں، ہم وطنوں، ہم مشربوں میں گھومتا ہے، جھانکتا ہے اور رابطے جب بہت بڑھ جاتے ہیں تو ہر رشتے سے ایسی صدائیں آتی ہیں جیسے اندھے کنویں کی سطح سے جا کر خالی ڈول ٹکرائے اور شرمندہ شرمندہ ٹامک ٹوئیاں مارتا ہلکا پھلکا باہر کی طرف نکلنے لگے۔'' (۶۴)

امتل کے قتل کے بعد قیوم زبردست انتشارِ ذات کا شکار ہوا۔ Anxiety اور شدید Depression نے اس کے جسم کو بھی متاثر کیا۔ وہ بیک وقت السر اور Schizophrenia کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔

''جسمانی طور پر بھی میں نارمل نہ رہا تھا۔ سارا منہ کڑوا رہتا اور زبان پر کتھئی رنگ کا لیپ چڑھا نظر آتا۔ دن کے وقت میں ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق تھوڑے تھوڑے وقفے کے

بعد کچھ نہ کچھ کھانے کی کوشش کرتا لیکن سہ پہر کے قریب ایک غبار سا دماغ کو چڑھنے لگتا۔ پہلے معدے میں جلن شروع ہوتی، پھر جلن کا غبار بن کر سینے میں اوپر کی طرف اٹھنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرا دل بند ہو جائے گا......السر کی تکلیف کی وجہ سے میں بار بار ڈاکٹر کو ملتا...... میں Anxiety اور Withdrawal کی وجہ سے کبھی دوست نہ بنا سکا۔ کالج کے دوست تو چھوٹ ہی چکے تھے۔ اب ریڈیو سٹیشن سے بھی کوئی ملنے آجاتا تو میں یہ بہانہ بنا دیتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں...... جاگنے کا سماں سونے سے بھی نرالا تھا۔ صبح شیو کرتے وقت مجھے اپنی شکل یوں نظر آتی جیسے روشنی کی سفید کرن طیفِ منشوری میں سے نکل کر سات رنگوں میں بدل جاتی ہے۔ سادہ شیشے میں میری شکل کئی شکلوں میں منتقل ہو جاتی۔ کسی عکس میں مونچھ غائب ہوتی، کسی حصے میں بابر بادشاہ جیسی داڑھی نظر آتی۔ کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ اسٹک کا لیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی۔ کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہوتیں۔ آئینے میں نظر آنے والی صورتوں سے میں خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھتا، مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔" (۶۵)

قیوم اپنی جنونی ذہنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے ایک باکرہ لڑکی روشن سے شادی کرتا ہے۔ لیکن شادی کی رات اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ روشن کو تسلی دیتا ہے لیکن خود اس پر جنونی دورے پڑنے لگتے ہیں۔ وہ پانچ دن بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں آتا ہے۔ وہ روشن کو طلاق دے کر اپنے ہاتھوں سے اسے رخصت کر دیتا ہے۔ حیات و ممات کے سربستہ رازوں کی جستجو میں وہ اپنا دماغی توازن کھو رہا تھا۔

قیوم خود اپنی ذات کی تلاش میں گم ہے۔ زندگی کی راہ میں اسے بہت سے ایسے لوگ ملے جن کو اس نے نشانِ منزل بنانا چاہا لیکن وہ سب فریب تھا۔ بالآخر اس نے سائیں جی کی معیت میں روحانی سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آخری مراحل میں سائیں جی کی دھنسی ہوئی قبر نے یہ راستہ بھی گم کر دیا۔ یہاں قیوم کے لیے زندگی ایک بے مقصد سفر یا تلاش ہو جاتی ہے۔ جو بے سمت و بے منزل ہے اور جس کا حال اور مستقبل متعیّن نہیں ہے۔

بانو قدسیہ نے قیوم کو راجہ گدھ کا استعارہ بنایا ہے۔ ایک ایسا شخص جو مردہ آرزوؤں پر پلتا ہے اور زندہ لاشوں کے

ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ قیوم یہ جاننے کے باوجود کہ سیمی صرف آفتاب سے محبت کرتی ہے وہ اس کے ساتھ تعلقات بڑھاتا ہے۔ وہ سیمی کے ساتھ ہمدردی کا رشتہ پیدا کر کے اپنے آپ کو اس کے لیے قابلِ قبول بناتا ہے اور پھر اُس کے جسم کے ساتھ ایسا رشتہ استوار کرتا ہے جو ایک گدھ کا مردار کے ساتھ ہوتا ہے۔

> ''میں نے بازو پھیلا کر اُسے اپنے وجود کے ساتھ لپٹا لیا۔ راجہ گدھ کو ایسے لمحوں کا بہت انتظار رہتا ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کو بے فائدہ سمجھ کر اُس سے منہ موڑنے کی کوشش کرے۔''(٦٦)

سیمی کی موت کے بعد قیوم نے عابدہ اور امتل کے ساتھ جو تعلقات استوار کیے وہ بھی زندہ لاشوں کے ساتھ مردار رشتے ثابت ہوئے۔ اس نے جس جس کی تمنا کی ان سب کی آرزوؤں کا مرکز کوئی اور تھا۔ آخر میں شادی کر کے اس نے اپنی زندگی کو بظاہر ہموار راستے پر لانے کی کوشش کی تو وہ لڑکی بھی اس کے لیے زندہ لاش نکلی۔

قیوم کا کردار اخلاقی دیوالیہ پن اور روحانی بنجر پن کی علامت ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اسے جو حالات و واقعات پیش آئے ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ کہیں بھی ایک با کردار، اعلیٰ اخلاقی قدروں اور مضبوط قوتِ ارادی کا حامل انسان نظر نہیں آتا۔ وہ نارسائیوں اور محرومیوں کی سان پر چڑھ کر کردار کی تیغِ آبدار حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ ہمیشہ نفسی خواہشات کا اَسیر، بندۂ ہوا و ہوس بن کر نکلتا ہے۔

قیوم ایک درمیانے درجے کا فلسفی ہے، جس کی فکر اعلیٰ و ارفع آدرش کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے اسے ذہنی پراگندگی اور فکری انتشار کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس کی روح حیات و ممات کے سربستہ اسرار و رموز کی کھوج کے باطنی سفر پر روانہ ہوتی ہے لیکن اس کی جذباتی، ذہنی و جسمانی ریختگی اسے وجود کی وہ اکائی حاصل نہیں ہونے دیتی جس کی طاقت کے بل پر وہ روحانی سفر کی منزلوں پر پہنچ سکتا۔

ذہنی انتشار، فکری پراگندگی اور جسمانی شکستگی اسے روحانی طور پر بھی اپاہج بنا دیتی ہے۔

قیوم کے کردار کی نشو و نما میں اخلاقی قدریں کوئی کردار ادا کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ اس کی اخلاقی بنیادیں انتہائی کمزور اور دوغلی ہیں۔ اس کے بچپن میں اس کے اردگرد کوئی ایسی شخصیت موجود نہیں ہے جو اس کے قلب و ذہن کی تربیت روشن مذہبی قدروں کی بنیاد پر کر سکے۔ اس کے گاؤں میں مذہب صرف مسجد کے ملاّ کی ذہنی استعداد تک محدود تھا اور سارا گاؤں اسی سے استفادہ کرتا تھا۔ اس کا خاندان سیدھا سادا دیہاتی خاندان ہے جو مذہب کو چند عبادات اور رسوم تک محدود

سمجھتا ہے۔اس کے خاندان میں جن چند شخصیات نے اس کی ذہنی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا، ان میں اس کا باپ، ماں اور چچا شامل ہیں۔

قیوم کا باپ عام دیہاتی مردوں کی طرح اولاد کی تربیت اور پرورش میں چنداں دلچسپی نہیں لیتا۔اس کی زندگی کام کاج میں بسر ہوتی ہے۔وہ ایک سردمہر انسان تھا جبکہ قیوم ایک حسّاس اور ذہین بچہ تھا۔ماں کی محبت کی گرمی اسے باپ سے دور کر کے روحانی اور جذباتی طور پر ماں سے شدید وابستہ کر دیتی ہے۔

باپ کی سردمہری نے فاصلوں کو جنم دیا اور قیوم باپ سے دور چلا گیا۔

''ابا سے ملنے کو جی چاہتا، لیکن ہم دونوں بھائی ہمیشہ باپ سے دور دور رہے۔میرے ذہن میں ابا سانڈل بار کا سانڈ تھا جس کا جسم لَس لَس کرتا ہے جو کھیتوں میں کھڑا چرتا بے ضرر لگتا ہے لیکن کوئی کسان اسے کھیت سے نکالنے کی جرأت نہیں کرتا۔ پاس جانے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا۔''(٦٧)

ان ہی وجوہات کی بنا پر باپ بیٹے کے درمیان ہمیشہ اجنبیت کا پردہ حائل رہا اور قیوم کے دل میں رشتوں کا حجاب بیٹھ گیا۔

''کون ہے بھئی......'' ابا نے پاس آ کر کہا۔

پھر اور قریب آ کر اُس نے بازو پھیلائے۔لمحہ بھر کو بازو پھیلے رہے، پھر شرمندہ ہو کر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا...... ''قیوم آؤ کھڑے کیوں ہو......''(٦٨)

بنیادی طور پر قیوم ماں کے ساتھ جذباتی اور روحانی طور پر گندھا ہوا تھا۔

''اِس سے پہلے ماں کے کان میں کئی بالیاں تھیں لیکن آج اس کے تمام کان خالی تھے...... اس وقت میں ڈرتے ڈرتے ماں کے پاس گیا۔ چڑیوں کے آنے سے پہلے...... مجھے چڑیوں کے بلبلانے سے خوف آتا تھا۔

''تیری بالیاں کہاں ہیں ماں؟''

ماں نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں۔دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں قیوم......قیومی......''

ماں نے آنکھیں بند کرلیں اور آنسو اُس کے کانوں کی طرف بہنے لگے۔

''پتہ نہیں تو کب جوان ہوگا......کتنی دیر لگا دی تو نے جوان ہونے میں......''

''ہم دونوں جوان ہیں......دیکھ تو سہی''......میں نے گاؤں میں سن رکھا تھا کہ ماؤں کو بیٹوں کی شادی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

''تو ہماری شادی کرنا چاہتی ہے تو کردے۔''

وہ مسکرادی۔

اس روز کی مسکراہٹ کے بعد میں نے پھر ماں کو مسکراتے نہیں دیکھا......''جب تو جوان ہو جائے گا تو اپنے مامے کے پاس جانا......منظور الٰہی قصوری کے پاس......''

پہلی بار میں نے اپنے ماموں کا نام سنا۔

''تو مختار بھائی کو بھیج دے قصور......وہ تو بی اے میں پڑھتے ہیں، جوان ہیں۔''

''ہاں جوان ہے لیکن وہ اپنی دادی کی گود میں پلا ہے جہاں کہیں دادی کا بیر ہے وہاں مختار نہیں جاسکتا۔''(۶۹)

''مامے منظور کو بلالاؤں۔''

''ناں ناں، اس کا نام بھی مت لینا حویلی میں۔ تیرا باپ ناراض ہوجائے گا۔''

''تو اپنے گھر واپس کیوں نہیں گئی ماں، بول......بتا۔''

میں نے دونوں ہاتھوں میں ماں کا چہرہ لے کر پوچھا۔

''دیکھ کسی سے بات کرنا نہیں اچھا تیرا ابا ناراض ہو جائے گا......وہاں میرا اپنا کوئی نہیں تھا ناں......نہ ماں نہ باپ......یہ یہاں اتنے سال سسرال میں رہنے کے بعد پتہ چلا......وہاں منظور الٰہی تو تھا ناں۔''

اس کے بعد میں نے ماں کو بہت بلانا چاہا، لیکن وہ میری طرف پیٹھ کر کے ہولے ہولے روتی رہی......ماں کے مرنے کے بعد جب میں لیٹتا مجھے یوں لگتا جیسے اب بھی وہ میری طرف

پیٹھ کیے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی ہے......

جس روز ماں کا چالیسواں تھا، اس سے ایک رات پہلے میں نے چپکے سے چندرا کو خدا حافظ کہا۔

ماموں منظور الٰہی سے ملاقات کتنا چھوٹا سا واقعہ تھا...... لیکن اس نے مجھے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیں اور بی اے کرنے کے بعد تک میں چندرا نہ جا سکا۔ (۷۰)

قیوم کی ماں محبت کرنے والی عورت تھی۔ محبت کی یہی قدر قیوم نے ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ ماں کی موت سے قیوم اس واحد روحانی و جذباتی رشتے سے محروم ہو گیا جو زندگی میں اس کے لیے ایک ہی بار قائم ہو سکا تھا۔ آئندہ زندگی میں وہ اسی مثالی رشتے کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن اسے بانجھ رشتوں کے سوا کچھ نہ مل سکا۔

قیوم کی روح ہمیشہ محبت کی متلاشی رہی لیکن جو کچھ اسے حاصل ہوا وہ جنسی تجربات، معکوس رابطے، نافراہمی اور ناآسودہ محبت تھی۔ اس کی محبت میں کجی اور کم فہمی پیدا ہو گئی۔ پاک اور سچی محبت کی بجائے اس کی روح میں جسم کا حرام پہنچنے لگا۔

قیوم محبت اور ہوس کے درمیان فرق کو قائم نہ رکھ سکا۔ سیمی کی محبت کا جنون اس پر ایسا سوار تھا کہ کوئی اخلاقی، سماجی اور قانونی ضابطہ اس کے منہ زور نفس کے گھوڑے کو لگام نہ دے سکا۔ سیمی سے جسمانی تعلق نہ صرف اس کی کرداری و اخلاقی کمزوری کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ اس کے بعد وہ اخلاقی زوال کی دَلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ قیوم کا بچپن چندرا گاؤں میں گزرا جہاں کے فرسودہ اور پست تصورِ اخلاق نے بے راہ روی اور جنس پرستی کی زیریں لہر گاؤں میں پیدا کر دی تھی۔ کھلم کھلا جنسی تعلقات، معاشقے اور فحش گفتگو گاؤں کا عام رواج تھے۔ قیوم کا چچا، ماسی اُلفت، عزیز گاتن اور گاؤں والوں کا اس کے ساتھ ہتک آمیز سلوک، گاؤں کے نام نہاد اخلاقی کردار کی جھلک ہمارے سامنے لاتے ہیں۔

''عزیز گاتن کا اوپر والا ہونٹ پیدائشی کٹا ہوا تھا...... اسی لیے وہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔ لیکن میں تو عزیز گاتن کو بچپن سے جانتا ہوں وہ چھوٹی عمر سے غلیظ باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ پرانے بھٹے کے پاس جہاں مائی توبہ توبہ کی جھونپڑی تھی...... وہاں مجھے اور ہمبلی کو لے جا کر وہ ایسی ایسی گالیاں سکھاتا کہ ان کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم دونوں کے کان جلنے لگتے...... جب کبھی اس کی ماں کے متعلق گفتگو ہوتی لوگ اچانک ہی بہت ہنسوڑ، بے پروا

ننگے اور جنسی ہو جاتے...... پہلے وہ نظروں سے بھاگ جانے کی کوشش کرتا۔ لیکن راہ نہ پا کر کھڑا رہتا...... یوں لگتا جیسے وہ ہنس رہا ہے سب کے ساتھ......اپنی ماں پر...... ماسی اُلفت کی ننگی حرکتوں پر......

ماسی اُلفت موہنجوداڑو کی پتلی تھی۔ وہ ہمیشہ چھینٹ کی شلوار اور ململ کا سیاہ کرتا پہنتی تھی۔ شاید بٹنوں کا اسے کبھی خیال نہیں آیا کیونکہ جب کبھی وہ رفیرے پر روٹی ڈال کر تنور کے اندر جھکتی تو گلے سے رسنے والا پسینہ اندر جڑے ہوئے پیڑوں پر گرتا نظر آتا...... ماسی اُلفت کی بہت بکری تھی......اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی۔ اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے۔ لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔'' (۱۷)

چاچا غلام رسول گاؤں کا گھاک عاشق تھا۔ گاؤں کی عام اخلاقی سطح اس کے کردار کے حوالے سے سامنے آجاتی ہے۔

''جس وقت چاچا آنگن میں آتا، اماں کی ساری کلب منتشر ہو جاتی۔ لونگ والی، چوڑے والیاں، چھاج پھٹکتی، مسالہ پیستی، آٹا گوندھتی مخلوق میں زلزلہ سا آجاتا......اچانک فائر سن کر چڑیاں اُڑ جاتی تھیں...... ایسے ہی تر نت عورتیں چلنے لگتیں، لڑکیاں سروں پر آنچل کر لیتیں اور جوان عورتوں کو اپنی چادریں یاد آجاتیں......

چاچا غلام رسول اشتہاری مجرم جیسا اشتہاری عاشق تھا۔ شروع شروع میں پانچ سات معاشقے چندرا میں بھی دھڑلے کے ہوئے لیکن دکان کی مشہوری سے بہت پہلے بات پھیل گئی کہ سارا سودا ناکارہ ہے...... چاچا بڑا حکمتی آدمی تھا۔ اسے ہر لڑکی ہر عورت کی پرسنل ہسٹری معلوم تھی۔ کون سیدانی کس مراثی کے ساتھ کتنی دیر پھنسی رہی۔ کون سی شیخانی کا پانچواں بچہ حرامی تھا، کس مغلانی نے اپنے مزارع کے بیٹے سے دوستی لگا رکھی ہے، کون سی آرائین گھر سے اُدھل گئی تھی......ایسے قصے اسے بڑی چٹ پٹ تفصیلوں کے ساتھ یاد تھے۔ ایسی کہانیوں کی وجہ سے جوان لڑکے اس کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ وہ جوانوں کو

محبت کرنے کے طریقے ایسے سکھاتا تھا جیسے پہلوان اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ از بر کراتے ہیں۔
ابا نے ہمیں چاچا کی صحبت میں بیٹھنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔اس کے باوجود جب وہ
باتیں کیا کرتا ہم کسی نہ کسی بہانے وہاں منڈلایا کرتے۔''(۷۲)

ہر اخلاقی اور مذہبی قید سے آزاد چاچا غلام جیسے کردار گاؤں میں بکھرے ہوئے تھے اور ان ہی کے ساتھ بچپن گزارتے ہوئے قیوم کی اخلاقی بنیادیں رکھی گئی تھیں۔

عزیز گاتن کے ساتھ گاؤں والوں اور چاچا غلام رسول کا تضحیک آمیز سلوک قیوم کے ذہن پر گہرے اثرات مرتّب کرتا ہے۔

''اس روز عزیز گاتن بہت خوش تھا۔زور زور سے یوسف زلیخا گا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر چاچا
غلام نے اس کی گدی میں دھول ماری۔عزیز گاتن کی آنکھیں یکدم خوف سے کھل گئیں......
''اوئے تیری ماں کو کچھ عقل ہے کہ نہیں؟......پلید کہیں کی۔''
عزیز گاتن مسکرانے لگا۔
جب بھی عزیز گاتن سنجیدہ ہوتا،ایسے لگتا کہ مسکرا رہا ہے۔عزیز گاتن اپنی ماں سے متعلق بہت
سی باتیں سننے کا عادی تھا۔ماسی کو بیوہ ہوئے چھ سال ہوئے تھے۔وہ بالکل آزاد تھی اور اسے
اپنی آزادی بہت پیاری تھی۔عزیز تو باتیں سن کر مسکرانے لگتا۔لیکن میرے ہاتھوں میں پسینہ
آ جاتا۔
''اوئے بول تیری ماں ہے ناں اُجڈ گنوار ناپاک۔''
گاتن چپ چاپ سنتا رہا۔
''سن رہا ہے میری بات بُل پھٹیا؟''
''جی''
پتہ نہیں کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔
''حرامی اپنی فیشن کی ماری ماں کو کہنا،پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔بتانا اسے جسم کے بال ناپاک
ہوتے ہیں۔اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ملاّ جی سے پوچھ لے مسجد میں......ویسے تو اسے

بڑے مسئلے آتے ہیں۔جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں آتا کوڈو کو......؟''

''اچھا جی کہہ دوں گا۔''

عزیز نے ہاتھ میں چُنے ہوئے پیلو تخت پوش پر رکھ دیے۔اس سے پہلے کئی بار میں نے اسے
لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔لوگ اس کے منہ پر اُس کی ماں کو گالیاں دیتے،
لیکن وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔''(۷۳)

عزیز گاتن کی تذلیل اور غائب ہو جانے کا واقعہ قیوم کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔معاشرے کے کھوکھلے اور دوغلے تصورِ عزت کی قلعی اس پر ایسی کھلی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تصورِ عزت ہی سے متنفر ہو گیا۔

''کچھ خاندان کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا تم نے......''

بہت آہستہ دَبی ہوئی آواز میں صولت بھابھی نے کہا۔

''اب یقیناً یہ مشن ان کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔''

چندرا گاؤں میں جس روز چاچا غلام نے عزیز گاتن کی بے عزتی کی اور وہ گاؤں چھوڑ کر
بھاگ گیا۔اسی روز کے بعد میں نے پھر کبھی عزت کے متعلق نہ سوچا تھا۔(۷۴)

چاچا غلام کی بدکرداری، گاؤں کے پست تصورِ اخلاق، باپ کی سرد مہری اور ماں کی جدائی نے قیوم کے ذہن پر گہرے اثرات مرتّب کیے۔

قیوم کی ابتدائی تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی کسمپرسی کا عالم نظر آتا ہے۔اس کی علمی تربیت ایسے استادوں کے ہاتھوں ہوئی جو اعلیٰ علمی اقدار سے نابلد تھے جو قیوم کی ذہنی اُپج کو صحیح سمت عطا نہ کر سکے۔اس کی بی اے تک کی تعلیم تضادات سے بھرپور تھی جو اس کے ذہنی الجھاؤ اور فکری افراتفری کا باعث بنی۔

قیوم، سیمی کے عشقِ لاحاصل میں مبتلا ہوا جس نے اس کے اندر راجہ گدھ بیدار کر کے اسے شخصی قبا سے محروم کر دیا اور اس کے کرداری زوال کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

عشقِ لاحاصل کی مثبت قوت روح کو بالیدگی بھی عطا کر سکتی تھی لیکن چونکہ وہ نفس کا غلام تھا اور اعلیٰ کرداری اقدار سے عاری تھا اس لیے ہوس کا شکار ہوا۔قیوم نے سیمی کی محبت حاصل کرنا چاہی لیکن اسے صرف جسم میسر ہوا۔سیمی کے دُہرے رویے اور محبت کے تضاد نے قیوم کے ذہن کو بُری طرح اُلجھا دیا۔وہ Schizophrenia کا شکار ہو کر دیوانگی کی

سرحدوں کو چھونے لگا۔

قیوم کے حصے میں عشقِ لا حاصل کی منفی دیوانگی ہی آسکی۔ قیوم کا منفی راستوں کو اختیار کرنا محض اس کی زندگی کے حادثات اور تلخیوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سابقہ زندگی کا پس منظر، جس میں ہمیں مثبت قدروں کی کارفرمائی نظر نہیں آتی، اس کے گاؤں کا ماحول، خاندانی زندگی، اس کا تعلیمی پس منظر، اس کی فکری و اخلاقی تربیت، سب ہی اسے منفی رستوں پر چلنے سے باز رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

قیوم کی دیوانگی، جسمانی شکستی اور فکری انتشار سب اس کے اخلاقی زوال اور مثبت قدروں کی عدم موجودگی کے منفی اثرات کے پیدا کردہ ہیں۔

مردہ خوری قیوم کی فطرت بن گئی تھی اور اسی کی وجہ سے اس کی زندگی تلخیوں، حسرتوں اور مایوسی کی داستان بن کر رہ گئی تھی۔

عابدہ

عابدہ سیدھی سادی نیم جاہل عورت ہے جو اپنے میاں سے ناراض ہو کر بھائی مختار کے گھر رہنے آتی ہے۔ قیوم کی اس کے بارے میں رائے یہ ہے:

> ''وہ رسم و رواج، محاورے، شگون، جکڑ بند عادتوں کی سخت تربیت میں پلی لگتی تھی۔ اس کی ساری سوچ میں کہیں اپنی سوچ کا شائبہ تک نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ کبھی دبدھا، دوہرے راستے اور بلاوجہ فکر کرنے سے آشنا نہ رہی ہو۔ میرے لیے ایسی شخصیت تباہ کن حد تک بور کرنے والی اور نئی تھی۔'' (۷۵)

عابدہ متوسط طبقے کی ایک گرہستن عورت تھی، جس کا جسم چوکی پر بیٹھ کر لکڑی کی ڈوئی چلانے کا عادی تھا۔ اس کے گھٹنے، ٹخنے، ہاتھ اور پاؤں سب آٹا گوندھنے کی غمازی کرتے تھے۔ اسے ماڈرن لباس کا سلیقہ نہ تھا اور جب بھی تیار ہوتی کثرت سے ہوتی اور بقول قیوم، بے ہودہ لگتی۔

عابدہ کے مزاج میں بھول پن، بچپنا اور بے ساختگی تھی۔ اس کا ذہن تفکر، کشمکش اور کسی تضاد سے آشنا نہ تھا۔ اس کی حرکتیں اضطراری اور لاشعوری تھیں۔ اس کا دل صاف اور فطری سادگی سے لبریز تھا۔

''جس روز میں آپ کے گھر آئی تھی اس روز مجھے آپ پر بھی ترس آیا تھا...... بڑا''

''کیوں؟''

''آپ گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ ہماری ٹیکسی والے نے موڑ سے ہارن دیا۔لیکن آپ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے کھڑے رہے۔ میں نے سوچا یہ آدمی تو پاگل ہے۔سڑک کے درمیان کھڑا آسمان دیکھ رہا ہے۔''

میں نے ایک دَبی سی سانس لی۔

''پھر ٹیکسی والے نے آپ سے دو قدم اِدھر زور سے بریک ماری۔ آپ تو بُری طرح گرے......میرا تو ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا...... ہے نا!''

''اچھا ترس ہے آپ کا۔''

اب وہ دوبارہ ہنس رہی تھی۔آنسو اس کی آنکھوں سے گڑھوں میں گر رہے تھے۔اس کے جسم کا وافر گوشت جیلی کی طرح ہل رہا تھا۔ (۷۶)

عابدہ منہ پھٹ اور بدلحاظ بھی تھی۔اس کی رائے میں کھلا اظہار ہوتا،جس میں شائستگی کا ذرا بھی شائبہ نہ ہوتا۔اس کی گفتگو عام طور پر اس طرح کا لہجہ لیے ہوتی تھی:

''وہ آپ کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی...... ہے نا؟......اس کے کسی اور لڑکے سے بھی تعلقات تھے؟...... ہے نا؟...... یہ دو دو...... تین تین جگہ تعلقات کیسے ہو جاتے ہیں بھلا؟......آپ کو پتہ تھا کہ اس کے تعلقات کسی اور سے ہیں؟...... ہیں پتہ تھا آپ کو؟''

عابدہ نے سوال کیا۔

میں نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔

''ہائے جب آپ کو پتہ تھا کہ وہ کسی اور سے ملی ہوئی ہے تو پھر آپ اس کے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے۔دفع کرنا تھا ایسی دوموہی کو۔'' (۷۷)

عابدہ اتفاق سے قیوم کے کمرے میں آئی اور یہاں کی حالت دیکھ کر اسے قیوم پر ترس آ گیا۔

''پہلے بریکٹ سے پیتل کا ڈنڈا گرا، پھر ساتھ ہی فیروزی رنگ کے پردے میں کوئی لپٹا لپٹایا

آگے بڑھا، پھر پیتل کے راڈ سے پردہ علیحدہ کرتی ہوئی ایک بھرپور جوان عورت باہر نکلی......

''ہائے ہائے یہ پردہ ٹانگ رکھا ہے آپ نے؟''

''بدقسمتی سے راڈ چھوٹی ہے اور دروازے کا تختہ جب بھی پردے سے لگتا ہے پردہ گر جاتا ہے......''

اس کے ایک ہاتھ میں خط تھے دوسرے بازو پر راڈ سمیت فیروزی پردہ لٹک رہا تھا۔

''یہ تو جان کا خطرہ ہے، آپ اس کا کوئی علاج کیوں نہیں کرتے؟......'' پھر اس نے سارے کمرے کو بغور دیکھا...... بولی......''ٹھیک ہے......آپ کیا پردہ ٹھیک کرائیں گے، یہاں سائن کریں، ڈاکیا نیچے کھڑا ہے۔''

وہ رسید پکڑے کھڑے رہی۔

''کس کا خط ہے؟......کھول کر دیکھیں آخر رجسٹری ہے۔''

''......انٹرویو ہے۔''

''کس کا؟''

''میرا......ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہے پرسوں۔''

''اچھا...... پروڈیوسری کی نوکری ہے نا۔''

میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھتا رہا اور وہ خط کی رسید لے کر نیچے سیڑھیاں اُتر گئیں۔''(۷۸)

عابدہ اور قیوم کی پہلی ہی ملاقات میں سیمی کا موضوع برہنہ ہو گیا۔ عابدہ بلا جھجک قیوم کے کمرے میں آ جاتی۔ وہ اپنے میاں کو بُرا بھلا کہتی اور قیوم سیمی کی باتیں کرتا رہتا۔

''ہماری عادت تھی کہ جب کبھی باتیں کرتے وہ اپنی پٹڑی پر رواں رہتی۔ میں اپنی باتیں کیے جاتا۔ اس کا شوہر اس کا محبوب ٹاپک تھا۔ میں سیمی کی گفتگو کیے بغیر نہ رہ سکتا، حالانکہ اس کی بدگوئیوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی اور عابدہ میرا نقطۂ نظر سمجھنے سے قاصر تھی......''(۷۹)

جن دنوں عابدہ کے ساتھ قیوم کی ملاقات ہوئی وہ یوگا کے ذریعے شکتی حاصل کرنے میں مصروف تھا۔ عابدہ کے جسم کو ذریعہ بنا کر وہ روحانی وجسمانی طاقت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان جو جسمانی تعلق قائم ہوا وہ کسی

روحانی اور جذباتی کشش کے بغیر کھوکھلا اور بنجر تعلق تھا۔ قیوم اپنی بقا کی تلاش میں اس کی طرف بڑھا تھا اور عابدہ بچے کی خواہش میں اس تعلق کے لیے آمادہ ہوئی۔

''اس وقت عابدہ پلنگ سے دوبارہ اٹھی......اس کی جھولی سے مونگ پھلیوں کے چھلکے خزاں کے پتوں کی طرح ایک بار پھر گرے......اونچی قمیص تلے کاسنی شلوار کا پورا گھیر گنبد پر چڑھے غلاف کی طرح نظر آیا۔

''تم واقعی پاگل ہو گئے ہو......خدا قسم کیا کیا بک رہے ہو۔''

''تم شکتی ہو......شکتی عابدہ! تمہارے ملاپ سے مجھے اپنی روح کا نروان......میرا خدا مل سکتا ہے......میری لا متناہی تلاش ختم ہو سکتی ہے، تمہاری آرزو کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ تم ماں بن سکتی ہو......ماں۔'' میں نے اسے لالچ دیا۔

پھر منت کے انداز میں مقدس گنبد پر ہاتھ رکھا...... پتہ نہیں عابدہ کیوں خاموش بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں میں بڑی حیرانی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا......''تم چاہتے ہو میرے بچہ ہو قیوم......سچ؟......سچ؟...... بتاؤ تمہیں مجھ پر ترس آ رہا ہے ناں؟''(۸۰)

قیوم کے ساتھ جسمانی تعلق نے عابدہ میں احساسِ گناہ ضرور پیدا کیا اسی لیے وہ قیوم کے ساتھ ملاقاتوں کا تسلسل برقرار نہ رکھ سکی۔

''اب عابدہ نا غے ڈال کر اوپر آنے لگی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تو اُس کے چہرے پر آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہوتیں۔ ہونٹ لپ اسٹک کے باوجود پرانے پردوں کی طرح بے رنگ نظر آتے۔ وہ کبھی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی، کبھی دیوار کے ساتھ بایاں کندھا لگا کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔

بچپن سے جو میخیں اس کے کلچر، مذہب، ماحولیات نے اس کے ذہن میں ٹھونکی تھیں، بالآخر اس کے ذہن کے تختے کا حصہ ہو چکی تھیں۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن ہم دونوں تو اپنی اپنی تلاش کے باعث ہم سفر ہوئے تھے، اسی لیے اب فقط

احساسِ گناہ اور خود شکستگی باقی تھی۔''(۸۱)

آخر اپنے ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر اُس نے اس گناہ کے رشتے سے توبہ کر لی اور جب اس کا میاں لینے کے لیے آیا تو قیوم کی منت سماجت کے باوجود اس کے ساتھ جانے پر خوشی خوشی راضی ہو گئی۔

عابدہ کی مذہبی اور دنیاوی تعلیم اوسط درجے کی تھی۔ وہ معمولی درجے کی ٹائپ کی حد تک مڈل کلاس عورت تھی۔ اس کی ذہنی اور اخلاقی تربیت سطحی مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ اس کے امر اور نہی بالکل فکس تھے۔ نیکی اور بدی کا تصور اُس کے ذہن کے الگ الگ خانوں میں بند تھا۔ اس کا شعور اتنا پختہ اور حسّاس نہیں تھا کہ احساسِ گناہ سے اس کے اندر ذہنی تصادم برپا ہو جاتا، بلکہ تھوڑی سی ذہنی کشمکش کے بعد وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی ہے کہ:

''واقعات پر اپنا بس تھوڑی چلتا ہے، گناہ تو ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ بشر جو ہوا۔ توبہ کر لے بس...... آئندہ کے لیے...... اللہ معاف کرنے والا ہے۔''(۸۲)

عابدہ اوسط درجے کی سمجھ بوجھ رکھنے والی عورت تھی۔ اس کے اندر نیکی اور گناہ کا تصور تو موجود ہے لیکن اس کی اخلاقی اقدار اتنی پختہ نہیں ہیں کہ بچے کی فطری خواہش کے آگے بند باندھ کر اسے ناجائز تعلق قائم کرنے سے روک سکیں۔ اسی لیے جب قیوم نے اسے ورغلایا تو وہ آسانی سے اس کے بہکاوے میں آ گئی۔ مصنفہ اس کی اخلاقی سطح کے بارے میں لکھتی ہیں:

''عابدہ کی مذہبی اور دنیاوی تعلیم چونکا دینے والی نہ تھی...... آیۃ الکرسی پڑھنے لگتی۔ خیالات غلط راستے پر گھسیٹتے تو سورہ الناس پڑھ کر سینے پر دَم کر لیتی۔ اس میں خاص قسم کی پریکٹیکل عقل تھی۔ اشیائے خوردنی کی قیمتیں...... رسومات کی بجا آوری، ایسے ہی معاملات میں اس کی رائے پختہ تھی۔ ان باتوں میں اپنی رائے کے خلاف وہ کچھ سن نہیں سکتی تھی اور اس کے علاوہ کسی اور بات میں دلچسپی لینا اس کے بس کی بات نہ تھی......''(۸۳)

قیوم کی طرح عابدہ بھی کج روی کا شکار ہے۔ پاک اور سچی محبت کا کوئی تصور اس کے پاس موجود نہیں ہے۔ وہ ایثار و قربانی کے جذبے سے عاری محض اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے تعاقب میں بھاگنے والی ہے۔ وہ ماں اور بیٹے کے مقدس رشتے کو بھی اپنی خود غرضی کی عینک سے دیکھتی ہے۔ اسی لیے اس کا اظہار اِس قسم کا رنگ اختیار کر جاتا ہے۔

''خدا قسم قیومی...... ایسے مرد سے کبھی شادی نہ ہو جسے ابھی اپنی ماں کی کچھڑ کا شوق ہو۔

بڑھے پھونس ہو جائیں گے، لیکن گودی کا شوق نہیں جائے گا۔ بکری کے میمنے کی طرح ماں ماں کرتے مریں گے یتیم...... ویسے تم مانو نہ مانو ساری مرد ذات ماں کی خصم ہوتی ہے...... یہ وحید ہے ناں...... کریانے سٹور والا...... میرا شوہر...... عام طور پر مرد زن مرید ہوتے ہیں۔ یہ ماں مرید ہے...... اماں جی خضاب لگا لو...... شیشہ لیے کھڑا ہے...... اماں جی بیر کھا لیں موسمی میوہ ہے...... اماں جی پیر دبا دوں آپ کے...... اماں جی اماں جی...... جب یہ مرے گا تو میں اس کے کتبے پر لکھواؤں گی، یہاں ایک ماں کا یار دفن ہے......''

ماں بیٹے کی محبت نے اس کے اندر حسد اور نفرت کی آگ جلا رکھی ہے۔ عابدہ بھی قیوم کی طرح محض اپنے نفس کی غلام ہے۔ حسد، نفرت، خود غرضی اور لاحاصل آرزوؤں کے تعاقب نے اسے ایسے ریگستانوں کا مسافر بنا دیا ہے جہاں روح کو سیراب کرنے والی طیّب محبت کے پانی کے چشمے نہیں ملتے۔

بانو قدسیہ نے اس کردار کے حوالے سے خواہشوں اور آرزوؤں کے جنگل میں بھٹکنے والے افراد کی ذہنی و نفسیاتی حالت کا اَلمیہ بیان کیا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جو مثبت جذبوں سے اپنی روح کو سکون و قرار دینے کی بجائے حسد، نفرت اور ایسے ہی منفی جذبوں کی پرورش کر کے ہمیشہ ناآسودہ ہی رہتے ہیں۔

عابدہ کے ذہن میں ہمیشہ منفی افکار اور دل میں منفی جذبوں کی یلغار رہی ہے۔ بظاہر وہ معصوم، سادہ اور مذہبی خیالات رکھنے والی عورت نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت وہ روح اور جسم دونوں کا حرام کھانے کی سزاوار ہے۔ اس کی گفتگو اُس کے پست ذہن کی غماز ہے۔ ساس اور شوہر کے خلاف بکی گئی مغلظات اس کے منفی طرزِ فکر و احساس کی ترجمانی کرتی ہیں۔

عابدہ نے اپنی سیدھی اور صاف شفاف زندگی میں اپنے منفی طرزِ عمل کا زہر گھول کر اُسے سب کے لیے آلودہ کر دیا ہے۔

امتل

امتل ایک عمر رسیدہ طوائف ہے۔ جوانی میں ریڈیو اسٹیشن پر گایا کرتی تھی اور تب اس کی اچھی مانگ تھی، لیکن عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ہی اس کے حسن کے ساتھ اس کی آواز بھی یادِ رفتہ بن چکی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر کبھی کبھار اسے چھوٹا موٹا پروگرام مل جایا کرتا تھا لیکن وہ وہاں باقاعدگی سے آیا جایا کرتی تھی۔

''ریڈیو پر بظاہر وہ بہت مقبول تھی، ہر ایک سے ٹھٹھہ مذاق کرنا، خوشدلی سے دوسروں کے مذاق سہنا، وقت بے وقت سازندوں کی مالی مدد کرنا، باوردی چپراسیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے گھر والوں کی خیریت پوچھنا، امیر آرٹسٹوں سے بلا تکلّف لفٹ مانگنا، نوجوان لڑکیوں سے سکرپٹ مانگ کر پڑھنا اور اچھے جملوں پر داد دینا، موسیقی کے پروڈیوسروں کی بظاہر بے عزتی کرتے ہوئے در پردہ ان کی خوشامد کرنا اور باوجودیکہ اسے اب پروگرام ملنا بند ہو گئے تھے، باقاعدگی سے ہفتے میں دو بار ریڈیو سٹیشن آنا اس کا ٹائم ٹیبل تھا۔''(۸۴)

امتل مجموعۂ اضداد تھی۔ اس نے زندگی کو اور زندگی نے اس کو خوب برتا تھا۔ وہ چالیس سالہ زندگی میں صدیوں کا تجربہ حاصل کر چکی تھی۔ وہ دھرتی جتنی پرانی اور تازہ کونپل جیسی نئی تھی۔ وہ زندگی کو ہر روپ میں دیکھ چکی تھی اس لیے کبھی وہ پانچ سالہ بچے کی طرح معصوم لگتی، کبھی بوڑھی نائکہ کی طرح تجربہ کار خرانٹ بے حس بن جاتی۔ وہ ذہنی، جسمانی اور روحانی طور پر کئی طرح کی کج رویوں کا شکار تھی۔ وہ بیک وقت مادہ پرست بھی اور روپے پیسے سے غنی اور بے پروا بھی تھی۔ وہ ابوالہوسی کا شکار بھی تھی اور قلندرانہ بے نیازی سے آراستہ بھی تھی۔

''وہ بچوں کی طرح کسی Sustained Emotion کے قابل نہ تھی۔ اس کا لڑنا جھگڑنا، پیار محبت، نفرت سب موڈ کے تابع تھے۔ کسی تھیوری کسی مسلک دباؤ کے تحت وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے کرتی۔ جی چاہا مدد کر دی، دل میں آیا گالی دے دی۔ کسی کو کھانا کھلا دیا۔ نیا پرس عطا کر دیا۔ کڑھا ہوا دوپٹہ اس کے کندھوں پر ڈال کر اُس کا بوسیدہ دوپٹہ اپنے پر لے لیا۔ کسی سے بیس روپے اُدھار مانگے اور شکریہ بھی نہ ادا کیا۔ مدد کرنے، تحفہ دینے، کسی کو اُلّو بنانے، تعریف کرنے کے لیے اس کا کوئی فلسفہ نہ تھا...... اس کا سارا نظام Impulse پر چلتا تھا۔ اسی لیے اس کی رائے پر چلنا مشکل تھا کیونکہ اس کی دوستی، دشمنی، نظریے سب منٹ کی سوئی کے تابع تھے۔ کچھ بھی گھنٹوں، دِنوں، سالوں پر محیط نہ تھا۔''(۸۵)

قیوم اور امتل کے درمیان رابطے کی وجہ یہ تھی کہ قیوم کو اس میں اپنی جھلک نظر آئی تھی۔

''امتل کو اپنا سمجھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ شہر میں وہ اور میں بالکل تنہا تھے۔ میں ذہنی اور جسمانی

طور پر بیمار تھا۔ وہ میری ماں کی عمر کی تھی۔ پھر اس کا میرا مسلک گدھ جاتی کا تھا۔ ہم دونوں
مردار آرزوؤں پر پلے تھے..... ہمیں آپس میں بات کرنے کے لیے زیادہ اوڑھنے بچھونے،
لگانے چھپانے، رکھ رکھاؤ کی ضرورت نہ تھی.....'' (۸٦)

امتل کی بے بسی اور اس کی مردہ آرزوئیں، قیوم کے دل میں اس کے لیے رحم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ قیوم دنیا سے کٹا ہوا تنہائی پسند انسان تھا۔ اسے امتل کے وجود میں ایک ایسی تنہا روح نظر آئی جس کو دنیا روند کر آگے نکل چکی ہے۔ وہ ریڈیو اسٹیشن پر خوشامدیں کرتی پھرتی ہے لیکن اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔ نہ بی بی کے دل میں اس کے لیے محبت ہے نہ ریڈیو والے اس کے ساتھ عزت کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ اپنے پرانے دنوں کا واسطہ دے دے کر اپنے لیے پروگرام کی بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ وہ گزرے دِنوں کی لاش کندھوں پر اُٹھائے تنہائی کے صحرا سے گزر رہی ہے۔ قیوم بھی اسی دشت کا مسافر ہے۔ کچھ دیر کے لیے یہ دونوں ہمسفر بنتے ہیں۔ امتل اسے اپنی ادھوری محبت کی داستان سناتی ہے۔ تنہائی کے عذاب سے نکلنے اور اپنا ہم مشرب ہونے کے ناطے قیوم اس سے شادی کی درخواست کرتا ہے۔

''اپنے آپ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے سر جی..... آپ جوان ہیں، صحت مند ہیں..... بڑی
عزت ہے آپ کی ریڈیو سٹیشن پر۔ آپ سیدھی سیدھی شادی کرا لیں۔ ابھی آپ کا بیلنس
ٹھیک نہیں..... دو پٹڑیوں پر گاڑی چلے گی تو بیلنس ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم..... تم مجھ سے شادی کر لو امتل..... ہم دونوں.....''

یکدم اس کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشا گرنے لگے اور اس کا چہرہ بوڑھی عورت کا ہو گیا۔ وہ
بیالیس سے بھی زیادہ کی لگنے لگی۔

''ہم دونوں سر جی؟..... ہم دونوں؟..... میرے جسم کا تو..... ہر قطرہ حرام پر پلا ہے سر جی۔
میں اس لہو سے اب کوئی حلال زادہ پیدا نہیں کر سکتی۔ میں نے کوشش کی تھی ایک بار شادی کی
سر جی..... پر چھوڑ دیں اس بات کو، میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔'' (۸۷)

امتل کسی واضح سوچ، فلسفے اور فکر کی پابند نہ تھی۔ وہ ایک طوائف تھی اور جس طرح اس کے ہاں گاہکوں کی رنگا رنگی تھی اور سب کے لیے اس کے دروازے کھلے تھے، اسی طرح مذہبی اعتبار سے بھی وہ بڑی رنگا رنگ تھی۔ وہ مذہبی رواداری کی حامل اور کشادہ ذہن تھی..... مذہب پرستی کی بجائے اس میں انسان پرستی پائی جاتی تھی۔

''اس کے گھر میں مجلسیں ہوتی تھیں اور وہ بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھی۔ عاشورے کے دوران اس کے تن سے کبھی سیاہ کپڑا نہیں اترا۔ پنج تن پر جان نثار کرتی تھی۔ بی بی فاطمہ کے گھرانے کی عاشق تھی...... کرسمس کی رات کو وہ بڑی خوش ہوتی اور اکیلی کرسمس مناتی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے وہ بڑے جوش سے دیوالی کے دن گھر کی منڈیر پر دیئے بھی جلاتی تھی اور اس نے ایک مرتبہ ایک ہندو بزنس مین کو راکھی بھی باندھی تھی۔'' (۸۸)

امتل نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں زندگی تن آسانی اور موج میلے کا نام تھی۔ وہ متوسط سماجی زندگی کے بندھنوں میں کسی نہیں رہ سکتی تھی۔ نام نہاد عزت کے تصور سے وہ ہمیشہ متنفر رہی تھی۔ وہ ایسی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی جہاں عزت کے نام پر زندگی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ ایسی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ کہتی ہے:

''اپنا نقشہ یاد آ رہا ہے سر جی...... چہرے پر چھائیاں، کھردرے ہاتھ، کلائیاں پھٹی ہوئی، ہونٹوں پر لکیریں...... یہ سب کس لیے کہ کچھ گمنام سے لوگ کہیں کہ آئی تو بازار سے ہے لیکن شریفوں کو مات کر دیا...... ہت تیری! اتنی سی تعریف سننے کے لیے آدمی ساری عمر لاش بنا رہے، نہ زردہ ڈال کر پان کھائے نہ سر میں مہندی لگائے نہ نقلی باڈس پہنے......اور سنے کیا ہر وقت بازار سے بھاگ کر آئی ہے...... ہیرا منڈی سے اٹھ کر آئی ہے...... چلو جو یہ سننے میں آئے کہ بازار میں بیٹھی ہے تو کیا ہرج ہے؟...... یہ جو آپ کے مڈل کلاس کے اشراف ہوتے ہیں ناں، ان کو بازار کا لفظ کبھی نہیں بھولتا۔ تعریف بھی کریں گے تو آپ کی اوقات آپ کو یاد دلا کر......سر جی خود انصاف کریں، جب بازار کا لفظ پیچھے سے اترتا ہی نہیں تو وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فائدہ؟'' (۸۹)

امتل ایک طوائف تھی اور اس کے لیے زندگی کا مطلب عیش وعشرت، آرائش وزیبائش اور آزادی تھی، شادی شدہ زندگی کے بندھے ٹکے اور جکڑ بند ماحول سے اس کا دَم گھٹنے لگا۔ اس نے اپنی آزادی کا سودا نہیں کیا اور شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ ایک آزاد منش انسان تھی اور اُسے اپنی آزادی ہر قیمت پر پیاری تھی۔

امتل کو زندگی نے اس بُری طرح رگیدا تھا کہ اب اس کے دل سے جینے کی خواہش اور زندگی کی آرزو ختم ہو چکی

تھی ۔ ذہنی وجسمانی کج روی نے اس کے دل ودماغ کی حالت عجیب وغریب بنا رکھی تھی ۔اس پر مستزاد لا حاصل کی اذیت تھی جس نے اسے عبرت کا نشان بنا رکھا تھا۔زندگی کے بہت سے رُخ برت چکنے کے بعد اس کا فلسفہ یہ بن چکا تھا:

''یہاں ہم سب کس لیے آتے ہیں سر جی......صرف مرنے کے لیے ناں؟''

''زندہ رہنے کے لیے بھی امتل ۔زندہ رہنے کے لیے بھی شاید......''

امتل نے ماتھے پر اَن گنت سلوٹیں ڈالیں......''ناں سر جی۔آنا صرف مرنے کے لیے ہے......زندہ رہنا تو ٹائم پاس کرنے کے لیے ہوتا ہے۔''(۹۰)

امتل نے دعا مانگی تھی کہ اس کی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے نہ گزر سکی، اب موت کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔اس کی دعا قبول ہوئی اور اسی رات اس کے مخبوط الحواس بیٹے نے اسے قتل کر دیا۔

امتل کی زندگی کے کج راستوں، فکری ناہمواری، محبت کی ناآسودگی اور عزت کی لاحاصل آرزو نے اسے دیوانگی کے منفی رستوں کا مسافر بنا دیا تھا۔ایسی دیوانگی جس میں روح کچھ ارتقاء حاصل کرتی ہے، شعور کو پختگی نصیب ہوتی ہے۔ عرفان کی کھڑکیاں کبھی کبھی کھلنے لگتی ہیں لیکن دیوانگی کے یہ مثبت خصائص، نفس کی آلودگیوں اور جسمانی و ذہنی پراگندگی کے ساتھ اتنے کثیف ہو جاتے ہیں کہ روح کو ایک خاص حد سے آگے طاقتِ پرواز عطا نہیں کر سکتے۔امتل کی باتوں میں زندگی کے تجربات سے حاصل کردہ شعور ہے، درویشانہ مزاج نے اسے خاص بصیرت بھی عطا کر دی ہے۔وہ ایک وسیع تر اخلاقی تصور کی امین ہے۔جب قیوم اس سے شادی کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے:

''میرے جسم کا تو ہر قطرہ حرام پر پلا ہے سر جی۔میں اس لہو سے اب کوئی حلال زادہ پیدا نہیں کر سکتی......میں......میں نے کوشش کی تھی ایک بار شادی کی سر جی......پر......چھوڑ دیں اس بات کو میں شادی کے قابل نہیں ہوں......''

اس وقت وہ کسی مصری راہبہ کی طرح بڑی پُر شوکت لگ رہی تھی۔

''یہ جسم اور دل بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے سر جی۔جسم رونداجائے تو یہ دل کو بسنے نہیں دیتا۔دل مٹھی بند رہے تو یہ جسم کی نگری تباہ کر دیتا ہے......ان دونوں کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔اللہ جانے کیوں میرے مولا نے ان کو ایک ہی ہتھکڑی پہنا دی۔اور پتہ نہیں آپ سے میں کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتی ہوں......

آپ کو عورت کے دل کی تلاش ہے سر جی۔ باکرہ لڑکی جو ہوتی ہے، اس کے پتن سے ابھی کسی نے پانی نہیں پیا ہوتا...... وہ جسم اور دل ایک ہی جوئے میں ہارتی ہے۔ آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔ خدا قسم میں اگر پہلے جیسی ہوتی تو فوراً آپ سے شادی کرا لیتی۔"(۹۱)

پہلے جیسا ہونے سے امتل کی مراد ہوس پرست اور مال کی محبت میں مرد کو پھنسانے والی طوائف سے ہے لیکن وہ اب اس مقام سے آگے نکل چکی ہے۔ اس نے دنیا کو اتنے قریب سے دیکھ لیا ہے کہ اب وہ اس کے فریب میں آنے والی نہیں ہے اس لیے وہ قیوم کی شادی کی پیشکش کو ٹھکرا دیتی ہے۔

امتل کی زندگی پر نگاہ دوڑائیں تو لاحاصل کی آرزو میں اس نے کئی دشت چھانے، محبت کے تعاقب میں وہ گھر سے نکلی اور عزت کی خاطر اُس نے شادی کی، لیکن دونوں دفعہ آبلہ پائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ زندگی کی تلخیوں اور رنگا رنگ تجربات نے اسے شعوری پختگی تو عطا کی ہے لیکن جذباتی لحاظ سے وہ ٹوٹ پھوٹ اور اَبتری کا شکار ہے۔

سیمی کے بعد امتل کے کردار میں ہمیں ارتقاء نظر آتا ہے۔ جیسے سیمی کے لیے عشقِ لاحاصل قلبِ ماہیت کرنے والا عمل ثابت ہوا تھا، اِسی طرح محبت کی لاحاصل جستجو نے امتل کو طوائف کی ہوس پرستی سے قلندرانہ بے نیازی کے رستے پر ڈال دیا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ امتل کے گذشتہ گناہوں اور اخلاقی وجسمانی بے راہ روی کا بوجھا اتنا بھاری ہے کہ ان کے ساتھ وہ لطیف روحانی سفر پر روانہ نہیں ہو سکتی۔

امتل کو نہ تو اپنی تلاش ہے نہ خدا کی۔ وہ ہر خواہش سے کنارہ کش ہو کر صرف موت کی متلاشی ہے۔ وہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہے اور اس شرمساری نے اسے "مصری راہبہ کی طرح پُر شوکت" بنا دیا تھا۔ لیکن وہ اپنی روح کو مقطر کرنے کی شعوری کوشش کرتی نظر نہیں آتی۔ اس کی فکری پراگندگی اور اخلاقی بے راہ روی اسے پاکیزہ رستوں پر چلنے کی ترغیب ہی نہیں دیتی۔ وہ تو بس اپنی زندگی سے عاجز آ چکی ہے اور موت کی خواہش میں جی رہی ہے۔ گناہ سے لاشعوری نفرت نے اس کی روح کو اتنی قوت ضرور عطا کر دی تھی کہ اس کی مانگی ہوئی دعا فوراً قبول ہوئی اور اسے "حلال موت" نصیب ہوگئی۔ لاحاصل کی آرزو میں امتل نے غلط راستوں کا انتخاب کر کے اپنی زندگی کو اذیت ناک بنا لیا تھا۔ محبت کی آرزو میں اس نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور اس روگ نے آخر دَم تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ مردار آرزوؤں پر پلنے والی روح ہے۔ حلال سے جس کا کبھی واسطہ نہ پڑا۔ اس کا مقدر بھی قیوم سے الگ نہیں ہے۔ تنہائی، ذہنی اذیت اور جذباتی شکستگی کا وہ عمر بھر شکار رہی۔

اور اسی عالم میں موت سے ہمکنار ہوئی۔ اس کی موت بھی طبعی نہیں ہے بلکہ موت کی خواہش کے زیرِ اثر وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئی۔

امتل اخلاقی و مذہبی اقدار سے نا آشنا، زندگی بھر رزقِ حرام کھانے کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس کی زندگی کے نشیب و فراز، تلخیاں اور محرومیاں، جذباتی شکستگی اور تنہائی اس کی مردار خور فطرت اور اس گناہ کی دلدل جیسے ماحول کا لازمی نتیجہ ہیں جہاں اس نے ساری عمر گزاری۔

امتل نمائندہ کردار ہونے کے باوجود انفرادی شان رکھتی ہے۔ اس کردار کے ذریعے بانو قدسیہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ایک طوائف اگر اپنے گناہ سے شعوری طور پر توبہ کر کے گناہ کے ماحول سے نکلنا بھی چاہے تو معاشرہ اسے صدقِ دل سے قبول نہیں کرتا۔ یہاں مصنفہ معاشرے کی تنگ نظری اور فرسودہ اخلاقیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں، دوسری طرف طوائف بھی جس آرام و آسائش، تن آسانی اور عیش و عشرت کی عادی ہو چکی ہوتی ہے، لاشعوری طور پر وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ جب عام گھریلو زندگی میں اسے وہ سب حاصل نہیں ہوتا تو وہ دوبارہ گناہ کی زندگی کی طرف مڑ جاتی ہے۔ یہاں بانو قدسیہ یہ کہتی نظر آتی ہیں کہ انسان جب ایک بار حرام زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اُس سے کنارہ کشی اختیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ مردار خور فطرت کو توبہ کے لیے جس کڑی آزمائش کے رستے پر چلنا پڑتا ہے اس کے لیے وہ تیار نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں مصنفہ سوال یہ پیدا کرتی ہیں کہ مردار خوری کے جس رستے پر انسان چل رہا ہے، کیا ذہنی و جسمانی شکست و ریخت، روحانی کرب اور تنہائی کے سوا اس کا کچھ اور انجام ممکن ہے؟

بانو قدسیہ کا نظریۂ اقدار

> ''بانو قدسیہ کا ناول ''راجہ گدھ'' ایک ایسے دَور میں سامنے آیا ہے جب ہمارے معاشرے میں ذات کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور بے سمتی کا نمایاں احساس پایا جاتا ہے۔ یہ احساس اس پُر آشوب دَور میں اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں اس امر کا احساس ہو چکا ہے کہ ہماری اقدار اندر سے اس قدر گل سڑ چکی ہیں کہ اگر اس صورتِ حال میں تبدیلی کا اہتمام نہ کیا گیا تو معاشرہ اپنی موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔''(۹۲)

بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' میں یہ نقطۂ نظر اپنایا ہے کہ رزقِ حرام کی وجہ سے فرد انفرادی سطح پر اور معاشرہ اجتماعی سطح پر

اخلاقی اور روحانی زوال سے دوچار ہو رہا ہے۔ فرد اور معاشرہ میں حرام اور حلال کی تمیز ختم ہو جانے سے منفی اثرات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جب انفرادی سطح پر فرد اور اجتماعی سطح پر معاشرہ رزقِ حرام کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آنے لگتا ہے جو بظاہر ترقی یافتہ نظر آتا ہے لیکن اندر سے کھوکھلا، تضادات سے بھرپور اور فرسودہ سماجی اقدار سے چمٹا ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے کا مجموعی تصورِ اخلاق پست ہو جاتا ہے۔ مذہب صرف ظاہری عبادات کی ادائیگی تک محدود رہ جاتا ہے، جبکہ اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدریں رسم و رواج اور روایات میں کھو جاتی ہیں۔

زوال پذیر معاشرے میں مذہبی لبادے کے اندر اخلاقی پستی کو بانو قدسیہ نے عابدہ کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک پاکٹ سائز بہشتی زیور ہے اور مذہب کو اپنی خاص قسم کی پریکٹیکل عقل کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ ماسی اُلفت اور عزیز گاتن کے ضمنی کرداروں کے ذریعے بانو قدسیہ نے معاشرے کے پست تصورِ اخلاق، طبقاتی امتیاز اور متضاد و منافقانہ مذہبی اقدار پر کڑی تنقید کی ہے۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ جب معاشرہ زوال آمادہ ہوتا ہے تو اس کے اندر حقوق کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جس قدر حقوق کا مطالبہ زور پکڑتا ہے اُسی قدر محبت کی قدر ختم ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کا بنیادی حق صرف محبت ہے اور جب حقوق محبت کے بغیر ملتے ہیں تو یہ افراد پر منفی اثرات مرتّب کرتے ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں محبت کی قدر ختم ہو جائے اور حقوق کی مانگ بڑھ جائے وہاں نفسانفسی اور مفاد پرستی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اور معاشرہ حقوق حاصل کرنے کی جنگ سے میدانِ کارزار بن جاتا ہے۔

بانو قدسیہ محبت کے بغیر حق کی قدر کو زوال کا سبب قرار دیتے ہوئے کہتی ہیں:

> ''دیکھو پیدائشی حق چھیننے والوں سے لڑو نہیں بلکہ اللہ کے فضل کی جستجو میں ہجرت کر جاؤ..... تم ویرانے کو جنگل سے بہتر پاؤ گے.....'' راجہ گدھ نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔
>
> ''نہیں جنگل ہمارا حق ہے..... تو ہجرت کرنا چاہے تو تجھے اختیار ہے لیکن پھر تیرا سفر تنہا ہو گا.....'' اپوزیشن کے لیڈر نے کڑک کر کہا.....
>
> ہر گدھ کے حلق سے حق..... حق کی صدا بلند ہونے لگی۔ ان صداؤں سے راجہ گدھ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا، پھر کچھ سوچ کر بولا..... ''سنو جو حق مانگتے ہیں ان کو حق دینا بھی پڑتا ہے لیکن آج تک کوئی جانور کسی کا حق ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا..... حق صرف اوپر والا ادا کر سکتا ہے۔'' راجہ گدھ گویا ہوا..... ''میں اس دھرتی کو بہت پرانا جانتا ہوں اور حق کا

مطالبہ تم سے بہتر سمجھتا ہوں...... میں نے انسان کو شہر بساتے اور حق طلب کرتے ایک مدت سے دیکھا ہے۔ جان لو صاحبو! جب کبھی سڑک بنتی ہے اس کے دائیں بائیں کا حق ہوتا ہے، جو مکان شہروں میں بنتے ہیں، باپ کے مرتے ہی وارثوں کا حق بن جاتے ہیں۔ میرے ساتھ چلو...... چلو چل کر دیکھو، جب سے انسان نے جنگل چھوڑا ہے اس نے کتنے حق ایجاد کر لیے ہیں۔ ہر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ان حقوق میں پچھلی رات کے مقابلے میں حق بڑھ جاتے ہیں۔ رعایا اپنے حق مانگتی ہے، حکومت کو اپنے حق پیارے ہیں۔ شوہر بیوی سے، بیوی شوہر سے حق مانگتی ہے، شاگرد استاد سے، استاد شاگردوں سے مانگتا ہے...... اصلی حق کا تصور ہی اب انسان کے پاس نہیں رہا...... کچھ مانگنا ہے تو اصلی حق مانگو...... جب محبت ملے گی تو پھر سب حق خوشی سے ادا ہوں گے، محبت کے بغیر ہر حق ایسے ملے گا جیسے مرنے کے بعد کفن ملتا ہے...... مورکھو اگر جنگل والے تمہیں محبت نہیں دے سکتے تو اُن سے اور کچھ نہ مانگو...... اور جنگل چھوڑ دو...... وہ آئے گا تو ہجرت کا اُصول سمجھائے گا...... اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......''

حبشہ کے دیش کی بوڑھی گدھ بولی...... ''ارے یہ ٹھیک کہتا ہے، اس کی بات سنو اور میں تو کہتی ہوں اگر ہو سکے تو محبت بھی نہ مانگو۔ مانگی ہوئی محبت کا مزہ بگڑی ہوئے شرابی جیسا ہوتا ہے۔'' (۹۳)

قدروں سے عاری زوال پذیر معاشرے میں حق کے نام پر مفاد پرستی اور محبت کے نام پر ہوس پرورش پاتی ہے اور ہوس کے شکار انسانوں کی حالت بانو قدسیہ یوں بیان کرتی ہیں:

''انسانی روح کے لیے سب سے زیادہ مقطر اور طیّب محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جب سے بنی قابیل بنی ہابیل پر غالب آئے اصلی اور صادق محبت کا چشمہ قریب قریب سوکھ گیا۔ اب جا بجا ہوس تھی...... جنسی تجربات تھے...... معکوس رابطے، نا فراہمی اور نا آسودگی کی محبت تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو لتا جیض کی طرح استعمال کرتے اور چھوڑ جاتے، محبت میں کجی اور کم فہمی کا رواج عام ہو گیا۔

محلوں میں ان کی نا آسودہ کہانیاں جنم لینے لگیں۔ اخباروں میں بے امن قصے بیان ہونے لگے۔ جب سے بنی قابیل غالب آئے تھے۔ سچی اور پاک محبت کی بارش کے لیے کوئی دعا نہ مانگتا۔ سب ہی جنسی محرومی قلبی تھکن اور روح کے خلا کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے۔ ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجہ گدھ بن جاتا ہے۔''(۹۴)

ناول میں بانو قدسیہ نے زوال پذیر شہری معاشرہ کو موضوع بنایا ہے، جہاں مادیت پرستی نے مذہب اور اخلاقیات کی اصل شکل بگاڑ رکھی ہے۔ وہاں نہ تو فکر خالص رہی ہے اور نہ ہی عمل۔ معاشرہ تضادات کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ ایسے معاشرے میں پرورش پانے والے افراد ذہنی کشمکش، تضادات اور فکری پراگندگی کا ورثہ حاصل کر رہے ہیں۔

اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کے شکار معاشرے کی تضادات سے بھرپور اور کھوکھلی نئی نسل کا نقشہ وہ اس طرح کھینچتی ہیں:

''لیکن وہ مجھے نئی پود کے ان نمائندہ لڑکوں میں سے لگتا تھا، جن کے والدین پاکستان آ کر امیر ہوئے۔ ایسے والدین جن کا تمام تر کلچر مغربی نہیں تھا۔ اب وہ لوگ گھروں میں کھڈی والے فلش کی جگہ کموڈ استعمال کرتے تھے۔ صوفہ سیٹ، کھانے کی میز، ٹی وی، گیزر، ایئر کنڈیشنڈ، آرائش اور سہولت کے تمام Gadgets کے عادی تھے۔ ان آرام دہ گھروں میں پلنے والے لڑکے لڑکیاں محض فیشن کے طور پر Non-Confirmist تھے۔

حیدر بھی ایک ایسا ہی غیر مقلّد تھا۔

حیدر اور اس کے ہم خیال پہلے والدین کی گستاخی کرتے ہیں، پھر پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح گھر سے بھاگ نہیں جاتے بلکہ آرام دہ زندگی کے عادی یہ لوگ بہت جلد والدین سے معافی مانگ لیتے ہیں۔ گفتگو کی حد تک سوشلسٹ اور رہن سہن کے اعتبار سے بورژوا ہوتے ہیں۔ انہیں گھروں میں آرام دہ سلیپر، کھلے کپڑے، نیم دراز اندازِ نشست، ہائی فائے میوزک، جوس، جنسِ مخالف کی کمپنی، امریکی رسالوں کی سیر، لمبے لمبے فون، چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ جونہی گھر سے نکل کر وہ اپنے In-Group میں پہنچ جاتے ہیں، انہیں ہیم برگر، کولڈ کافی، ڈسکو میوزک، موٹر سائیکل سواری، پورنو کتابیں، کلچرل

مباحثوں کا شوق ہوتا ہے۔اس گروپ میں کبھی کبھی وہ اس حد تک غیر مقلّد ہوتے ہیں کہ چرس کے سوٹے لگانا اور سٹرپ ٹیز کی باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہو جاتا ہے۔ تجریدی آرٹ، پاپ میوزک، نثری نظمیں اور امریکی ڈرامے سے وہ گفتگو کی حد تک خوب واقف ہوتے ہیں۔ داڑھیاں رکھنا، ہیلمٹ جیسی ٹوپیاں پہننا، فارن لہجے میں انگریزی بولنا، قصباتی اور دیہاتی کلچر کو قومی سالمیت کی جان سمجھنا، لیکن قصبات سے دور بھاگنا ان کے محبوب Faits ہیں۔ اگر یہ باپ کے Status سے متاثر نہ کرسکیں تو انگریزی کی جیبی پستول خوب استعمال کرتے ہیں۔

یہ لوگ کبھی باغی نہیں ہوتے، کیونکہ انہیں قدم قدم پر ماں باپ کے نام اور دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اچھے دوست نہیں ہوتے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وفاداری ایمان کا اصلی جزو نہیں بلکہ یہ پرسنلیٹی کو بے توازن کرنے والی ایک خاصیت ہے۔

محبت ان کو بار بار ہوتی ہے۔کئی محبتیں مل کر ایک جگ سو پزل تیار ہوتی ہے۔ان کا فلسفہ ہے کہ متفرق محبتوں سے ہی محبت کی وحدانیت پیدا ہو سکتی ہے......اسی لیے محبت میں نہ تو یہ کسی کے پابند ہوتے ہیں، نہ کسی اور کے پابند رہنے سے انہیں فرق پڑتا ہے۔'' (۹۵)

اعلیٰ تہذیبی واخلاقی اقدار سے کٹی نسل ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتی ہے۔ وہ تخلیقی رویوں اور آدرشی زندگی کے نصب العین سے عاری کھوکھلی اور ناکارہ نسل ہے جو مثالی معاشرے کی تعمیر کے لیے فعال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

مصنفہ کا کہنا ہے کہ روحانی اعتبار سے کمزور معاشرہ میں مادہ پرستی بڑھنے لگتی ہے۔ایسے معاشرے کی سب سے بڑی خرابی حرص ہے۔اور اس ایک حرص کی بنا پر وہ کئی روحانی واخلاقی برائیوں کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

وہ معاشرہ جس کی بنیادیں مادہ پرستی پر رکھی گئی ہوں اور حرص وطمع اس کی روحِ رواں ہو، خود کو اخلاقی دیوالیہ پن اور زوال پذیری سے نہیں بچا سکتا۔

بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ حرص کی منفی صفت ازل سے انسان کی سرشت میں موجود تھی۔ جب اس کی روح پر نفس نے غلبہ پایا تو حرص اور لالچ نے اسے گناہ کی طرف آمادہ کیا۔ وہ ناشکرا ہو کر طمع، کینہ اور حسد میں مبتلا ہوا اور انہی منفی خصائص نے اس میں دیوانگی کے آثار پیدا کیے۔ایسی دیوانگی جو ہلاکت خیز ہے۔

پرندوں کی کانفرنس میں بانو قدسیہ انسان کی منفی خصلت پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

اب کوّے بولے...... ''یہ کہاں لکھا ہے کہ انسان کی قربت بغض وحسد کا باعث بنتی ہے۔ آخر انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ پرندوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں......''

مینا نے پَر پھڑ پھڑائے اور سب کو متوجہ کر کے بولی...... ''جس وقت پہلی دیوانگی کا واقعہ ہوا...... قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا اور کوّے نے انسان کی بے بسی دیکھ کر اُس کی مدد کی۔ آسمان سے اترا اور ہابیل کی لاش کو مٹی میں چھپانے کا گُر سمجھایا۔ انسان کی کم ظرفی ملاحظہ ہو۔ شکر گزار ہونے کے بجائے اس نے کوّے کو ہمیشہ ذلیل سمجھا اور پرندوں کو اپنی عقل کے تابع کرنے کی کوشش کی۔

جب بنی قابیل نے جشن منایا تو وہ جنگلی جانوروں کو پکڑ لائے۔ ان کو ذبح کیا، گوشت خود کھایا اور کلے پائے اِدھر اُدھر پھنکوا دیے۔ کتے اور بلّی نے گوشت کی کثرت دیکھی تو اپنے ابنائے جنس کو چھوڑ کر بستیوں میں آ رہے، سیر بھر کر کھایا اور وافر مٹی تلے چھپا چھوڑا...... حرص کا شکار ہوئے......'' (۹۶)

یہاں بانو قدسیہ قابیل اور ہابیل کی قرآنی تلمیح استعمال کرتے ہوئے قابیل کو حسد کا استعارہ بنا کر پیش کرتی ہیں، حسد کی منفی قدر نے قابیل کے اندر دیوانگی کو جنم دیا۔ اس میں ہلاکت خیزی کے میلانات پرورش پانے لگے اور یہ دیوانگی بڑھتے بڑھتے ہابیل کے قتل پر منتج ہوئی...... دنیا کا پہلا قتل حسد کی منفی قدر کی ہلاکت خیزی کے باعث ظہور پذیر ہوا۔

مصنفہ کا کہنا ہے کہ مادہ پرست معاشرہ حرص و ہوس کا شکار ہوتا ہے۔ وہ آرزوؤں اور خواہشوں کا اَسیر ہو کر اُن کے تعاقب میں ہر جائز و ناجائز راستے پر چلتا ہے۔

گدھ، جسے بانو قدسیہ نے مردار خوری کا استعارہ بنایا ہے، اس کا قے کر کے کھانا حرص کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ حرص اس کی دیوانگی کی علامات میں سے ایک ہے۔ مصنفہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ان دِنوں گدھ جاتی نرالی اور انوکھی باتیں کرتی ہے۔ جب سیر ہو چکتی ہے تو پھر قے کرتی ہے اور پھر کھاتی ہے...... ہم اسے کئی برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔ چاند راتوں میں اس کا دیوانہ پن بڑھ جاتا ہے اور یہ مرغزاروں کو چھوڑ کر بے آب و گیاہ بنجر زمینوں پر ایسے بھاگتی

ہے جیسے کشتی بادِمخالف کی سمت میں بھاگی جائے......''

بوڑھی گدھ نے کہا...... ''لیکن کبھی کبھی ہماری حرص کا یہ عالم ہوتا ہے کہ معدے میں مزید کھانے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو پھر ہم پہلو کے بَل لیٹ لیٹ کر کھاتے ہیں...... بادشاہوں کی طرح پہلا کھایا قے کر دیتے ہیں اور...... پھر کھانے لگتے ہیں...... بتا اگر جنگل والے ہمیں دیوانہ سمجھتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔''(۹۷)

مصنفہ کا کہنا ہے کہ حرص و ہوس معاشرے کو زوال کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ جو معاشرہ حرص کو اپنا شعار بنالیتا ہے پھر اُس کی ہر قدر مادی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اعلیٰ آدرشی زندگی، بلند نصب العین، مثالی قدریں سب سیم وزر کے تابع ہو جاتی ہیں۔ ایسے معاشرے کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

''غور کرو...... سوچو ذرا...... تجزیہ کرو ساری سچوایشن کا۔ پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ ۴۷ء میں جوان تھا اور غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ادھر آ کر یعنی ادھر پاکستان میں Migrate کرنے کے بعد سوسائٹی کے ہر خلا کو پُر کیا۔ چونکہ ہندو سے مقابلہ نہ تھا، اس لیے یہ طبقہ، یہ Ambitious طبقہ بہت آگے نکل گیا۔ اس نے قیوم...... ذرا غور سے سوچو، اس طبقے نے افسر شاہی کی وہ روایتیں اپنائیں جو انگریز کی تھیں۔ اس نے وہ تجارت پیشہ پیدا کیے جو آج Business Magnets ہیں۔ اس نے ان بینکروں کو جنم دیا جنھوں نے سارے ملک کو نوٹ زدہ کر دیا...... اس طبقے سے وہ پروفیسر اُٹھے جنھیں تعلیم سے زیادہ گریڈوں کی فکر تھی۔ وہ ڈاکٹر سامنے آئے جو بیرونی ممالک میں اس لیے عمریں گزارتے ہیں کہ وہاں پیسہ زیادہ ہے...... اس طبقہ ہی سے وہ دانشور پیدا ہوئے جن کی اپنی کوئی Conviction نہیں۔ ان کی سوچ چاہے سرخ چین سے آئے یا سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی اپنی نہیں ہوتی۔''(۹۸)

ایسا معاشرہ اگلی نسل کو تضادات کی میراث عطا کرتا ہے۔

''Greed میں مبتلا یہ لوگ ہمیں ایک ہی میراث دے سکتے ہیں، Conflict، اندر کا تضاد، حالات کا تضاد، شخصیتوں کا تضاد......''(۹۹)

حرص، طمع اور ہوسِ آرزو میں گرفتار معاشرے کے افراد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"لیکن Ambitious آدمی کو یہ مار ہوتی ہے قیوم، وہ کسی جگہ جا کر حد مقرر نہیں کر سکتا۔
ان لوگوں کے بینک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں۔لیکن یہ مرض الحرص میں مبتلا لوگ کمائے
جاتے ہیں۔ان کی بیویاں گھروں میں ہیں پر یہ عشق کیے جاتے ہیں......"(۱۰۰)

زوال پذیر معاشرے میں پرورش پانے والے حسّاس اور ذہین انسان خود کو ذہنی وجسمانی شکست وریخت سے نہیں بچا سکتے۔سیمی، قیوم اور سہیل عہدِ حاضر کی ایسی ہی گم گشتہ روحیں ہیں، یہ وہ افراد ہیں جو قدروں سے کٹے معاشرے سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتے۔ان کی بے چینیوں اور اضطراب کے اسباب جہاں ایک طرف ان کی ذہنی وجذباتی اور نفسیاتی ساخت میں نظر آتے ہیں وہاں معاشرہ کا بنجر پن اور اخلاقی پستی بھی ان کی ذہنی وجسمانی شکستگی کا باعث بنتی ہے۔ایک طرف معاشرے کی سماجی واخلاقی ابتری نے ان کے اندر دیوانے پن کے آثار پیدا کیے تھے اور دوسری طرف ان کی ذاتی زندگی کے واقعات وسانحات نے کمزور اخلاقی کردار کے سبب ان میں کج روی اور فکری انتشار پیدا کر کے ان کی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

زوال پذیر معاشرے میں زندگی گزارنے والے افراد دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ایک وہ جو قدروں سے کٹے معاشرے کو قبول کر کے خود کو اس کے مطابق ڈھالنے کی تگ ودو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ناول میں ان کی مثال آفتاب، عابدہ، بھائی مختار اور بھابھی صولت کے کردار ہیں۔دوسرے وہ افراد ہیں جن کی ذہنی اُپج اور حساسیت بنجر معاشرے کا کل پرزہ بننے پر مزاحمت کرتی ہے۔یہ افراد جب مادی قدر کا تجربہ کرتے ہیں تو یہ ان کے اندر تصادم کو جنم دیتا ہے۔اگر یہ افراد روحانی واخلاقی قوتوں کے حامل ہوں تو یہ تصادم انہیں روح کی بالیدگی اور عرفان وآگہی کی منزلوں تک پہنچاتا ہے۔بصورتِ دیگر یہ جنگ اور کشمکش ان کی روحانی وجسمانی شکستگی اور فکری انتشار کا باعث بنتی ہے۔سیمی، قیوم اور سہیل، روحانی و فکری تصادم کی انہیں منزلوں کے مسافر ہیں۔

اقدار سے عاری معاشرے سے سمجھوتہ کرنے والے افراد کی زندگی بظاہر پُرسکون نظر آتی ہے لیکن یہ بے روح اور احساس وجذبہ سے خالی ہوتے ہیں۔ایسے معاشرے کے افراد مشینی زندگی اور معمولات کے اسیر ہوتے ہیں۔انسانی رشتوں کی گرمی اور محبت کی شدت عنقا ہو جانے سے یہ کٹھ پتلیوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔

بھائی مختار کے بارے میں قیوم کہتا ہے:

''بھائی مختار کی ساری منزلیں مادی تھیں...... وہ ساندے سے گلبرگ تک پہنچنا چاہتے تھے......ان کے سامنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا گول تھا۔ موٹر سائیکل سے جاپانی کارتک کا سفر، بیوی کے کپڑے زیورات کی فکر، سوسائٹی میں اچھی پوزیشن اور ساکھ کے لیے کوشش، اپنی نوکری میں سالانہ رپورٹ کی عمدگی اور سال بہ سال ترقی کے امکانات کے لیے جدوجہد...... نچلی منزل میں کبھی چاند نے شکل نہ دکھائی تھی...... وہاں دن چڑھے چیونٹیوں کا سفر شروع ہو جاتا۔ مختار بھائی تفریح کے وقت ٹرانسسٹر سنتے، جس طرح کاسٹیم جیولری سے عورت میں کچھ ٹین پن کچھ سنتھیٹک فائبر شامل ہو جاتا ہے اسی طرح زیادہ ریڈیو سننے والوں کے نقطۂ نظر بڑے عقلی، مادی، جمہوریت پسند ہو جاتے ہیں۔ وہ ریڈیو پر ہونے والے مباحثوں سے ضمنی مسائل چن کر باتیں کرتے ہیں...... ان کی زندگیوں سے چاند کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ صرف چیونٹیوں کی منزلیں باقی رہ جاتی ہیں......''(۱۰۱)

مادی اقدار کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینے والے کی زندگی سے تعلقات میں محبت اور احساس کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ قیوم کا اپنے بھائی اور بھابھی کے ساتھ رشتہ انتہائی کھوکھلا اور میکانکی انداز لیے ہوئے ہے۔

''اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بھائی مختار اندر آئے۔ راجپوتی مونچھوں والے...... سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے میرے بھائی نے کھانس کر میری جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''بیمار ہو؟'' آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی نے سوال کیا۔

''جی نہیں......'' میں یکدم چوکنا ہو گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک اپنے گھٹنے دیکھتے رہے۔

''نارمل صحت مند آدمی کو......ایک وقت پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے...... ورنہ وہ صحت مند نہیں رہ سکتا!''

''جی''

''اچھا ہے تم اب باقاعدگی سے دفتر جانے لگے ہو......اور مجھے خوشی ہے کہ تم پہلے سے بہتر ہو

رہے ہو......نئی موٹر سائیکل کی بھی مبارکباد ہو......''

''جی''

''کالج کے زمانے میں ہر نوجوان کو عشق ہو جاتا ہے...... یہ واقعہ قریباً سب کو پیش آتا ہے......لیکن اس کو روگ بنانا درست نہیں......''

''ہر آدمی اوسطاً زندگی بھر میں پانچ یا چھ فل سائز عشق کرتا ہے اور ہر عشق سے جانبر ہونے کے لیے اسے اوسطاً چار سے چھ ماہ تک لگتے ہیں......تم نے بہت دیر لگادی......!''

میں چپ رہا۔

''تمہاری بھابھی کا بھی یہی خیال ہے کہ شادی کی یہی عمر ہے۔اس کے بعد شادی بالکل بیکار ہے کیونکہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں......پھر آدمی کسی اور کے لیے زندگی میں جگہ نہیں بنا سکتا۔''

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

وہ چپ چاپ واپس چلے گئے، جیسے چھٹی کی درخواست منظور کرالی ہو...... (۱۰۲)

بھابھی اور بچوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بھی ایسی ہی بے رُخی اور بے حسی لیے ہوئے ہے۔ بانو قدسیہ ناول کے کرداروں کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہیں کہ مادہ پرست معاشرہ کے افراد تنہائی، مردم بیزاری اور مردنی کے آزار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جب رشتے محبت سے عاری ہونے لگتے ہیں تو معاشرے میں شکستہ خاندانوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔سیمی کا تعلق ایسے ہی گھرانے سے ہے جسے خاندانی اقدار کی شکست وریخت کا سامنا ہے۔

سیمی کے خاندان میں ماں اور باپ دونوں ہی روایتی مثالی کردار کھو چکے ہیں۔ والدین کا نیا کردار سیمی کی ذہنی و جذباتی تشفی کے لیے ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ان کا طرزِ عمل سیمی میں کئی طرح کے نفسیاتی اور جذباتی مسائل کا باعث بنتا ہے۔

سیمی ایک باشعور اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حسّاس لڑکی ہے۔ وہ گھر کے ماحول سے دلبرداشتہ ہے اور کسی طرح بھی شکستہ خاندان کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتی۔اس گھر کے ماحول سے اس نے تضادات اور محبت کی ناآسودگی کا کرب حاصل کیا ہے۔ایک موقع پر وہ قیوم سے کہتی ہے:

''جانے دو قیوم......تم کو ایسے ماں باپ سے پالا نہیں پڑا۔تم کو پتہ نہیں یہ ambitious

لوگ کیسے ہوتے ہیں...... تمہیں پتہ نہیں I have gone through all۔''(۱۰۳)

''گھروں میں کچھ جھوٹا سچا دبدبہ ہونا چاہیے...... جھوٹا سچا پیار...... ورنہ ہوسٹل بہتر ہے۔''(۱۰۴)

''اوہ یہ سب کچھ، یہ میرے ماں باپ ان کی زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے...... اتنی بچگانہ ہے کہ میں...... میں اس میں نہیں جاسکتی واپس...... کبھی نہیں...... بتاؤ جب ماں ہی بیٹی سے ڈرتی ہو تو اجازت کون دے گا...... میں کس سے اجازت لے کر ہوسٹل آتی...... بتاؤ ناں......''(۱۰۵)

شکستہ خاندانی اقدار کے ماحول میں پرورش پانے والی سیمی بے معنویت، تنہائی، مایوسی اور محبت کی محرومی کے سبب انتشارِ ذات کا شکار ہو کر خودکشی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔

سیمی کی کہانی کے ذریعے مصنفہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے میں جب مادہ پرستی کی اقدار جنم لینے لگتی ہیں تو یہ خاندان کی جذباتی زندگی پر اثر انداز ہو کر اس کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاتی ہیں۔ ایسے گھرانوں میں پرورش پانے والے بچے نفسیاتی اور جذباتی عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ بدلتے ہوئے سماجی پس منظر اور روایتی معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کا اَلمیہ بیان کرتے ہوئے چندرا گاؤں کو روایتی معاشرے کی علامت اور ماں کو اس معاشرے کی اخلاقی وسماجی اقدار کا استعارہ بناتی ہیں۔ ماں کے مرتے ہی گھر اور گاؤں کو کلر چاٹ گیا۔

''سارا گاؤں بے آباد پڑا تھا، کسی کسی آنگن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن گلیاں سونی تھیں۔ بہت سے کچے پکے گھروں کے دروازے جانے والے مکینوں کی یاد میں کھلے پڑے تھے...... یہ وہ چندرا نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا۔ تب تو ہرے ہرے کھیتوں میں تانگہ جاتا ہوا نظر بھی نہ آتا تھا۔ تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی...... ماں زندہ تھی تو چندرا کا گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔ سارے درخت ہرے بھرے تھے، سب کھیت لہلہاتے تھے۔ ہر کنویں میں میٹھا پانی تھا۔ ہر کسان کے گھر دانے تھے۔ اب سارے میں کلر ہی کلر تھا۔ موت ہی موت تھی۔ اور ماں کہیں بھی نہیں تھی...... ماں تھی تو آنگن آباد تھا۔ گاؤں زندہ تھا۔''(۱۰۶)

چندرا گاؤں کی علامتی حیثیت کے بارے میں نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

''قیوم کا ماضی دراصل اس کے ماں باپ کا ماضی ہے، جس میں اس دیہی تہذیب کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جو نئے شہروں کے قیام سے پہلے کا پاکستان ہے۔ یہ دراصل بدلتے ہوئے سماجی پس منظر کی علامت ہے۔ اور بنجر ہوتی ہوئی زمین وہ ماضی ہے جو اب نئے سماج کے لیے فرسودہ اور نا قابلِ عمل ہو چکا ہے۔ قیوم اس تبدیلی کو محسوس کرتا ہے لیکن اس کی طرف لوٹ کر واپس جانا اب اس کے لیے بھی ممکن نہیں رہا۔ اس کا بڑا بھائی، جو ماضی سے الگ ہو چکا ہے اور کبھی بھول کر بھی اس کو یاد نہیں کرتا، وہ نئے پاکستانی معاشرہ کی علامت ہے، جس کے نزدیک قدر یا اقدار والے معاشرے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرزِ احساس میں آفتاب بھی شریک ہے۔ اس کی زندگی بظاہر پُرسکون لیکن کھوکھلی ہے۔ قیوم ایک حسّاس ذہن کا مالک ہے جو اِن تبدیلیوں سے متصادم ہونے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا لیکن اپنی ذات کے اندر نئی مادی قدر کا تجربہ کرتا ہے۔ قیوم کا یہی تجربہ اس پورے ناول میں شروع سے آخر تک پھیلا ہوا ہے......''(۱۰۷)

بانو قدسیہ روحانی اقدار پر یقین رکھتی ہیں۔ وہ صبر، دعا، بد دعا اور شدید خواہش کی طاقت کے کرشموں کا بیان جا بجا کرتی رہتی ہیں۔

''یہ علاقہ ایک زمانے میں لہریں مارتا چاند کی طرف لپکتا، زمردیں سمندر تھا۔ پھر کسی جوگی نے جو تین صدی سے اس کے کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا، سمندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔ سمندر ایسے لوٹا کہ ہر ہر لہر پالا گن پالا گن کہتی بحیرہ عرب میں جا گری اور اس علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں......''(۱۰۸)

مصنفہ کہتی ہیں کہ صبر اور ایمان ایسی مثبت روحانی قوتیں ہیں جو معاشرے سے مایوسی اور نا اُمیدی ختم کر کے اسے تعمیر و ترقی کی راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ ایسا معاشرہ جس میں صبر، امید اور ایمانِ کامل کی مثبت روحانی قوتیں موجود ہوں اُسے مشیتِ ایزدی سے انعامات و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔ پرندوں کی زبان میں اسے استعاراتی انداز میں یوں

بیان کیا گیا ہے:

''نسلِ انسانی کے اِکا دُکا قافلے پانی کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ ان کی تلاش ایسی تھکا دینے والی تھی کہ قافلے کے لوگ ہر پڑاؤ پر گھٹتے گئے اور پڑاؤ کم ہوتے گئے...... یہ دوسرے ست جگ کے آغاز کا ذکر ہے۔ تب پرندوں نے تبت کی اونچائی پر بیٹھ کر سوچا کہ آؤ یہاں سے پرواز کریں اور کسی ایسے سیارے میں چل کر گھر بنائیں، جہاں انسان کی دیوانگی سے پناہ ملے...... وہ کئی روز تک مشیت ایزدی کے انتظار میں رہے اور ہجرت نہ کر سکے...... حتیٰ کہ ان کا صبر دیکھ کر اللہ کی رضا سے تمام براعظموں پر پھر سے ہاتھی ڈباؤ گھاس اُگ آئی۔ جنگل ہرے بھرے ہو گئے اور تال میٹھے پانیوں سے بھر گئے۔''(۱۰۹)

مصنفہ جہاں صبر، دعا اور ایمان کی مثبت قوت پر یقین رکھتی ہیں وہاں دل سے نکلی ہوئی بددعا اور خواہش کی طاقت پر بھی ایمان رکھتی ہیں۔ وہ چندرا گاؤں کے اجڑنے کو ماسی اُلفت کی بددعا کا نتیجہ قرار دیتی ہیں۔

'' کچھ دن ماسی اُلفت نے اس کی تلاش کی۔ پھر ایک دن اس کی ماں نے جو گلہ اپنے گاہکوں کو دھونس دے دے کر جمع کیا تھا تندور کے دہانے پر مار کر توڑا اور بَڑ کے درخت تلے سارے روپے، اٹھنیاں، چونیاں، دس پیسے، نوٹ یوں پھینکے جیسے عزیز گاتن کی برات پر سے سوٹ کر رہی ہو۔ وہ پیسے پھینکتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی...... اٹھا لو...... اٹھا لو کتو...... اٹھا لو...... میں نے عزیز گاتن پر وارے اٹھا لو...... اس گدھ نے خاکی رنگ کے کھیس کی بکل مار رکھی تھی اور پیروں میں کچھ نہ تھا۔

پھر راجہ گدھ سیم نالے کے ساتھ گرتا پڑتا چلنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے دونوں بازو آپی آپ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر وہ بغیر ٹھوکر کھائے گر جاتا...... کچھ فاصلے تک میری نگاہوں نے اس راجہ گدھ کا تعاقب کیا، اس کے بعد ماسی اُلفت ہمیشہ کے لیے افق میں کھو گئی۔ اچانک ماسی اُلفت اور عزیز گاتن کے غائب ہونے پر اور تو کچھ نہ ہوا، صرف چندرا گاؤں کے باہر پھیلنے والا کلر گاؤں کے اندر بڑھنے لگا۔ ہر آندھی کے ساتھ ہر بارش کے ساتھ...... ہر موسم میں اس کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔ اونچے اونچے درخت ٹنڈ منڈ

ہوئے......‘‘(۱۱۰)

امتل اور سیمی نے مرنے سے پہلے سچے دل سے جو خواہشیں کیں وہ اسی طرح پوری ہو کر ظہور پذیر ہوئیں۔ امتل کی خواہش تھی کہ اس کی موت کسی اپنے کے ہاتھوں ہو۔ جس رات بابا ترت مراد اور بابا شاہ جمال کے مزار پر اس نے یہ دعا مانگی، اسی رات وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ سیمی کی خواہش تھی کہ اس سال کرسمس والے دن زلزلہ آئے کچھ ہونا چاہیے پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے۔ اور پھر کرسمس کی رات جب اس نے خودکشی کی تھی ایران میں آنے والا زلزلہ ساری رات لاہور کی دھرتی کو بھی ہلاتا رہا تھا۔

آفتاب کے بیٹے افراہیم کا کردار بانو قدسیہ کی تصوف میں گہری دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ دس سالہ عجیب الخلقت بچہ ہے جو اپنی تیسری آنکھ سے وہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے جسے انسانی فہم و فراست سمجھنے سے قاصر ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول کو ایک تمثیلی جہت بھی دی ہے۔ ناول کے ہر دوسرے باب میں پرندوں کی کانفرنس پیش کی گئی ہے جو گدھ پر دیوانگی کے الزام کے بارے میں منعقد ہوتی ہے۔ گدھ کو اس ناول میں علامتی حیثیت حاصل ہے۔ مردار خوری کے حوالے سے اسے اخلاقی و روحانی زوال کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ ’’یہ ایک طرف پورے ناول کو موضوعاتی وحدت (Thematic Unity) عطا کرتا ہے تو دوسری طرف ناول کے مرکزی کردار قیوم اور اُس کے حوالے سے پوری انسانی برادری کے عمل کی توضیح و تشریح بھی ہے......مردہ خوری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دیوانگی خواہ گدھ کی ہو یا انسان کی، موجودہ دور میں انسان کی فطرت بن چکی ہے اور انسانی فطرت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خارجی دباؤ کے کم ہونے پر اپنے اظہار کے لیے مواقع ڈھونڈتی ہے۔ گویا کہ موجودہ عہد خارجی دباؤ (سماجی اور مذہبی اقدار) کے کم یا ختم ہو جانے کا عہد ہے اور اب انسانی فطرت کو اظہار کی مکمل آزادی حاصل ہے۔‘‘(۱۱۱)

گدھ کے حوالے سے بانو قدسیہ مردار خوری سے پیدا ہونے والے منفی خصائص حرص و طمع، بے نام جستجو، فکری انتشار اور ذہنی و جسمانی شکست و ریخت کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔ گدھ کی زندگی موت سے نمو پاتی ہے۔ اس امر کو وہ لاحاصل آرزوؤں اور مردہ خواہشات کے سہارے زندگی گزارنے کا استعارہ بناتی ہیں۔ گدھ کی مردار خوری، انسان کے حرام فعل سے مشابہہ ہے۔ انسان نہ صرف جسم کا حرام کھاتا ہے بلکہ روح کا حرام کھانے کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

روح کے حرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

’’انسان حیلہ جوئی اور مکر سے کماتا ہے، بھائی کا حق غصب کر کے کھاتا ہے۔ اپنوں کی دشمنی

میں غیروں سے مل کر کما تا ہے۔صلۂ رحمی کا خیال نہیں کرتا۔ ہر آنے والے مال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر کھاتا ہے۔ جو کھا نہیں سکتا اُسے کتے کی طرح چھپا کر رکھ چھوڑتا ہے۔حرام روزی کے انسان کو اتنے گر آتے ہیں جتنے کھونسلہ بنانے کے ہمیں طریقے یاد ہیں۔'' (۱۱۲)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ حرام خوری موجودہ عہد میں انسانی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ روح اور جسم دونوں کا حرام کھا رہا ہے اور نتیجہ میں دیوانگی اس کا مقدر بن رہی ہے۔

پرندوں کی کانفرنس کے ذریعے بانو قدسیہ دیوانگی کے اسباب وعلت پر بحث کرتے ہوئے مختلف علوم کے حوالے سے سماجی ونفسیاتی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عشقِ لا حاصل، لامتناہی تجسّس اور موت کی آگاہی کو انسانی ذہن کے ارتقاء اور دیوانگی کے ضمنی اسباب قرار دیتے ہوئے رزقِ حرام کو نسلِ انسانی کی دیوانگی کا اصل اور بنیادی سبب قرار دیتی ہیں۔

مصنفہ کہانی کے واقعات اور ناول کے کرداروں کی ذہنی وجذباتی اور جسمانی وروحانی زندگی پر ان اسباب کے اثرات کا احاطہ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ناول کا پہلا حصہ عشقِ لا حاصل کے عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔سیمی کی زندگی بظاہر عشقِ لا حاصل کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہوئے دکھائی گئی ہے لیکن بین السطور میں رزقِ حرام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

عشقِ لا حاصل

سیمی کے کردار کی تشکیل اور اس کے شعوری ولاشعوری افعال کی تشریح وتوضیح کے لیے بانو قدسیہ فرائڈ کے نظریۂ جنس کو پس منظر میں رکھے ہوئے نظر آتی ہیں۔

وہ عشقِ لا حاصل کی مثبت قوت کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اس وقت نجد کی رہنے والی ایک بلبل بولی......

دوستو! گدھ کی دیوانگی کا سراغ انسان کی پراگندگی میں ملے گا اور انسان کے پاگل پن کی وجہ ایک ایسی قوت میں پنہاں ہے جو اگر آگے نہ جائے تو ریزہ ریزہ کرنے لگتی ہے......انسان کی

ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے، وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنس استعمال نہیں کرتا بلکہ طاقت کے اس مُشکی گھوڑے کو اپنی رانوں میں دَبا کر رکھتا ہے۔ پھر یہی برق رفتار اسے دنیا اور دین کی مسافتیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے، ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی، آرٹ جنم لیتا ہے، دنیا درکار نہ ہو اور قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے۔ اگر یہ قوت منقبض ہو جائے تو خودکشی کرتا ہے...... عشقِ لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، زنجیروں سے باندھتے ہیں۔ دیوانگی کی اصل وجہ یہی عشقِ لاحاصل ہے آقا۔'' (۱۱۳)

پرندوں کی زبان سے جنسی محرومی، جذباتی ناآسودگی اور عشقِ لاحاصل کو دیوانگی کا سبب قرار دیتے ہوئے وہ انہی کے حوالے سے سیمی اور قیوم کی ذہنی وجذباتی صورتِ حال اور روحانی واردات کا جواز پیش کرتی ہیں۔

سیمی کے عشقِ لاحاصل نے جہاں اسے ذہنی وجذباتی اور روحانی کرب میں مبتلا کیا ہے وہاں وہ اس کی قلب ماہیت کا باعث بھی بنا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ناول میں محبت قلب ماہیت کرنے والا عمل ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے گلبرگ کی جین پہننے والی اور گاگل لگانے والی سیمی شاہ ناکام محبت کے بعد آفتاب کے نام کی مالا جپتے جپتے میرابائی کی طرح جوگن بن جاتی ہے۔ ایسی جوگن جس کا خارج اَلٹرا ماڈرن لڑکی کا ہے۔ مگر جو من میں سلگتی برہا کی اَگنی میں ایک دن جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے سیمی کی موت کو عشقِ لاحاصل کی طبعی موت خودکشی یا دیوانہ پن کی ''معراج'' قرار دیا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ عشقِ لاحاصل ہی ہے جو سیمی کے کردار کے بلند ترین خصائص اُجاگر کرتا ہے۔'' (۱۱۴)

سیمی کے حوالے سے عشقِ لاحاصل قلب ماہیت کر کے مثبت رُخ اختیار کرتا ہے جبکہ جنسی محرومی اور محبت کی ناآسودگی کو قیوم کے حوالے سے بیان کر کے اسے شخصی زوال اور اخلاقی دیوالیہ پن کا استعارہ بنایا گیا ہے۔ بقول نجد کی بلبل

''انسان اسی قوت کی بدولت دیوانہ ہوتا ہے...... مان لو صاحبو جب قوت کو نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پھر وہ اس باسن کو توڑ دیتی

ہے جس میں اسے جمع کیا جاتا ہے۔ [(۱۱۵)] اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے، ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔'' [(۱۱۶)]

قیوم جنس کی طاقت کے مشکی گھوڑے پر ڈھیلا بیٹھا تھا اس لیے دیوانہ وار گرا اور پاگل کہلایا۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''یہی عشقِ لاحاصل ہے جو قیوم کے اندر گدھ کو بیدار کر کے اس کے کرداری زوال کی کہانی کو جنم دیتا ہے۔ ایسا زوال جس کی انتہا میں وہ پستی کی اس حد تک چلا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی منکوحہ کو اس کے عاشق کے حوالے کر دیتا ہے۔'' [(۱۱۷)]

بانو قدسیہ یہ نظریہ پیش کرتی ہیں کہ لاحاصل کا عشق انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ لاحاصل آرزوؤں کے تعاقب میں انسان بے نشاں منزلوں کی جانب رواں دواں رہتا ہے۔ یہ بے سمتی اس کے اندر ذہنی انتشار پیدا کر کے اسے دیوانگی سے ہم کنار کر دیتی ہے۔

ناول کے تقریباً سبھی کردار لاحاصل آرزوؤں کے تعاقب میں دیوانے ہو رہے ہیں۔ سیمی، آفتاب کے عشقِ لاحاصل میں، قیوم، سیمی کی لاحاصل محبت کی خواہش میں، امتل عزت اور محبت کی آرزو کے تعاقب میں، عابدہ بچے کی خواہش میں اور قیوم کا باپ بھی لاحاصل کے تصور میں دیوانہ ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

''میں نے پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا، وہ کسان نہیں تھا۔ ساندل بار کا سانڈ نہیں تھا۔ وہ صرف راجہ گدھ تھا جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری اَٹکائے بیٹھا تھا۔ میرا اباپ دیوانہ ہو چکا تھا......اس کی آنکھوں میں کلر نے چھڑکاؤ کر رکھا تھا......ابا اوپر ممٹی پر کھڑا تھا......اس کے دونوں بازو آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔

راجہ گدھ......عمارت کی آخری اونچائی پر مالیخولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔

میں نے دل میں سوچا۔ جب بھی روح لاحاصل محبت کرتی ہے یہ دیوانے پن سے کیوں دوچار ہو جاتی ہے؟

کیا روح ہمیشہ لاحاصل راستوں پر جانا پسند کرتی ہے۔

کیا اس کے لیے دیوانگی کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں......؟ کوئی پناہ نہیں؟'' [(۱۱۸)]

بانو قدسیہ کا خیال ہے کہ لاحاصل آرزوؤں کے تعاقب میں انسان ہمیشہ غلط راستوں کا انتخاب کرتا ہے۔عورت کی آزادی کی خواہش کو بھی وہ اسی ذیل میں رکھتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ عورت آزادی کے حصول کی کوشش میں ان اقدار کو بھی روندتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے جودراصل اس کے تحفظ کی ضامن ہوتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

''اس ہوسٹل سے لے کر فاطمہ جناح تک آزاد عورتوں اور لڑکیوں کا ٹریننگ کیمپ تھا۔ گھروں سے بیزار، روزگار کی تلاش میں پریشان ڈاکٹر بننے اور مستقبل سنوارنے کی آرزو میں بے قرار، عاشقوں سے رنجیدہ، شوہروں کی تلاش پر مصر، گھر والوں سے کٹی ہوئی، گھر والوں کی یاد میں بے قرار بہت سی عورتیں بہت سی لڑکیاں رہتی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر جب کبھی میں یہاں سے گزرا ہوں، مجھے فاطمہ جناح کالج سے لے کر وائی ڈبلیوسی اے کے ہوسٹل تک اور حضرت حسین سنجانی کے مزار تک آہوں کا ایک مرغولہ اس رقبے پر معلّق نظر آیا...... وائی ڈبلیوسی اے میں پلازہ سینما کے شو کے ساتھ ساتھ یہاں بھی کلاس ٹوٹا کرتی تھی...... سب خوش لگتی تھیں...... سب کی سب خوش فہموں میں مبتلا تھیں...... سب کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح کی Disillusionment...... ہلکی سی گرد...... ازالہ سحر کی عدم میلان طبیعت...... کی...... ہلکی سی میک اپ کی تہ......

یہ تمام عورتیں لڑکیاں کسی نہ کسی طرح مردوں کے نارمل نیوکلیس سے کٹی ہوئی تھیں...... معاشرے کے رسمی طریقے کے مطابق وہ Carrier گرلز تھیں۔ایسی مینڈکیاں جن کو ہلکا ہلکا زکام ہو چکا ہے...... وہ اعلانیہ سگریٹ پیتی تھیں...... یہ سب تو چھپکلی کی کٹی دُم کی طرح پھڑک رہی تھیں...... تڑپ رہی تھیں اور اپنے اصلی رسمی نیوکلیس کی تلاش میں تھیں۔سیمی بھی ان ہی چہروں میں سے ایک تھی...... اس کے چہرے پر بھی ہلکی سی گرد رہتی تھی میک اپ کی...... ازالۂ سحر کی...... عدم میلانِ طبیعت کی...... فریبِ آرزو کی......''(۱۱۹)

خواہشوں اور آرزوؤں کے راستے کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''تیسری پگڈنڈی جنگل کو نکلتی ہے۔

یہاں ہر طرف اونچی اونچی گھاس ہے جس میں انسان کی اپنی جبلی آرزوئیں پھن اٹھائے

کھڑی رہتی ہیں۔ ہر آرزو دِل آویز بھی ہوتی ہے اور سر پر کلہاڑی مار کر ختم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ آرزوؤں کا یہ جنگل بڑا طلسماتی ہے۔ اس میں اپنے مارنے اور دوسرے کو مارنے کا کھٹکا ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ تہذیب کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو یہاں پہنچ کر بھی ہارا کری کرنے کے سوائے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ راستہ بھی منزل نا آشنا ہے۔ صرف اسی گرینڈ ٹرنک میں اور کئی راستے آ کر ملتے ہیں۔ سڑک اور چوڑی ہو جاتی ہے لیکن ہمیشہ جنگل میں ہی چلتی ہے۔ اس راستے میں اتنے پل، آبشاریں، نشیب، اونچائیاں آتی ہیں کہ جبلت کی تلوار ہاتھ میں رہ جاتی ہے اور آہنی زرہ کے بوجھ تلے آدمی مر جاتا ہے۔'' (۱۲۰)

ناول کے ایک کردار قیوم کے حوالے سے بانو قدسیہ خواہش اور فریب آرزو کے آزار کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ خواہش کی موجودگی تک انسان خوش نہیں رہ سکتا۔

''اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی، رب بننے کی آرزو رکھتا ہے، وہ کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ چاہا جانا اور آزاد رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی موجود ہے وہ تابع رہتا ہے خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے۔ کبھی حاکم نہیں ہوسکتا۔

خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر، کیسے؟

موت سے پہلے موت...... زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی...... آخری نجات سے پہلے کلی فرار۔'' (۱۲۱)

بانو قدسیہ کے خیال میں لاحاصل کا کرب انسان کو ذہنی و روحانی طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ خواہ یہ لاحاصل محبت ہو یا لاحاصل آرزوئیں، وہ انہیں زرقِ حرام ہی کی ایک صورت قرار دیتی ہیں جو انسان کی روحانی، ذہنی و جسمانی شکست و ریخت کا باعث بنتی ہیں۔

لامتناہی تجسّس

پرندوں کی کانفرنس میں گدھ کا وکیل گیدڑ عشقِ لاحاصل کے تصور کو رَد کرتے ہوئے لامتناہی تجسّس کو دیوانگی کا اصل سبب قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

''دیوانگی کا عشقِ لاحاصل سے کوئی تعلق نہیں...... دیوانگی تلاش سے پیدا ہوتی ہے مسلسل نئے سوالوں کے ناتسلی بخش جواب...... تھکا دینے والی جستجو دیوانہ کرتی ہے۔''(۱۲۲)

''شروع میں عشقِ لاحاصل سے جو بات شروع ہوئی تھی اس کا ناطہ یہاں بانو نے بے نام جستجو سے جوڑ دیا ہے۔ اپنی ناپائیداری کا احساس اس کے ساتھ ابدیت کی خواہش...... یہ بھی دیوانگی کا حصہ بن گئی۔ انسان نے اپنی دیوانگی کے تحت مسلسل نئے سوالوں کے ناتسلی بخش جواب حاصل کیے، جس سے اس میں احساسِ محرومی، ذہنی کنفیوژن اور فکری کج روی پیدا ہونے لگی۔ بے نام جستجو نے اس کی دیوانگی کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بانو نے انسانی جستجو کو مقیّد کرنے کی کوشش کی ہے؟ شاید ایسا نہیں ہے۔ بانو جستجو کے سیکولر Secular نظریے سے اختلاف کرتی نظر آتی ہیں کیونکہ جستجو کا دائرہ روحانیت کے پلیٹ فارم سے جتنا دور ہوتا چلا جائے گا، اس کے اثرات اتنے ہی خراب ہوں گے۔ مثلاً سائنس کی اسلحہ کے ذیل میں ہولناک ایجادات نے انسان کے مستقبل کو قطعاً تاریک بنا دیا ہے۔''(۱۲۳)

قیوم کے کردار کو بانو قدسیہ لامتناہی تجسّس، بے معنی جستجو اور وجود کی معنویت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے انسانوں کا استعارہ بناتی ہیں۔

سیمی کی موت کے بعد قیوم کے اندر کئی طرح کے سوالات سر اُٹھانے لگے، جن کا کوئی تسلی بخش جواب اس کے پاس نہ تھا۔ وہ ذہن میں ابھرتے سوالوں اور تلاشِ بے سود کے ہاتھوں فکری بے راہ روی کا شکار ہونے لگتا ہے۔

''میرے اندر سیمی کے مرنے سے کئی سوالات اُبھر آئے تھے اور ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے کوئی موجود نہ تھا...... سیمی کے مرنے کی وجہ کیا تھی؟...... اگر کوئی خدا تھا تو اس نے سیمی جیسی لڑکی کو مرنے کیوں دیا؟...... اگر روح موجود تھی تو پھر وہ اب مجھ سے مل کیوں نہیں سکتی

تھی؟......

میری سوچ...... نیوکلیس سے نکل کر دائرہ در دائرہ بہت دور تک باہر کو پھیل جاتی اور آخر......

میں سوچتا رہ جاتا۔

میں کون ہوں؟

کہاں سے آیا ہوں؟

مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے؟

اور اگر مجھے کہیں نہیں جانا اور اسی مٹی میں نائٹروجن کی بھاری مقدار بن کر واپس لوٹنا ہے تو پھر

یہ ساری تگ و دو کیوں؟...... یہ سارا عذاب کس لیے؟

کائنات کیا ہے؟

اس کائنات کے پیچھے کون چھپا بیٹھا ہے؟

کیا کائنات والے سے ہمارا بے حقیقت ذرّات کا کوئی تعلق ہے؟'' (۱۲۴)

قیوم نے ذہنی پراگندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یوگا اختیار کیا لیکن یہ اسے جنس کے راستے پر لے گیا۔ عابدہ کے ساتھ اس کا جنسی تعلق اس کی روح کو مزید شکستہ کر کے اسے ذہنی و نفسی بیماریوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ گویا بانو قدسیہ یہاں یہ کہنا چاہتی ہیں کہ انسانی ذہن میں ابھرنے والے مابعدالطبیعیاتی سوالات کا جواب علم کے پاس موجود نہیں ہے۔ یہاں مصنفہ علم کی کوتاہی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قیوم اور سہیل دونوں ہی کتابی اور علمی دنیا کے انسان ہیں۔ سہیل نے دنیا بھر کے طبیعیاتی اور مابعدالطبیعیاتی علوم کا اور سائیکالوجی سے لے کر پیرا سائیکالوجی تک کے مضامین کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ لیکن اس کی علمی وسعت اس کی تلاش کے سفر کو کسی منزل پر نہیں پہنچا سکی ہے۔ روح کی تشنگی کے خاتمے اور حقیقی مسرت کے حصول میں سہیل کی علمی کاوشیں ناکام رہتی ہیں۔ ایک موقع پر وہ کہتا ہے:

''میں کچھ نہیں جانتا قیوم کچھ تھوڑی سی سوجھ بوجھ آ گئی ہے...... لیکن صرف کتابوں سے مجھے عینی یقین حاصل نہیں۔ بس میرے باقی علم کی طرح یہ بھی ایک Academic Research ہے۔ لیکن میں تلاش میں ہوں۔''

ایک دوسرے موقع پر خوشیوں کے حصول میں علم کی ناکامی پر پروفیسر سہیل کہتا ہے:

''پتہ نہیں آفتاب کا کیا حال ہے؟ وہ کہاں پہنچا ہے؟ اگر کبھی وہ تمھیں مل جائے تو مجھے امریکہ خط ضرور لکھنا۔ میں چاہتا ہوں وہ خوش رہے۔ اتنے علم کی وجہ سے ہم تو خوش نہیں رہ سکے۔''(۱۲۵)

فلسفہ اور یوگا میں بھی جب قیوم کو ذہنی خلجان اور روح کے اضطراب کا کوئی علاج نظر نہ آیا تو وہ پیروں فقیروں کی رہنمائی میں تلاش کے سفر پر روانہ ہوا لیکن آخر میں سائیں جی کی دھنسی ہوئی قبر سے بانو قدسیہ یہ اشارہ دیتی ہیں کہ متلاشی روح کے لیے کوئی تشفی آمیز جواب یہاں بھی موجود نہیں ہے۔

بانو قدسیہ تلاش کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ہر ایک کو کسی نہ کسی حد تک دیوانگی کا سبب قرار دیتی ہیں۔ کبھی انسان اپنی وحدت کی تلاش میں دیوانہ ہوتا ہے۔ یہاں مصنفہ ایک حکایت کے ذریعے اس تلاش کے آزار کو بیان کرتی ہیں:

''کہنے لگا......''اے مینا! میں اپنی رنگا رنگی سے اُکتا گیا ہوں۔آرزو کی ناکامی ایک حجاب ہے تو آرزو کی بارآوری دوسری قسم کا ایک پردہ ہے۔ میں اپنے میں دو راستے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں اس قدر تنہا ہونا چاہتا ہوں کہ مجھ میں صرف ایک رنگ رہ جائے۔دیکھتی نہیں کہ میں نے ہر ذی روح کو چھوڑ دیا۔نباتات، جمادات مجھ سے چھوٹ گئے۔ میں نے بدی کی ساری پنیری اکھاڑ پھینکی تاکہ نیکی کا خاکستری رنگ میری ذات کو ایک رنگ میں رنگ دے۔ میں اپنی تنہائی کی ایسی اکائی تلاش کر رہا ہوں جہاں بنانے والے کو مجھ پر ترس آجائے گا اور پھر میری وحدت کی بیچارگی کو وہ اپنی وحدت میں سمو لے گا......میں اپنی وحدت کی تلاش میں ہوں تاکہ اس کی وحدت کو پہچان سکوں جو ہمیشہ تنہا رہتا ہے اور جسے زوال نہیں......''

دوسری صبح جب اس کا برق رفتار گھوڑا کھڑکی کے پاس آکر ہنہنایا تو میری آنکھ کھلی......وہ مر چکا تھا۔اس نے اپنے خنجر سے خودکشی کر لی تھی۔ ہر آئینے میں ایک خنجر کا عکس تو موجود تھا لیکن کسی شیشے میں اس صاحبِ جمال کا عکس موجود نہ تھا۔اس کی خودکشی......خودکشی دیوانگی کی دوسری شکل ہے...... کیا اس کی سرشت کی وجہ سے نہ تھی۔ کیا اس دیوانگی کا تعلق اس تلاش سے نہ تھا جو کثرت میں وحدت تلاش کرتی ہے؟''(۱۲۶)

وحدت کے ساتھ انسانی سرشت کے تضاد پر بحث کرتے ہوئے وہ اسے انسان کے ذہنی خلفشار کا سبب قرار دیتی ہیں۔

''آقا انسان نہ رزقِ حرام کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے نہ اُس طاقت کی وجہ سے جس کا ذکر نجد کی مینا نے کیا تھا۔ بلکہ تضاد کے ہاتھوں دیوانہ ہوا ہے...... دن کے ساتھ رات ہے...... زندگی کے ساتھ موت...... شمال کے مخالف جنوب...... لیکن بیچارے انسان کے اندر ہر وقت نیکی بدی کی جنگ ہوتی رہتی ہے...... اگر اس کے اندر جنگ ساکت ہوگئی تو خدا ہار جائے گا۔''
ایک چھوٹا سا کھٹ بڑھی باہر نکلا اور زمین چوم کر بولا...... ''پہلے آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی۔ وہ بھی فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا۔ لیکن ایک روز ابلیس نے موقعہ پا کر اس میں جھانکا۔ اس لمحے حضرت آدم کے اندر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی۔ اگر اللہ اپنے ازن سے اس عکس کو نکال دیتا جو آدم کے دل میں پڑ چکا تھا تو بے انصاف کہلاتا۔ اس لیے اس نے ابلیس کو مہلت دی۔ اور انسان کو ترغیب دی کہ وہ اپنا آئینہ صاف کر لے۔ اس وقت سے آج تک حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ جنگ کا میدان انسان ہے...... اللہ کی کل کائنات میں صرف انسان ایسا ہے جو اپنی سرشت بدلنے پر قاصر ہے۔ اپنے آئینے کو صاف کر سکتا ہے۔ جیت اللہ کی ہوگی لیکن موقع ابلیس کو برابر کا فراہم کیا جائے گا۔ آپ دیکھتے نہیں آقا اس جنگ کی وجہ سے انسان کی کیا حالت ہوئی۔ اگر وہ دیوانہ ہے تو اس تضاد کے ہاتھوں...... فرزانہ ہے تو اسی تضاد کی وجہ سے......''(۱۲۷)

بانو قدسیہ نے قیوم کی ذات میں تضادات کی جنگ کو برپا دکھایا ہے۔ قیوم کا سب سے بڑا تضاد محبت اور جنس کا ہے۔ وہ پاک اور سچی محبت کا طلبگار تھا لیکن اسے بنجر جنسی تجربات کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ سیمی کے ساتھ محبت کی بجائے جنسی تعلق اس کی جسمانی شکستگی اور ذہنی انتشار کا سب سے بڑا سبب تھا۔ اس کا دوسرا تضاد مادی جسم کے ساتھ روحانی دنیا کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرنا تھا۔ مادہ اور روح کے اس تضاد کے ہاتھوں وہ بالکل ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔

بانو قدسیہ یہاں بے سمتی اور تلاشِ بے سود کے مقابلے میں ایک مثبت نظریہ پیش کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں ''مشن'' انسانی زندگی کی بے معنویت کو مقصدیت عطا کر کے اس کی روح کی تشنگی کو دور کر سکتا ہے۔ مصنفہ کے خیال میں

بے معنی جستجو اور بے سود تلاش جہاں انسان کو فکری انتشار سے دوچار کر کے اس کی جسمانی و ذہنی ریختگی کا باعث بنتے ہیں وہاں مشن کی مقصدیت ذہن میں ارتکاز پیدا کر کے روح کو تقویت بخشتی ہے۔

پروفیسر سہیل کی زبان سے وہ مشن کی افادیت کو بیان کرتی ہیں:

''تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہوگی...... کوئی مشن اپنانا پڑے گا، کوئی Goal، کوئی منزل...... ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکو گے...... کبھی بحرِ قلزم میں، کبھی بحیرہ عرب میں...... اپنے اِردگرد دیکھو...... جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، وہ السر کا شکار نہیں ہوتے...... پیغمبروں کی زندگی غور سے دیکھو۔ وہ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے...... کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی...... بے نام جستجو، بے مصرف تلاش نہ ہو...... زندگی میں ایک مشن ہو، چاہے بالکل چھوٹا مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا...... پاکستان کے لیے نئی قسم کی گندم بونا...... پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بُننا...... کسی بچے کو سی ایس پی کرانا...... بھائی میرے...... بیمار ذہن کے مالک! کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا...... اس کا فائدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے...... بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گھٹیا کو الٹی کا آدم سائز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔''(۱۲۸)

پروفیسر سہیل ایک موقع پر قیوم سے کہتا ہے کہ اس کی پریشاں خیالی، فکری افراتفری اور جسمانی و نفسیاتی بیماریوں کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں خود بھی معلوم نہیں کہ تمہاری فکر کا اصل نیوکلیس کیا ہے۔ گویا کہ مصنفہ کے خیال میں بے سمتی اور بے نشاں منزلوں کا سفر ایک ایسا منفی فعل ہے جو انسان کو نہ صرف اخلاقی و روحانی دیوالیہ پن کی طرف لے کر جاتا ہے بلکہ اس کی ذہنی و جسمانی شکست و ریخت کا باعث بھی بنتا ہے، جبکہ مشن کی مقصدیت انسان کو مرکزیت عطا کر کے روحانی خوشی سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

موت کی آگاہی

موت کی حقیقت ہمیشہ سے فکرِ انسانی کے لیے لاینحل سوال رہی ہے۔ موت کی آگہی انسان کو ہراساں کر کے اس

کی روح کومضطرب و بےچین کر دیتی ہے۔

ناول کے آخری حصے ''موت کی آ گاہی'' میں بانو قدسیہ موت کی آ گہی سے انسانی ذہن پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیتی ہیں۔

> ''چرند پرند کوئی موت سے آ گاہ نہیں......صرف انسان موت سے خائف رہتا ہے...... موت! اس کے لیے ایک حقیقت ہے آ قا......بچپن میں وہ باقی ذی روح کی طرح موت سے آشنا نہیں ہوتا لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اوراس میں شعور پیدا ہوتا ہے وہ موت سے شناسا ہونے لگتا ہے...... پہلے چھوٹی چھوٹی حقیقتیں اس پر کھلتی ہیں، ناپائیداری...... بے ثباتی......تبدیلی......موسم بدلتا ہے تو وہ اندر ہی اندر ڈرتا ہے......بچپن گزرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر بےچین رہتا ہے......محبوب کا رنگ گہنا جائے تو وہ تلملاتا ہے...... یہ تبدیلی ناپائیداری...... یہ احساسِ زیاں، یہ سب چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جو ایک منظر کی طرف کھلتی ہیں۔موت کا گھپ اندھیرا......فنا کی آخری منزل...... جانور...... پرندے......سب اس آزار سے آزاد ہیں......لیکن انسان اور میری جاتی کے لوگ صدیوں سے دیوانے ہیں آ قا......صدیوں سے...... اور اسی آ گاہی کی وجہ سے انسان دیوانہ ہے۔ وہ چھوٹی سی ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا چاہتا ہے......کیا اس احساس کے ساتھ کوئی دیوانے پن سے بچ سکتا ہے......''(۱۲۹)

ناول میں بانو قدسیہ نے قیوم کو موت کی آ گہی کے آزار میں گھلتے ہوئے دکھایا ہے۔سیمی اور امتل کی موت کے بعد موت اس کے لیے ایک بہت بڑی حقیقت بن چکی تھی لیکن وہ اس کی اصلیت سے آ گاہ نہیں تھا۔ وہ شب و روز اس فکر میں گھلنے لگا۔موت کے اسرار و رموز جاننے کی سعی میں اس کی فکر لامتناہی سوالوں کے بھنور میں چکر کھانے لگی۔انتہائی پریشان خیالی نے اس کی ذات کو ریزہ ریزہ کر دیا۔وہ Hallucination کی نفسیاتی بیماری کا شکار ہو گیا۔اس کا لاشعور نادیدہ سے دیدہ مخلوق بن کر اس سے ہمکلام ہوتا اور موت کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرتا۔

> سیمی زندگی میں کتنی کربناک تھی......وہ کیسے تلملاتی رہتی تھی اور موت سے ہمکنار ہوتے ہی اس کا چہرہ کتنا شافت......کیسا آزاد ہو گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے میری زندگی کا ہر لمحہ موت کے متعلق سوچنے میں گزرنے لگا۔ موت کے ساتھ ہمکلامی کے بعد مجھ میں ایسا خوف پیدا ہو جاتا کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا...... اس وقت ایک گھنی جھاڑی سے ایک نوگزا آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی آدمی تھے...... وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ہم دونوں میں عجیب طور پر بغیر بولے گفتگو جاری ہوگئی۔

''تم مجھ سے موت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں...... ہاں...... میں جاننا چاہتا ہوں...... انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا...... وہ...... جہاں سے آیا ہے کیا وہیں لوٹے گا کہ کہیں اور...... یہ سارا وقفہ...... یہ ساری دیوانگی...... اس سے چھٹکارا...... کیا موت سے پہلے نہیں ہوسکتا...... کیا آزاد ہونے کے لیے صرف اس سوئی کے ناکے سے گزرنا ہوگا؟''

''بتاؤ...... بتاؤ موت کیا ہے؟ یہ اسرار یہ بھید کیا ہے؟...... فنا کا ذائقہ کیا ہے؟ مرکر آدمی پر کیا بیت جاتی ہے؟''(۱۳۰)

ان سوالات نے قیوم کو ذہنی و نفسیاتی طور پر اس درجہ پریشان کیا کہ وہ باغِ جناح میں پاگلوں کی طرح چکر کاٹتے کاٹتے بے ہوش ہو کر گر گیا اور پانچ دن تک بے ہوش ہی رہا۔

موت کے اسرار و رموز کی کھوج میں وہ سائیں بابا کے دروازے پر دستک دیتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔

بانو قدسیہ یہاں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اخلاقی و روحانی طور پر بنجر انسان کے لیے موت کی آگہی ذہنی انتشار اور خوف کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

عشقِ لاحاصل، لامتناہی تجسّس اور موت کی آگاہی وہ اسباب ہیں جنہیں مختلف فلسفیانہ اور نفسیاتی مکاتبِ فکر کے حوالے سے دیوانگی کی وجوہات قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بانو قدسیہ ان اسباب کو ضمنی قرار دیتے ہوئے، رزقِ حرام کی تھیوری پیش کرتی ہیں۔

رزقِ حرام

بانو قدسیہ پروفیسر سہیل کی زبان سے رزقِ حرام کی تھیوری کو سائنٹفک بنیادوں پر پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی genes کو متاثر کرتا ہے۔ رزقِ حرام سے ایک خاص قسم کی mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزقِ حرام سے جو genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نااُمید بھی ہوتے ہیں۔ نسلِ انسانی سے یہ genes جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرلو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزقِ حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے، وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں......''(۱۳۱)

پرندوں کی کانفرنس میں رزقِ حرام پر بحث کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

''ہم......اس رزقِ حرام کے خلاف ہیں جو اپنی عقل سے کھایا جاتا ہے جس کی مناہی موجود ہوتی ہے اور جو زہر بن کر لہو میں پھرتا ہے اور دیوانگی کا باعث بنتا ہے۔''(۱۳۲)

''عقاب کی ٹولی سے ایک پاپائے روم اُٹھا......''سن مہرلاٹ! رزق دو طور کا ہوتا ہے۔ ایک رزق وہ ہے جو جسم کا ایندھن ہے، جو روح کی توانائی کا باعث بنتا ہے، جیسے پانی، خوراک، حدت، ہوا......جسم کو پالنے کا وسیلہ ہیں۔ اسی طرح عبادت، عشق، قربانی، روح کی استقامت کی غذا ہیں۔ بتا گدھ جاتی کے راجہ کہ تو نے جسم کا حرام کھایا کہ روح کا......بتا وہ رزق کون سا تھا جس سے تیرے جرثومے ٹوٹ کر پاگل پن کا شکار ہوئے؟''(۱۳۳)

''فاضل جج جانتا ہے کہ جسم کا رزق بالآخر روح کو لگتا ہے اور روح کا رزق آخر کار جسم کا حصہ ہو کر رہتا ہے۔ رزقِ حرام چاہے بدنی ہو یا روحی، دیوانہ پن کا باعث ہوتا ہے......''(۱۳۴)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرام کیا ہے؟ مصنفہ اس بارے میں کہتی ہیں:

''حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کر دیا جائے۔''(۱۳۵)

پروفیسر سہیل حرام حلال کی تھیوری بیان کرتے ہوئے اس کی وضاحت یوں کرتا ہے:

''مائی ڈیئر سٹوڈنٹ......حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کیا گیا......اچھے اور بُرے کا سوال نہیں ہے۔صرف جو چیز منع فرمائی ہے اللہ نے، وہ حرام ہے، اسی لیے حرام حلال کا جھگڑا سب سے پہلے جنت میں پیدا ہوا...... جب حضرت آدم نے شجرِ ممنوعہ سے توڑ کر کھایا۔اچھے بُرے کا سوال نہیں تھا......بس وہ جو منع تھا اپنے پر حلال کیا......اس گندم کے دانے کا رزقِ حرام جس وقت ان کے جسم میں داخل ہوا......ایک خطرناک تغیر آیا، ان کے جسم میں، ان کے genes میں......اس تغیر سے اللہ نے انہیں ڈرایا تھا......اس وقت تک حضرت آدم اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے۔ان کا نیوکلیس محفوظ طور سے ٹوٹتا تھا۔لیکن اب اس نیوکلیس میں چھپے ہوئے genes میں تبدیلی آئی۔Genes mutate ہوئے۔لولے لنگڑے اندھے اور نا اُمید آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے......''(۱۳۶)

بانو قدسیہ رزقِ حرام کو دیوانگی کا اصل سبب قرار دیتے ہوئے دراصل عشقِ لاحاصل، لامتناہی تجسّس اور موت کی آگہی سے پیدا ہونے والی دیوانگی کو بھی رزقِ حرام کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں۔

مصنفہ کا نظریہ ہے کہ عشقِ لاحاصل اگر ہوس کا شکار ہو جائے، لامتناہی جستجو میں اگر بے سمتی اور بے سود تلاش شامل ہو جائے اور موت کی آگہی بقا کی بجائے فنا کا دَرس دے کر روح کو خوفزدہ کرنے لگے تو ان حرام افعال و افکار سے انسان دیوانگی کا شکار ہونے لگتا ہے۔بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ دیوانگی جو رزقِ حرام کی وجہ سے پیدا ہو، ہمیشہ ہلاکت خیز ہوتی ہے۔اسے وہ منفی دیوانگی قرار دیتی ہیں۔اس دیوانگی میں بھی ارتقاء کی صورت موجود رہتی ہے لیکن ایک سطح پر پہنچ کر اس کی سمت بدل جاتی ہے اور یہ ہلاکت خیزی کی طرف مڑ جاتی ہے۔ان کا خیال ہے کہ منفی دیوانگی، جو رزقِ حرام کھانے کا نتیجہ ہے، ہلاک خیزی اس کا منطقی انجام ہے۔

پرندوں کی کانفرس میں دیوانگی سے پیدا ہونے والی ہلاکت خیزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جو ذی روح اپنے آپ کو...... یا اپنے ہم جنسوں کو خود ختم کرنے کی کوشش کرے وہ دیوانہ ہوتا ہے۔''(۱۳۷)

دیوانگی، ارتقاء اور ہلاکت خیزی کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

''دیوانے پن میں ارتقاء ہے آگے بڑھنے کا بیج ہے۔'' (۱۳۸)

''تو عادت کا ذکر کرتی ہے...... ہم ارتقاء کی بات کر رہے ہیں۔ بغیر دیوانہ پن کے کبھی کوئی آگے بڑھا ہے...... یہ ارتقاء کی منزلوں میں ہے۔ یہ جو اشرف المخلوقات پھرتا ہے، انسان جانوروں سے کیوں بڑھا ہوا ہے کیونکہ یہ پاگل ہے...... اور ازل سے ارتقاء کی منزلوں میں ہے۔'' (۱۳۹)

مصنفہ کا نظریہ ہے کہ دیوانگی میں ارتقاء ہے لیکن اگر اس دیوانگی میں کہیں رزقِ حرام شامل رہا ہو تو ارتقاء ایک خاص سطح پر پہنچ کر ہلاکت خیزی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ یہاں مصنفہ ہلاکت خیز سائنسی ایجادات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اپنے ہی ہم جنسوں کو تباہ و برباد کر دینا دیوانگی کا واقعہ نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ لکھتی ہیں:

''انسان تمدّن کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر قلابازی کھا گیا تھا۔ اس نے اپنے ہی لوگوں کے لیے ایسے بم ایجاد کیے تھے جن سے نہ صرف انسان ہلاک ہوتا ہے بلکہ عورت کا رحم بچہ بنانے اور مرد کا عضو تناسل بیج بونے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس نے شہروں پر ایسے بم پھینکے کہ میٹھے پانیوں کے ایٹم پھٹ کر زہر میں تبدیل ہو گئے۔ پھر جس نے اس پانی کو چکھا، وہ اوّلین گھونٹ کے ساتھ جاں بحق ہوا......'' (۱۴۰)

ناول میں بانو قدسیہ نے مختلف کرداروں پر رزقِ حرام کی مختلف صورتوں کے اثرات دکھائے ہیں۔ سیمی، عابدہ اور امتل لا حاصل آرزوؤں کے تعاقب میں دیوانگی کی سرحدوں میں داخل ہوئیں۔ سیمی کا عشق، جو روح کا طیّب رزق ہے، اس کے اندر مثبت خصائص جگانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کی روح ارتقاء کی منزلوں سے گزرتی ہے لیکن اس کے اندر تضادات کی جنگ، اور حرام جنسی فعل ہلاکت خیزی کے جراثیم پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں اور وہ عشقِ لا حاصل کی طبعی موت، دیوانہ پن کی معراج! خودکشی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

قیوم جس نے جسم اور روح دونوں کا حرام کھایا ہے وہ دیوانگی کی ہر منزل سے ہو کر گزرا ہے۔

قیوم کا عشق ہوس کا شکار ہوا ہے اس کی لا متناہی جستجو بے سمت اور بے سود تلاش کا سفر بن کر رہ گئی۔ وہ بے معنی تلاش کو مقصدیت کی مثبت شکل نہ دے سکا۔ یہاں قیوم روح کا حرام کھانے کا مرتکب ہوا ہے۔ اس کی سوچیں منفی، فکر منتشر

اور خیال پریشان ہیں۔ وہ بے سمت جستجو کو انسانیت کی فلاح و بہبود کی طرف نہ موڑ سکا تھا۔ یہاں بانو قدسیہ یہ خیال پیش کرتی ہیں کہ انسان کی عظیم سائنسی ایجادات انسانیت کے لیے قاتل بھی ہو سکتی ہیں اور انسانیت کی فلاح بھی کر سکتی ہیں تو پھر کیوں نہ انسان اپنی ذہنی اختراعات اور اُپج کو انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کرے۔

قیوم موت کی آگہی کے کرب سے گزرتا ہے۔ وہ اس سے خوفزدہ ہے اور یہ وہی خوف ہے جس کا ذکر مصنفہ ایک حکایت کے ذریعے کرتی ہیں:

''جوگی آرزو کے جنگل سے نکل تو آیا تھا لیکن تمام آرزوؤں سے چھٹکارا پا لینے کے بعد اب وہ ابدیت کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا۔ ہر صبح جب موت اپنا ترشول لے کر آتی اور برگد کے درخت کے سامنے ترشول پر اپنا سرخ ہاتھ رکھ کر پوچھتی...... چلتا ہے کہ کل آؤں؟

تو جوگی ہنسنے لگتا اور کہتا...... جا اپنا کام کر تو مجھے کیا مارے گی۔

جب موت بہت اصرار کرتی تو جوگی کہتا، جسم لے جاتی ہے تو لے جا!

موت کچھ اور تقاضے کرتی۔

میں اس کی یہ جنگ روز دیکھتا۔

رفتہ رفتہ موت کے آنے پر جوگی چھپنے لگا...... وہ مجھ سے ہر روز ایک بات ضرور کہتا کہ اس کی روح ہمیشہ رہے گی، موت اس کی روح نہیں لے جا سکتی۔

ایک روز صبح کے وقت جب سورج ابھی اچھی طرح دریا سے اشنان کر کے نہ نکلا تھا، جوگی برگد کے درخت سے لٹکا ہوا تھا۔ اس نے برگد کی لٹکتی جڑ سے پھندا لے کر جان موت کے سپرد کر دی تھی...... اس وقت میری سرشت بدل آقا! سوائے انسان کے کوئی موت سے خائف نہیں۔ پہلی بار میں موت سے ڈرا......''(۱۴۱)

موت کی آگہی نے قیوم کے حواس مختل کر دیے۔ دیوانگی کے ہر منفی سبب نے قیوم پر اثر انداز ہو کر اسے نشانِ عبرت بنا دیا تھا۔

دیوانگی کی ایک اور صورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بانو قدسیہ اسے مثبت دیوانگی کا نام دیتی ہیں۔ دیوانگی پر

بحث کرتے ہوئے ناول کا کردار آفتاب کہتا ہے:

''میں جس پاگل پن کا ذکر کر رہا ہوں وہ میر تقی میر کا پاگل پن ہے.....فرہاد کا پاگل پن ہے..... پروفیسر سہیل تو دیوانے پن کی صرف ایک سائیڈ دِکھا رہے تھے، خودکشی اور موت۔ میں دوسری سائیڈ پیش کر رہا ہوں، جہاں پہنچ کر دیوانہ پن مقدس ہو جاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیتا ہے، دودھ کی نہر بہا دیتا ہے......

......یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے..... ایک مثبت، ایک منفی......''(۱۴۲)

مثبت دیوانگی کے متعلق پروفیسر سہیل کا کہنا ہے:

''یاد رکھو، ایک اور قسم کا بھی رزق ہوتا ہے، حرام و حلال سے پرے..... جو شہیدوں کو ملتا ہے۔ پیغمبروں کو حاصل ہوتا ہے۔ بی بی مریم کے پاس آتا تھا.....ایک بار اللہ میاں نے اپنی چہیتی قوم بنی اسرائیل کو بھی وہ رزق دیا تھا۔ یہ رزق نہ حرام ہوتا ہے نہ حلال اور......اس سے ایک آگاہی پیدا ہوتی ہے، عرفان جنم لیتا ہے، جو عام آدمی کے لیے دیوانے پن ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس دیوانے پن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں، نہ ہی اس کی سمجھ آسکتی ہے، کیونکہ یہ صرف اسی رزق سے پیدا ہوتا ہے جو اوپر سے اترتا ہے۔ جس سے genes لمحہ بھر میں صدیوں کا ارتقاء کر جاتے ہیں۔ ان میں ایسا تغیر آتا ہے جو قرنوں کی صالح Mutation سے پیدا ہو سکتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں اسرائیلیوں میں کتنے سوپر ذہین لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اسی من وسلویٰ کا اثر ہے اب تک۔''(۱۴۳)

پرندوں کی کانفرنس میں راجہ گدھ دیوانگی پر بحث کرتے ہوئے کہتا ہے:

''دیوانگی دو طور کی ہوتی ہے.....ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات یہاں بیان کی گئیں......جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارزل ترین مخلوق بن جاتا ہے......لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع و اعلیٰ بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے..... پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے......

دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے......حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے...... عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں۔ لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے......اس وقت وہ ایسے زہر آ گیس بم بنا رہا ہے جن سے یہ کرہ زمیں تباہ ہو سکتی ہے...... یہ اس کے دیوانے پن کی دلیل ہے......لیکن جب اس کرۂ ارض کو بچانے کی ضرورت آئے گی، تب بھی ایک مقدس دیوانہ آئے گا......کاش ملکۂ چیل کو میرے دیوانے پن پر اس قدر اعتراض نہ ہوتا تو ہم پرندوں کے لیے نئی سمتیں، دروازے......نئی جہتیں کھول دیتے۔ ہمارا دیوانہ پن بھی عرفان کی ایک شکل ہے۔'' (۱۴۴)

بانو قدسیہ یہ نظریہ دیتی ہیں کہ دیوانگی اور ارتقاء میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب بھی دیوانگی پیدا ہوتی ہے وہ ارتقاء کو ساتھ لے کر آتی ہے۔ خواہ یہ ارتقاء ذہنی شعور، عرفانِ ذات، عرفان حقیقت یا انسانی تمدّن، سائنسی ایجادات اور انکشافات کی صورت میں ظاہر ہو۔ فرق یہ ہے کہ منفی دیوانگی سے حاصل ہونے والا ارتقاء، بالآخر ہلاکت خیز ہو جاتا ہے۔ جبکہ مثبت دیوانگی سے جنم لینے والا ارتقا انسانیت کی معراج ہے۔

راجہ گدھ، منفی دیوانگی سے حاصل ہونے والے ارتقاء کا استعارہ ہے جو ناول کے کرداروں کی صورت میں قیوم اور سیمی میں اظہار پاتا ہے۔ عرفان کی ایک شکل سیمی اور گدھ دونوں میں موجود ہے۔ وہ آنے والے واقعات کو پیش از وقت دیکھ سکتی ہیں۔

''اس وقت ایک بوڑھی گدھ اٹھی۔ اس نے نجاشی بادشاہ کا سارا عہد اپنے خواب میں پیش از وقت دیکھا تھا......'' (۱۴۵)

''وہ آئے گا تو ہجرت کا اصول سمجھائے گا...... اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں کیسے سمجھاؤں......'' (۱۴۶)

سیمی کی دیوانگی میں عرفان کی شکل بارہا نظر آتی ہے:

''وہ لندن میں اس کے ساتھ رہے گا کسی Apartment میں...... ہیں ناں قیوم۔''

میں چپ رہا۔

''اس کے گھر کی کھڑکی کے آگے تین جرنیم کے گملے ہوں گے۔ دروازے کی کال بیل ڈھیلی

ہو گی۔ جب کبھی آفتاب کال بیل پر اُنگلی رکھے گا، زیبا اندر سے جا کر اُس کے لیے دروازہ کھولے گی۔ لندن میں ٹھنڈ شروع ہو گئی ہو گی۔ زیبا آفتاب کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لے گی۔'' (۱۴۷)

ناول کے آخر میں بانو قدسیہ ایک ایسا کردار تخلیق کرتی ہیں جو ان کے نظریے کے مطابق دیوانگی کی مثبت سمت کا حامل ہے۔ ان کے خیال میں یہ وہ دیوانگی ہے جو نہ عشقِ لاحاصل سے پیدا ہوتی ہے، نہ لامتناہی تجسّس اور موت کی آگہی سے، بلکہ یہ دوسری قسم کی دیوانگی ہے جس کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ یہ اسے مقدس دیوانگی کا نام دیتی ہیں جو ایک خاص قسم کے طیّب رزق سے پیدا ہوتی ہے جو بندے کو خدا کی طرف سے براہِ راست حاصل ہوتا ہے۔

آفتاب کا بیٹا افراہیم، جو دس سالہ بچہ ہے، مقدس دیوانے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کی دیوانگی کو سمجھنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ قیوم اس دیوانگی کے بارے میں آفتاب سے کہتا ہے:

''دیوانگی کی ایک اور جہت ہے...... صرف ہم کو اس کا ادراک نہیں ہے۔ جس طرح جسم کی بیماری سے ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہسپتالوں کو دوڑتے ہیں، ڈاکٹروں کی طرف بھاگتے ہیں...... روح جب لولی لنگڑی ہوتی ہے تو ہم ایسے ہی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ جب روح Boundary کراس کر جاتی ہے تو انسانیت کے لیے یہی دیوانہ پن رحمت بن جاتی ہے...... میں اس دائرے پر گھوم چکا ہوں...... یقین مانو آفتاب...... ہر دیوانگی پاگل پن نہیں ہوتی، نہیں ہوتی...... نہیں ہوتی۔ ہر دیوانہ ننگ انسان نہیں ہوتا۔''

''جس طرح بیماری موت کی وادی میں اترتی ہے...... جسم ریخت کا شکار ہو کر اسرار کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، ایسے ہی دیوانگی...... انتہا کی ہو تو عرفان کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے۔ پھر مادہ ہر شکل میں بیکار ہو جاتا ہے۔ تم اعتبار کرو تمہارا بیٹا افراہیم پاگل نہیں ہے۔ یہ ایک اور سمت دیکھ سکتا ہے۔ اس کی وہ کھڑکیاں کھل رہی ہیں...... جو عام صحت مند نارمل آدمی میں بند ہوتی ہیں...... یہ دونوں ابروؤں کے درمیان میں سے دیکھ سکتا ہے۔ تم اسے عرب کے صحراؤں میں لے جاؤ...... وہاں اس کے لیے بہت کچھ ہے...... اسے شیر سے مشابہ جبل النور کے سامنے لے جانا...... یہ تمہیں اس پہاڑ کو دیکھتے ہی وہ سب کچھ بتا دے گا...... جو کوئی

ماہرِ نفسیات آج تک نہیں بتا سکا...... جو کوئی سائنس دان سوچ بھی نہیں سکا...... چاہو تو اسے رفتہ رفتہ سیڑھی سے اتار کر عام پاگل خانے میں...... ان پاگلوں کے ساتھ بند کر دینا جو مادی دنیا پر بوجھ ہیں۔ ہو سکے تو اسے...... اسے وہاں لے جانا جہاں لوہے کے ہم شکل پہاڑ ہیں۔ سارے میں عصر کے وقت گلابی ہوا چلتی ہے...... خدا کے لیے یقین کرو جسم کی بیماری دو قسم کی ہوتی ہے...... ایک بیماری وہ ہے جو...... جسم کو لاغر کرتی ہے، دوسری بیماری سے شفایاب ہونے پر انسان دوگنا تندرست ہو جاتا ہے۔ اور دیر تک تندرست رہتا ہے۔ جیسے جسم میں تازہ خون شامل ہو گیا ہو...... دیوانہ پن بھی دو طور کا ہے۔ ایک پاگل پن کی وہ قسم ہے جس سے روح، قلب، دماغ سب کمزور ہوتے ہیں...... دوسرا دیوانہ پن وہ ہے...... جس سے روح میں توانائی آتی ہے۔ وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں پار کرتی ہے...... خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو...... تمہارے بیٹے کا دیوانہ پن دوسری قسم کا ہے...... میرا ایمان ہے۔"(۱۴۸)

"یہاں یہ ایب نارمل یا مافوق العادت بچہ ناول میں ایک اور بُعد یا Dimension کا اضافہ کرتا ہے۔ جس سے وہ تمام بحث تکمیل کا درجہ حاصل کر لیتی ہے جو آغاز سے آخر تک کرداروں کے حوالے سے سامنے آتی ہے۔ آفتاب سوچتا ہے کیا کبھی اس کے آباؤ اجداد نے رزقِ حرام سے اپنے آپ کو آلودہ کیا تھا کہ افراہیم اس کی سزا بن کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا ہے؟ بانو کے نزدیک یہ بچہ ہمارے بگڑے معاشرے کی شکل کے طور سے آیا ہے جو ایک منفی دیوانگی سے مثبت دیوانگی کی جانب جست لگانے کے لیے بے تاب ہے۔"(۱۴۹)

رزقِ حرام کی تھیوری اور افراہیم کے کردار کی تخلیق کے ذریعے بانو قدسیہ روحانیت میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

"ناول میں بانو نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی وفکری ارتقاء، اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب اور مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے، مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف و روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے

ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں، ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس کا طریقۂ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔''(۱۵۰)

مصنفہ کا کہنا ہے کہ مادیت پرستی انسان کو منفی راستوں پر ڈال کر ذہنی و روحانی کرب سے دوچار کر دیتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اخلاقی زوال نہ صرف ذہنی پراگندگی پیدا کرتا ہے بلکہ وہ انسان کو نفسیاتی و جسمانی طور پر بھی مفلوج کر دیتا ہے۔ اخلاقی زوال سے نہ صرف افراد شکست و ریخت کا شکار ہوتے ہیں بلکہ جس معاشرے میں قدروں کی پاسداری ختم ہو جائے، ان کو بھی کلر چاٹ جاتا ہے۔ معاشرے کی اخلاقی بنیادیں کمزور ہو جائیں تو قدروں کی عدم موجودگی سے اس میں عدم برداشت، فکری انتشار، افراتفری اور ہلاکت خیزی کی لہر پیدا ہو کر اس کے استحکام کے لیے بڑا چیلنج بن جاتی ہے۔

مادیت پرستی کے مقابلے میں بانو قدسیہ روحانیت کا تصور پیش کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں پاک اور مقطر محبت کی روحانی قدر سے تمام مثبت قدریں جنم لیتی ہیں۔ یہ قدریں نہ صرف افراد کو ذہنی و جسمانی اور روحانی طور پر مضبوط و توانا بناتی ہیں، بلکہ ایسا معاشرہ جہاں مثبت قدروں کی کارفرمائی نظر آتی ہو، وہ پھولتا پھلتا ہے، ترقی کرتا ہے اور اسے مشیت ایزدی حاصل ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ طاہر مسعود، ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''، کراچی: مکتبہ تخلیقی ادب، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۸

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''داستان اور ناول۔تنقیدی مطالعہ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۴

۳۔ نیلم فرزانہ، ''اُردو ادب کی خواتین ناول نگار''، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱۰، ۳۱۱

۴۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۴

۵۔ احسان اکبر، ''پاکستانی ناول- ہیئت، رُجحان اور امکان''، مشمولہ: پاکستانی ادب تنقید، جلد پنجم، ترتیب و انتخاب: رشید امجد، فاروق علی، ص ۸۲۳، ۸۲۴

۶۔ نیلم فرزانہ، ''اُردو ادب کی خواتین ناول نگار''، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص ۳۱۲

۷۔ بانو قدسیہ، ''راجہ گدھ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۰

۸۔ ایضاً، ص ۴۰۶

۹۔ ایضاً، ص ۴۵۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً،ص٦٦

۱۹۔ ایضاً،ص٦٨

۲۰۔ ایضاً،ص۴۷

۲۱۔ ایضاً،ص۱۰۷

۲۲۔ ایضاً،ص۴۲۸

۲۳۔ ایضاً،ص٦۴

۲۴۔ ایضاً،ص۱۰٦

۲۵۔ ایضاً،ص۱۰٦-۱۰۷

۲٦۔ ایضاً،ص٦۷

۲۷۔ ایضاً،ص۸۳

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً،ص۱۰۸

۳۰۔ ایضاً،ص۱۳۱

۳۱۔ ایضاً،ص۵۷

۳۲۔ ایضاً،ص۱۰۲-۱۰۳

۳۳۔ ایضاً،ص۱۳۸

۳۴۔ ایضاً،ص۱۰۵

۳۵۔ ایضاً،ص۱۷۳-۱۷۴

۳٦۔ ایضاً،ص۱۱۲

۳۷۔ ایضاً،ص۱۱۳-۱۱۴

۳۸۔ ایضاً،ص۱۷۴

۳۹۔ ایضاً،ص۱۹۱

۴۰۔ ایضاً،ص۵۱

۴۱۔ ایضاً،ص۵۱

۴۲۔ ایضاً،ص۱۷۰-۱۷۱

۴۳۔ ایضاً،ص۱۷۰

۴۴۔ ایضاً،ص۱۶۹

۴۵۔ ایضاً،ص۱۷۱

۴۶۔ ایضاً،ص۱۱۲

۴۷۔ ایضاً،ص۱۸

۴۸۔ ایضاً،ص۱۸-۱۹

۴۹۔ ایضاً،ص۲۰-۲۱

۵۰۔ ایضاً،ص۳۳

۵۱۔ ایضاً،ص۱۷۹

۵۲۔ ایضاً،ص۱۰۵

۵۳۔ ایضاً،ص۱۱۳

۵۴۔ ایضاً،ص۱۲۶

۵۵۔ ایضاً،ص۱۲۸-۱۲۹

۵۶۔ ایضاً،ص۲۰۱

۵۷۔ ایضاً،ص۲۰۱-۲۰۲

۵۸۔ ایضاً،ص۲۹۴

۵۹۔ ایضاً،ص۲۴۶-۲۴۷

۶۰۔ ایضاً،ص۲۴۹

۶۱۔ ایضاً،ص۲۶۴

۶۲۔ ایضاً،ص۲۱۷

۶۳۔ ایضاً،ص۲۶۶

۶۴۔ ایضاً،ص۳۶۲

۶۵۔ ایضاً،ص۳۸۵-۳۸۶

۶۶۔ ایضاً،ص۱۲۴-۱۲۵

۶۷۔ ایضاً،ص۱۴۹

۶۸۔ ایضاً،ص۱۴۷

۶۹۔ ایضاً،ص۲۵۵

۷۰۔ ایضاً،ص۲۵۶-۲۵۸

۷۱۔ ایضاً،ص۱۵۲-۱۵۳

۷۲۔ ایضاً،ص۱۵۴-۱۵۵

۷۳۔ ایضاً،ص۱۵۶-۱۵۷

۷۴۔ ایضاً،ص۳۴۰

۷۵۔ ایضاً،ص۲۱۷

۷۶۔ ایضاً،ص۲۱۸-۲۱۹

۷۷۔ ایضاً،ص۲۲۱

۷۸۔ ایضاً،ص۲۱۲-۲۱۳

۷۹۔ ایضاً،ص۲۲۷

۸۰۔ ایضاً،ص۲۴۸-۲۴۹

۸۱۔ ایضاً،ص۲۵۱-۲۵۲

۸۲۔ ایضاً،ص۲۶۹

۸۳۔ ایضاً،ص۲۲۳

۸۴۔ ایضاً،ص۳۰۱

۸۵۔ ایضاً،ص۳۲۸-۳۲۹

۸۶۔ ایضاً،ص۳۳۳

۸۷۔ ایضاً،ص۳٦۲

۸۸۔ ایضاً،ص۳۴۸

۸۹۔ ایضاً،ص۳۴۵

۹۰۔ ایضاً،ص۳٦۲

۹۱۔ ایضاً،ص۳٦۳

۹۲۔ ممتاز احمد خان،’’راجہ گدھ-نظریاتی کمٹ منٹ کا ناول‘‘،مشمولہ’’اُردو ناول کے بدلتے تناظر‘‘،کراچی: ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،۱۹۹۳ء،ص۲۵۸

۹۳۔ ایضاً، بانو قدسیہ،’’راجہ گدھ‘‘،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۱۹٦-۱۹۷

۹۴۔ ایضاً،ص۱۴۲

۹۵۔ ایضاً،ص۱٦۲-۱٦۳

۹٦۔ ایضاً،ص۲۹

۹۷۔ ایضاً،ص۲۷-۱۹۵

۹۸۔ ایضاً،ص۵۱

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ ایضاً،ص۱۲۹

۱۰۲۔ ایضاً،ص۳۲۳-۳۲۴

۱۰۳۔ ایضاً،ص۵۱

۱۰۴۔ ایضاً،ص۵۳

۱۰۵۔ ایضاً،ص۵۲

۱۰۶۔ ایضاً،ص۱۴۶

۱۰۷۔ نیلم فرزانہ،''اُردوادب کی خواتین ناول نگار''،لاہور:فکشن ہاؤس،۱۹۹۲ء،ص۳۱۵

۱۰۸۔ بانوقدسیہ،''راجہ گدھ''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۲۲

۱۰۹۔ ایضاً،ص۳۷۰

۱۱۰۔ ایضاً،ص۱۵۷-۱۵۸

۱۱۱۔ نیلم فرزانہ،''اُردوادب کی خواتین ناول نگار''،لاہور:فکشن ہاؤس،۱۹۹۲ء،ص۳۱۵-۳۱۶

۱۱۲۔ بانوقدسیہ،''راجہ گدھ''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۲۸۹

۱۱۳۔ ایضاً،ص۱۳۱-۱۳۲

۱۱۴۔ ڈاکٹرسلیم اختر،''اُردوادب سال بہ سال:ادبی جائزے''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء،ص۵۱-۵۲

۱۱۵۔ بانوقدسیہ،''راجہ گدھ''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۳۱

۱۱۶۔ ایضاً،ص۳۲

۱۱۷۔ ڈاکٹرسلیم اختر،''اُردوادب سال بہ سال:ادبی جائزے''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۸ء،ص۵۲

۱۱۸۔ بانوقدسیہ،''راجہ گدھ''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۱۴۹-۱۵۱

۱۱۹۔ ایضاً،ص۱۳۳-۱۳۴

۱۲۰۔ ایضاً،ص۱۴۴

۱۲۱۔ ایضاً،ص۴۰۰-۴۰۱

۱۲۲۔ ایضاً،ص۲۰۰

۱۲۳۔ ممتازاحمد خان،''راجہ گدھ-نظریاتی کمٹ منٹ کا ناول''،مشمولہ''اُردوناول کے بدلتے تناظر''،کراچی:ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،۱۹۹۳ء،ص۲۶۶

۱۲۴۔ بانوقدسیہ،''راجہ گدھ''،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص۲۰۱-۲۰۲

۱۲۵۔ ایضاً،ص۴۲۹

۱۲۶۔ ایضاً،ص۳۷۷-۳۷۸

۱۲۷۔ ایضاً،ص۳۷۴

۱۲۸۔ ایضاً،ص۲۹۴،۲۹۶

۱۲۹۔ ایضاً،ص۳۸۲

۱۳۰۔ ایضاً،ص۴۰۲-۴۰۴

۱۳۱۔ ایضاً،ص۲۷۶

۱۳۲۔ ایضاً،ص۳۷۱،۳۷۲

۱۳۳۔ ایضاً،ص۳۷۲

۱۳۴۔ ایضاً،ص۳۷۲-۳۷۳

۱۳۵۔ ایضاً،ص۲۹۲

۱۳۶۔ ایضاً،ص۲۷۷

۱۳۷۔ ایضاً،ص۲۸۹

۱۳۸۔ ایضاً،ص۱۹۵

۱۳۹۔ ایضاً

۱۴۰۔ ایضاً،ص۳۷۰

۱۴۱۔ ایضاً،ص۳۸۱

۱۴۲۔ ایضاً،ص۱۴

۱۴۳۔ ایضاً،ص۲۸۱

۱۴۴۔ ایضاً،ص۳۸۳

۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۹۵

۱۴۶۔ ایضاً،ص۱۹۷

۱۴۷۔ ایضاً،ص۱۰۴

۱۴۸۔ ایضاً،ص۴۵۰-۴۵۱

۱۴۹۔ ممتاز احمد خان، ''راجہ گدھ-نظریاتی کمٹ منٹ کا ناول''، مشمولہ ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، کراچی: ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،۱۹۹۳ء،ص۲۶۸

۱۵۰۔ ایضاً،ص۲۵۸

باب چہارم

حاصل گھاٹ

''حاصل گھاٹ''۲۰۰۳ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ یہ بانو قدسیہ کے ذہنی و قلبی اور روحانی سفر کی ایک منزل ہے۔

''حاصل گھاٹ'' کی معنی خیزی کے کئی پرت ہیں۔ یہ جنت سے حضرت آدمؑ کی ہجرت سے لے کر آج کے انسان کی پسماندہ معاشرے سے ترقی یافتہ معاشروں کی طرف ہجرت کی داستان ہے اور انسان کے ذہنی و روحانی ارتقائی سفر کا استعارہ بھی۔ یہ اس کرب کی کہانی بھی ہے جو حاصل گھاٹ کی صورت میں انسان کا مقدر بنتا ہے۔ انسان نے جب جب ارتقاء کی جانب قدم بڑھایا، ہجرت اور جلاوطنی اس کا مقدر بنی ہے۔ خواہ یہ ہجرت جنت سے زمین کی طرف انسانی ارتقاء کی صورت میں ہو یا کپل وستو کے شہزادے سدھارتھ کی ''گیا'' کی جانب نروان کی تلاش میں یا نبی آخرت الزماں ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی طرف پہلی مثالی اسلامی ریاست کے قیام کی خاطر ظہور میں آئی ہو۔

انسان کا ارتقاء خواہ ذہنی و روحانی ہو یا مادی، وہ ہجرت کا متقاضی ہے۔ ذہنی و روحانی ہجرت پیغمبر ﷺ کو مکہ کی گلیوں سے نکال کر غارِ حرا کی بلندیوں کی طرف سفر پر مجبور کرتی ہے۔ آخر میں بلندیوں کا یہ استعاراتی سفر معراج کا معجزہ بن کر سامنے آتا ہے۔

حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم النبیّین ﷺ تک ہجرت ہر پیغمبر کی سنت رہی ہے۔ یہ ہجرت ذہنی و جسمانی سفر سے شروع ہو کر روحانی عظمتوں کی منزلوں کا نشان بنتی رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ نبی اور پیغمبر کی ہجرت حکمِ الٰہی کی پابند ہوتی ہے اسی لیے پیغمبر ہجرت کے کرب اور دُکھوں سے گزرتے ہوئے اطمینانِ قلب اور سکون کے حاصل گھاٹ تک پہنچتا ہے۔ لیکن ایک عام انسان جب ہجرت اختیار کرتا ہے تو حاصل گھاٹ خسارہ اور لاحاصل کا دکھ ہوتا ہے۔

بانو قدسیہ ان اسباب پر بحث کرتی ہیں کہ ایک عام انسان کے لیے ہجرت کے بعد حاصل گھاٹ نا آسودگی اور بے یقینی کی منزل کیوں بن جاتا ہے۔

''حاصل گھاٹ'' ذہنی و روحانی ارتقاء کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عرفان و آگاہی کی کوئی منزل بھی ہوسکتی ہے اور مادی ترقی کی خاطر ہجرت کر کے حاصل ہونے والی آرام و آسائش کی منزل بھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں انسان کے لیے خسارہ ہے۔

مادی ترقی سے حاصل ہونے والا حاصل گھاٹ نا آسودگی، تنہائی اور پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جبکہ ذہنی و فکری ارتقاء، بے یقینی کو ساتھ لے کر آتا ہے۔ ہجرت کی اس منزل کے آگے ہمیشہ سوالیہ نشان لگا رہتا ہے جو ہجرت کرنے والے کے قلب و ذہن میں بے یقینی کا ایک خلا چھوڑ جاتا ہے۔

ہجرت اپنی جنت سے نکلنے کا عمل ہے جس کا سفر تثلیث کی مانند ہے۔ اس کا ایک سرا ارتقاء سے جڑا ہے اور دوسرا نا آسودگی سے۔ ترقی ذہنی و روحانی ہو یا مادی، دونوں صورتوں میں ہجرت کی متقاضی ہے۔ انسان کی جنت اس کے قلب و ذہن کی اوّلین حالت اور ماں کی گود ہے۔ اسے ارتقاء و ترقی کی خاطر ان دونوں حالتوں سے نکلنا پڑتا ہے اور ہر صورت میں کرب انگیز تجربے سے دوچار ہونا اس کا مقدر ہے۔

جسمانی سطح پر انسان کی جنت اس کا آبائی گھر، خاندان اور ملک ہے۔ یہ جنت اس کی فکری و روحانی تربیت گاہ بھی ہے جہاں سے وہ مذہبی اعتقادات، تہذیبی اقدار و روایات اور قومی طرزِ فکر و احساس کا سرمایہ حاصل کرتا ہے جن پر عمل اس کے لیے ذہنی آسودگی کا باعث بنتا ہے۔ حضرت آدمؑ جب جنت سے نکالے گئے تو اپنی جنت سے جدائی کی اس حالت نے ان کی روح میں دکھ کو جنم دیا۔ اس سے پہلے وہ جدائی کی کیفیت اور دُکھ سے نا آشنا تھے۔ ہجرت نے انہیں جدائی اور تنہائی کے کرب انگیز تجربے سے دوچار کیا۔ انسان فطری طور پر اپنی آبائی جنت میں رہنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں ارتقاء کا بیج بھی موجود ہے جو اُسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ آج بھی انسان جب ہجرت کرتا ہے تو وہ جدائی اور تنہائی کے اسی کرب انگیز تجربے سے گزرتا ہے جس سے حضرت آدمؑ کو گزرنا پڑا تھا۔

بانو قدسیہ ''حاصل گھاٹ'' میں ہجرت کے اسباب اور اس سے وابستہ تمام تر کرب انگیز تجربات کو زیرِ بحث لاتی ہیں۔ ان کا اصل موضوع انسان کے اندر ہونے والی وہ ٹوٹ پھوٹ ہے جو ہجرت کا ردّ عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی بانو قدسیہ ہجرت کے کرب سے نجات حاصل کرنے کے لیے فلاح کا نسخہ تجویز کرتی ہیں۔

ناول کی سادہ سی کہانی واحد متکلم کی یادداشتوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ہمایوں ایک ریٹائرڈ بوڑھا ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اس کے دونوں بچے ارجمند اور جہانگیر مادی ترقی کی خواہش میں اپنے ملک کو خیر باد کہہ کر امریکہ جا کر بس چکے ہیں۔ ہمایوں اپنی بیٹی کے کہنے پر امریکہ جاتا ہے تو وہاں کا جدید ترقی یافتہ معاشرہ اس کے اندر طرح طرح کے سوالات اٹھاتا ہے۔ پورا ناول انہی سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کی کوشش اور تقابلی سوچوں کے گرد گھومتا ہے۔

ہمایوں کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ یہاں ان کی ترقی کا سفر سانده کلاں سے شروع ہو

کر ٹمپل روڈ اور ٹمپل روڈ کی کوٹھی سے ڈیفنس کی کوٹھی تک کا ہے۔ترقی کے اس سفر میں جہاں بہت کچھ حاصل کیا گیا، وہاں بہت کچھ گنوا بھی دیا گیا تھا۔

ہمایوں عمر کے اس حصے میں ہے جہاں انسان مستقبل سے کٹ کر ماضی میں کھو یا رہتا ہے۔اس کے ماضی اور حال کی تقابلی سوچوں کے ذریعے اس کی گذشتہ زندگی پرت پرت کر کے ہمارے سامنے کھلتی رہتی ہے۔یہیں اقبال نامی ایک لڑکی نظر آتی ہے جس کے ساتھ تعلق کو خود اقبال بھی نہ سمجھ سکا لیکن جو تمام زندگی اس کی سوچوں کا مرکز ومحور رہی ہے۔

ہمایوں کی زندگی روایتی مشرقی خاندان کی روایات واقدار کے نظام میں گزری ہے اور اس کا حال جدید ترقی یافتہ امریکی معاشرے میں گزر رہا ہے۔مشرق اور مغرب کا تضاد اس کی سوچوں کو مہمیز کرتا ہے۔وہ مشرقی اور مغربی معاشرے کے تضاد، ترقی اور فلاح، ہجرت کے ہمہ پہلو تجربے اور اس کے اثرات پر ہر وقت غور وفکر کرتا رہتا ہے۔انہی سوچوں کے ذریعے ماضی سے وابستہ کردار اپنی ہلکی ہلکی جھلک دکھاتے ہیں۔ان کرداروں کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔وہ مثالی اور جامد کردار ہیں جو مصنفّہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں ہیں، جن کے ذریعے بانو قدسیہ کی فکر ہمارے سامنے آتی رہتی ہے۔ان میں سے دادا، دادی، شاہد بھائی، اقبال اور اصغری کے کردار مشرقی طرزِفکر واحساس اور اقدار وروایات کے امین اور نمائندے ہیں۔یہ مشرق کی تہذیبی واخلاقی اقدار، محبت، وفا، ایثار وقربانی اور صبر میں گندھے ہوئے ہیں۔دوسری طرف ارجمند، شاہدہ اور جہانگیر بدلتے ہوئے سماجی پس منظر اور ٹوٹتی ہوئی اقدار کے مظہر ہیں۔

بانو قدسیہ ناول میں ہجرت کی واردات سے گزرتے ہوئے انسانوں کی جذباتی، ذہنی وروحانی ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں۔ہجرت کی واردات کے ذیلی پہلوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے وہ ترقی اور فلاح، مشرقی اور مغربی معاشرے کے تضاد اور انسان کی جذباتی اور روحانی زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیتی ہیں۔

مادی ترقی کے حصول کی خاطر کی جانے والی ہجرت اس ناول کا موضوع ہے۔سب سے پہلے ہمایوں کا خاندان خواہشوں اور خوشیوں کی منزل پانے کے لیے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچتا ہے۔لیکن منزل پر پہنچ کر اس خاندان کے بزرگ خوشی کی اس کیفیت میں سرشار نہیں ہوتے جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔

> ''ہمارے گھرانے پر پاکستان کے اور اللہ کے احسانات ہی احسانات تھے، لیکن ہم نے اپنے شکوک وشبہات سے آستینوں میں چھپے بتانِ وہم وگماں کی مدد سے زندگی میں زہر گھولنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی......ہم ان لوگوں سے خائف تھے جو ہماری طرح مہاجر اور بے یارو

مددگار تھے۔ ہم ان تعلیم گاہوں سے خوفزدہ تھے جہاں پڑھانے والے اور ہم سبھی طالب علم نا آشنا چہروں والے تھے......ہم شہر کی سڑکوں، بازاروں، بس سٹاپوں کو دیکھتے رہتے۔خوف کے چیتے ہمیں ہر موڑ، ہر نئی شکل میں کسی نئے واقعے کی ہیبت سے ڈراتے۔

ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف ناک چیتے لے کر آئے تھے......ہم تو ان شہروں، گھروں، سڑکوں سے بھی ناواقف تھے جن کو ہمیں اپنانا تھا۔ ہر موڑ پر وہی چیتا لپکتا چلا آتا تھا۔

اَن دیکھے کا خوف۔

اَن جانے کا خوف۔

اَن چکھے کا خوف۔

اَن چاہے کا خوف......

وہم وگماں کا چیتا نئی شکلیں بنا کر ہمارے تعاقب میں رہتا اور ہم اس سے ایسے بھاگتے جیسے پولیس سے چور بھاگتا ہے۔ نہ ہم کہیں ٹھہرتے نہ کسی مقام سے آشنائی حاصل کر سکتے۔ یوں پاکستان میں ہمارا سفر چیتا جھپٹی سے شروع ہوا۔'' (۱)

ہمایوں کا خاندان ہندوستان کے ایک گاؤں سے اٹھ کر پاکستان آیا۔ہجرت کے اس سفر میں وہ اپنا جسم تو ساتھ لے آئے لیکن روح وہیں رہ گئی۔ دیہات سے شہر کی طرف یہ ہجرت دادا کو راس نہ آئی۔ وہ وطن کی جدائی اور اجنبیت کے غم میں کھلتا رہا۔

''دادا زمیں سے وابستہ کسان تھا۔اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر آ تو گیا تھا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے تک جی نہ سکا۔اندر ہی اندر اسے گاؤں کے گھر، وٹ بنّے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگی، پکی سڑک تک جانے والا کچا راستہ، کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈا کھیلتے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسّی کے ڈول، مکھن بھرے سلور کے کٹورے یاد آتے رہتے......دادا گلی میں چارپائی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن کن زاویوں سے یاد کرتا رہتا۔'' (۲)

نئے وطن کی اس گلی کے باشندے دادا کے رنگ ونسل کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ وہ گورے رنگ کی اکثریت میں

اقلیت بن کر رہ گیا۔ وہ ہندوستان سے ذات پات کی جس تقسیم اور تفرقے سے گھبرا کر پاکستان آیا تھا، یہاں بھی وہ موجود تھی۔ وہاں وہ ہندوؤں کی اکثریت میں اقلیت تھا، یہاں وہ اس گلی کے گوروں میں کالے رنگ کی وجہ سے اقلیت بن کر احساسِ کمتری اور اجنبیت کے کرب سے گزر رہا تھا۔

''اس گلی میں زیادہ تر سفید رو، کشمیری اور مغل پٹھان گھرانے آباد تھے۔گلی میں آتے جاتے لوگ دادا کی عمر کا لحاظ تو کرتے اور سلام دعا کا سلسلہ بھی جاری رہتا......لیکن ان کا بھی جی چاہتا کہ دادا اندر جا کر نہا لیں، خاص کر گرمیوں میں جب دادا پگڑی سے لے کر زری جوتی تک پسینے میں نہایا نظر آتا، لوگوں کی یہ خواہش شدید تر ہو جاتی۔اس گلی کے سفید باسی دادا کے کالے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔دادا سمجھ نہ سکتا کہ وہ ہندوؤں کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا، پھر یہ تعصّبات کی گٹھڑی کون ساتھ اُٹھا کر لے آیا۔ چار ورن تو مسلمانوں میں بھی موجود تھے تو پھر دھرتی کو چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا......؟ اپنے دل کا میل ہی نہ کٹا تو فائدہ؟'' (۳)

ہجرت ترقی وارتقاء کی خاطر عام طور پر کی جاتی ہے۔ مادی ترقی کی خواہش آرام دہ زندگی کا خواب انسان کو اپنے وطن سے اٹھا کر دیارِ غیر میں لے جاتا ہے۔

جدید دَور میں امریکی معاشرہ مادی ترقی کی علامت بن چکا ہے۔اور پسماندہ ممالک کے باشندے جوق در جوق اس کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ ہمایوں کی بیٹی بھی اسی ترقی کی خواہش میں امریکہ کی ہو کر رہ چکی ہے۔اس کا شوہر بلال کہتا ہے:

''ابو جی...... جب میں وہاں لاہور میں تھا تو پورے تین سال ملازمت کے لیے کوشش کرنے کے باوجود بیکار تھا۔ یہاں آ کر میں نے بڑے دھکے کھائے۔ارجمند اور میں نے بڑی مشقتیں جھیلیں۔آپ کبھی اس سے پوچھئے گا۔کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے ہم نے......لیکن آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، اسی امریکہ نے ہمیں دیا ہے......'' (۴)

ایک دن ہمایوں کا بیٹا جہانگیر بھی ملک چھوڑ کر، آگے بڑھنے کی خواہش میں، امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

''میں آپ کو کچھ بتانے آیا تھا۔

ہاں......ہاں ضرور......

جہانگیر نے اٹھ کر کمرے کی بتیاں روشن کر دیں......

میں نے فیصلہ کیا ہے...... میں امریکہ چلا جاؤں...... یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے اور میں نے کمپیوٹر میں ایم سی ایس کر لی ہے......''(۵)

ہجرت کے دیگر اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''کچھ تارکین اللہ کا فضل تلاش کرنے نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ امیروں کو اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی، لیکن اپنی دولت چھپانے، ضائع کرنے اور وطن کے جاہلوں پر رُعب گانٹھنے کے لیے نئے ملک کی بود و باش اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کچھ اپنے وطن کی رسّہ گیریوں سے پریشان ہو کر سیاسی پناہ گزیں بنتے ہیں۔ اپنے ملک میں عزتِ نفس کی کمی کے باعث انہیں پردیس کی مشقتوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے وطن میں اپنے آپ کو محبوس جان کر آزادی کے شوق میں اُڑ جاتے ہیں۔ کچھ آزادی کی بے آسرا زندگی کے ہاتھوں بیزار ہو کر نئے نظاموں میں بندھنا چاہتے ہیں۔ کچھ پر قینچ سکوریٹی کے پنجرے کو قبول کر لیتے ہیں۔ بعض رہائش، آسائش، زیبائش کی خاطر نئے دیس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ کچھ رانجھے کان پھڑوا کانوں میں مندریاں ڈال پردیس کے جنگل میں بسرام کر لیتے ہیں۔ کچھ تبدیلی کو انسانی زندگی کی روح سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو نئے Exposure کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ ہجرت سے ناواقف وطن سے خوف زدہ ہو کر صرف بھیڑ چال کے نرغے میں آ کر امریکہ میں منہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ بعض خود رائی کے شوقین روک ٹوک سے گھبرا کر امریکی جنت میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی فلاح کا واحد راستہ ہے اور اس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔''(۶)

ہجرت سے اقدار کی شکست وریخت

ہجرت کے اسباب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد مصنفہ ہجرت کے اصل مسائل کی نشاندہی کی طرف آتی ہیں:

''اس امریکہ نگری میں بھانت بھانت کے پنچھی اُڑ کر آئے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں

داب دریا کنارے کھڑے اکثریت کے دریا کا بہاؤ دیکھتے ہیں، لیکن اکثریت کے دریا کا بہاؤ کسی کے لیے نہیں بہتا۔ اس کی طغیانی، روانی، سیلانی سب قدرتی وفطرتی وحقیقی ہوا کرتی ہے۔ ہولے ہولے حوصلہ پا کر خوف کا لبادہ اتار کر اپنی پیٹھ ٹھونک ہلا شیری دے کر اقلیت اکثریت کے بہاؤ میں غوطہ زن ہو جاتی ہے۔ جو کچھ بھی داؤ پر لگ سکتا ہے، لگا دیا جاتا ہے......''(۷)

امریکی معاشرے کی اکثریت میں ضم ہونے اور اس کا حصہ بننے کے لیے تارکینِ وطن جو کچھ داؤ پر لگاتے ہیں، سب سے پہلے وہ ان کا طریقِ زندگی اور اقدار اور روایات ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ زبان ولباس کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اکثریت مذہب سے بھی اپنا دامن چھڑا لیتی ہے۔ مادی ترقی کے حصول کی خاطر آج کا انسان روحانی و اخلاقی اقدار سے عاری ہوتا جا رہا ہے۔

''نئی ترقی کی تمام تر توجہ پنجرے پر ہے۔ اسے طوطے کی پروا نہیں۔ پنجرے کا ڈیزائن، رنگ وروغن، اس کے اِردگرد زیبائش، آسائش کا ہر ممکن فارمولا آج کی سوچ پر حاوی ہے...... انسان اپنے جسم اور اس کی ضرورتوں میں اس درجہ مگن ہو گیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوس قیدی کی پرواہ نہیں رہی۔ کھانا، پہننا، اوڑھنا، بچھونا اب Priority میں مقدم ہیں۔ وہ جسم سے وابستہ ہو کر بازاروں کا رَمتا جوگی بن گیا ہے۔ انڈسٹری، میڈیا، انٹرنیٹ بہ بانگِ دہل انسان کو اس کی ضرورتوں کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اب خواہشات کو دَبانا، مسابقت سے پرہیز کرنا فساد سے ہاتھ اٹھانا نئی ترقی کے گناہ ہیں۔ تمام رشتے، اِقدار، رسم و رواج، تہذیبی فارمولے، مذہبی احکامات منہ اٹھائے، انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومتے پھرتے ہیں......نئی ترقی کے پاس وہ بلڈوزر ہے جو مذہبی باڑھوں کو اُکھاڑتا پچھاڑتا ہموار کرتا چلا جاتا ہے......اسی بلڈوزر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے، اس کی پرواہ نہیں......اقدار، رسم ورواج، مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔''(۸)

نئے ترقی یافتہ معاشرہ میں قدم جمانے کے لیے تارکینِ وطن کو سب سے پہلے اپنے طریقِ زندگی اور نظامِ اقدار کو بھلا کر نئے طور طریقوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ امریکہ میں عورت اور مرد کے کاموں کی تمیز ختم ہو کر نئی قسم کی برابری جنم لیتی ہے۔

’’جہانگیر مسکرایا۔ پھر بولا، ’’ کام تو ہم دونوں مل جل کر ہی کرتے ہیں۔ میں برتن دھوتا ہوں، وہ واشنگ کرتی ہے......‘‘

’’تم......تم برتن دھوتے ہو جہانگیر، برتن؟......‘‘

’’ابو جی......امریکہ میں ہر کام برابر ہے۔ مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں......کام کام ہے...... چاہے پرائم منسٹر کا ہو یا ٹرک ڈرائیور کا......‘‘

’’اچھا اچھا......‘‘ میری سمجھ بوجھ پرانی تھی۔ میں پرانی روایات کو اتنی آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ مشرق میں ابھی مرد اور عورت کی دنیا اس قدر گڈ مڈ نہ ہوئی تھی۔ دونوں کے رول اور کام کافی حد تک Defined تھے۔ امریکہ میں یونی سیکس کی تیاریاں شروع تھیں۔‘‘(۹)

’’ابا جی......‘‘

’’جی بیٹا......‘‘

’’ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو میں کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریزر میں رکھ دیتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔ دیکھئے ناں مجھے کام پر بھی جانا ہوتا ہے۔ آپ فریزر میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریج میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکرو اوون میں ڈال کر گرم کر لیں۔ ہم ڈسپلن سے organize ہو کر زندگی گزارتے ہیں......افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کر سکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی، لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے‘‘......

’’بالکل...... بالکل میں سمجھ گیا ہوں۔ یہاں کی زندگی اور ہے، وہاں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔‘‘(۱۰)

امریکہ میں پہنچ کر اقلیت یا تارکینِ وطن کو لامحالہ تبدیلی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ تبدیلی طرزِ فکر اور طرزِ احساس سے شروع ہو کر لباس اور زبان میں نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔ تارکِ وطن امریکہ پہنچ کر اپنی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

’’قیامِ پاکستان کے بعد جو اقلیت امریکہ میں وارد ہوئی، اس کا مسئلہ سنگین تر تھا۔ امریکہ سڑکوں، بازاروں اور اشیاء کا معجزہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر حیرت کا بازار گرم ہے۔ عام

انسان کے لیے یہ فراوانی کا خواب ہے۔ امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں کھڑے ہوکر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی حیران، انگشت بدنداں ہوگا، اتنی ہی اس میں تبدیلی آئے گی۔ محیرالعقول اشیاء کی سرعت سے بھری منڈی آپ کو دَنگ کرتی ہے۔ بازار آپ کو دَنگ کیے دیتے ہیں۔ ان کی سیر گویا ہر شہری کا جنت میں مفت داخلہ ہے۔ پھر یہاں کے نظام دنگ کرتے ہیں...... آہستہ آہستہ اکثریت گھیرے میں لے لیتی ہے اور نووارد حیرت زدہ پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کمزور اقلیت کے پاس دکھانے، سنانے، ابھارنے اور منوانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ اکثریت کے بہاؤ میں ایسے ہی بہنے لگتی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل۔'' (۱۱)

تارکِ وطن کے طرزِ فکر و احساس کی ظاہری تبدیلی سب سے پہلے اس کے لباس میں نمایاں ہوتی ہے۔ وہ خود کو بڑے معاشرے کا حصہ بنانے کے لیے اپنے لباس کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ خود کو اجنبی بنا کر وہ اکثریت کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا۔ وہ خود کو نوشہری ثابت نہ کرنے کے لیے کم سے کم سوال کرتا ہے تاکہ دوسرے اسے انجان سمجھ کر کمتر نہ جانیں۔ وہ اپنے آبائی وطن کی یاد کو جلد سے جلد دل سے نکال دینا چاہتا ہے تاکہ نئے معاشرے کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکے حالانکہ وہ دل سے سمجھتا ہے کہ اس کا آبائی معاشرہ اور اس کی اقدار ترقی یافتہ معاشرے سے بہتر اور زیادہ انسان دوست تھیں لیکن وہ احساسِ کمتری کے مارے کسی کے سامنے ان خیالات کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہے۔ معاشرے سے مطابقت کی خاطر وہ جلد ہی اپنا لباس ترک کر کے جینز اور ٹی شرٹ میں نظر آنے لگتا ہے۔

''سب سے پہلے اقلیتی ابن الوقت کا لباس بدلتا ہے۔ عموماً یہ تبدیلی سردیوں میں شروع ہوتی ہے۔ مرد تو خیر جنگِ آزادی کے بعد سے پینٹ قمیض کا رسّیا ہے لیکن نووارد عورتیں یہ کہہ کر جینز پہننے لگتی ہیں کہ سردیوں میں ایک تو سردی سے بچاؤ بہتر ہے اور دوسرے کام کاج میں یہ لباس زیادہ کمفرٹیبل اور پھرتیلا بنا دیتا ہے۔ جواز جو بھی دیا جائے اپنے عمل کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ شروع میں جینز کے ساتھ لمبے بازو کی قمیض سویٹر یا ونڈ بریکر استعمال میں آتا ہے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں تک لباس وہی ٹھہرتا ہے جو مروّج ہو، بغیر آستین

کی بنیان دیکھ کر نہ اچنبھا ہوتا ہے نہ افسوس......امریکہ مقیم اقلیتی عورت ماڈرن لگتے ہی اپنے آپ کو اکثریت کا حصہ سمجھنے لگتی ہے۔''(۱۲)

لباس جو انسان کی اندرونی تبدیلیوں کا مظہر ہے، سماجی پس منظر کی تبدیلی کے ساتھ ہی دَر آنے والی فکری تبدیلی کا اشارہ دینے لگتا ہے۔ پردیس میں لباس کی تبدیلی نو وارد کی مجبوری بھی بن جاتی ہے۔

''ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا......

''یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟''

ارجمند کچھ دیر زبان منہ میں گھماتی رہی۔شاید مجھے وہ اپنی بات سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بات یہ ہے ابو......انسان کو پانی کی رَو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔میں شلوار قمیض میں بہت odd محسوس کرتی ہوں......Main stream سے کٹ جاتا ہے آدمی۔''

''لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے ناں ارجمند......''

''ہاں رہتی تو ہے ابو......لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں، آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے، نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔''

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

''ابو شلوار قمیض گھریلو لباس ہے۔اوپر سے ڈھائی تین گز کا دوپٹہ بڑا combersome ہوتا ہے۔کبھی میز میں پھنستا ہے کبھی کرسی میں...... کام پر تو یہی جینز کام آتی ہے، بہت پریکٹیکل......''(۱۳)

دوسری چیز جو نو واردوں میں ذرا بعد میں بدلتی ہے اور زیادہ اہم ہے، وہ اس کی زبان ہے۔ کچھ لوگ بہت جلد امریکی لہجے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ slang سے خوب آگاہی پیدا کر لیتے ہیں۔ گو زبان نہیں آتی، لیکن لب و لہجہ کے زور پر پٹرول پمپ پر کام کرنے والا، ٹیکسی ڈرائیور، ڈے کیئر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنے والیاں، دکان کی سیلز گرل، غرضیکہ جہاں بھی لوگوں سے تال میل زیادہ ہو لوگ زبان کے اتار چڑھاؤ اور لب و لہجے کی باریکیوں کو سمجھ جاتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ اگلی نسل اپنی زبان بھولتی چلی جاتی ہے۔ پرانی نسل اس وقت اپنی زبان کے استعمال پر زور دیتی ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا ہوتا ہے۔

''حسن بڑے شفیق ڈاکٹر ہیں...... میں نے آپ کو بتایا تھا ناں، Pediatrician ہیں۔ مائیں ان پر بڑا Trust کرتی ہیں۔ بچوں سے حسن کا رویہ ویسے بھی بہت نرم ہے لیکن وہ میل جول کو بڑھنے نہیں دیتے...... ان کا خیال ہے کہ اگر آنا جانا بڑھ گیا تو پھر ہم امریکن طرزِ سوچ کو روک نہیں سکتے۔ حسن کو اصرار ہے کہ بچے گھر پر اُردو بولیں، لیکن وہ بیوقوف آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ہم اُردو میں بات کرتے ہیں وہ انگریزی میں جواب دیتے ہیں۔ باتیں ساری سمجھ لیتے ہیں، لیکن اُردو کو استعمال میں نہیں لاتے......''

''ہاں یہ مشکل تو ہے...... یہاں کے بچوں کی۔''

''مشکل نہیں چاچا جی...... بڑی مشکل ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے میرا بیٹا عارف میڈیکل میں داخل ہو گیا ہے۔ بڑی بیٹی ڈینٹسٹ بن رہی ہے...... اب ان سے تو یہ امید بیکار ہے کہ وہ اُردو پر توجہ دیں۔ یہ میری سارا بھی کچھ مہینوں میں مونٹی سوری چلی جائے گی...... پھر یہ بھی فرفر انگریزی بولے گی۔ اُردو تو گئی ناں ہاتھوں سے۔ پنجابی تو دور کی بات ہے۔''(۱۴)

تارکِ وطن اپنا آبائی طریقِ زندگی، لباس اور زبان بدلنے کے باوجود محسوس کرتا ہے کہ وہ اس معاشرے کے لیے اوپرا ہے۔ نئے طرزِ فکر اور نئی روشنی میں اقلیت کو اپنے میں کئی طرح کی کمیاں نظر آتی ہیں۔ وہ مکمل طور پر اپنا رنگ روپ تو نہیں بدل سکتے لیکن عورتیں سانولے اور گندمی رنگ کے خلاف خوب جہاد کرتی ہیں۔ امریکہ میں شکل کو مغربی معیار پر ڈھالنے کے لیے بال اور رنگ بدلنے کے لیے کریم، لوشن، ہیر ڈائی کی پوری انڈسٹری اسی احساسِ کمتری کی مظہر ہے۔ اقلیت کو خوبصورتی میں کمتر ہونے کا احساس اندر سے کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ وہ اس نفسیاتی دباؤ میں پستا پستا کئی طرح کے اُلٹے سیدھے اقدام کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

''سنو جہاں سے میں آیا ہوں وہاں مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نیگرو ہوں...... کیونکہ وہاں سب کالے تھے......'' میں کچھ شرمندہ ہو گیا، حالانکہ میں بھی سفید فام نہ تھا۔

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے......''

''تم جانتے ہو جب انسان احساسِ کمتری میں مبتلا ہو تو وہ چڑ چڑا، کمینہ اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔''

''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو......''

''معلوم ہے یہ احساسِ کمتری کب پیدا ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی سوچا نہیں انکل ریمس''

''سوچا کرو، تمہارے مذہب میں تو سوچنے کا بڑا حکم ہے۔ یہ کوئل کیوں خوفزدہ نہیں اور ہم کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ جب تک میں کانگو کے طاس میں تھا، مجھے احساسِ کمتری نہ تھا۔ جب تک مقابلہ نہ ہو......تم سے بہتر یا کمتر موجود نہ ہو، احساسِ کمتری پیدا نہیں ہوتا...... جب نیگرو اپنے جیسوں میں تھا تو وہ شاکی نہیں تھا۔غریب آدمی غریبی میں خوش رہتا ہے، جب تک اسے کسی امیر سے پالا نہیں پڑتا۔ میری پوتی ایملیا نے سکول چھوڑ دیا ہے...... وہ ملاٹو...... ہے جانتے ہو مولاٹو کون ہوتے ہیں......''''نہیں''

''وہ لوگ جن میں سفید لوگوں کا خون بھی ہوتا ہے۔ جو نہ مکمل طور پر سیاہ ہوتے ہیں نہ سفید...... میری پوتی ایمیلیا اب سکول نہیں جاتی۔ وہ برگر کنگ میں فش اینڈ چپس بیچتی ہے......''

''لیکن اس نے سکول کیوں چھوڑا انکل ریمس؟''

''ایمیلیا کہتی ہے......سکول میں بہت سی ذہین لڑکیاں ہیں۔گرینڈ پا وہ اتنی چمکتی ہیں کہ ان کے سامنے ایمیلیا چمک نہیں سکتی......میں تو پہلے ہی اپنی جلد بلیچ کر کر کے تھک گئی ہوں۔اب میں اور احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی۔''(۱۵)

نئے معاشرے میں اقلیت دو طرح کے احساسات سے دوچار ہوتی ہے، ایک خوف اور دوسرا احساسِ کمتری۔اَن دیکھے کا خوف، شکوک و شبہات اسے گھیرے رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس خوف میں بھی مبتلا رہتے ہیں کہ اگر وہ غلطی سے کسی شبے میں پکڑے گئے تو پھر ان کا بچنا محال ہوگا۔اَن جانے لوگوں، اَن جانے معاشرے اور اَن جانے ملک میں رہنا، اقلیت کے لیے خود کو خوف سے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ایسے ہی اقلیت خود کو احساسِ کمتری کے جذبات سے نہیں بچا سکتی۔وہ مکمل طور پر اپنی شناخت بھی گنوانا نہیں چاہتی اور لباس، رنگ روپ اور زبان بدل کر وہ اکثریت میں ضم بھی ہو جانا چاہتی ہے۔ یہی دوہری خواہش اس کے اندر خوف کو گھمبیر بنا دیتی ہے۔تارکینِ وطن کو امریکہ میں حقوق تو مل جاتے ہیں لیکن محبت اور

انصاف نہیں مل پاتا۔ بہت کچھ چھوڑنے اور بدلنے کے باوجود نیگرو، پاکستانی، سری لنکن، جاپانی، چینی سب دور سے پہچانے جاتے ہیں۔خود اقلیت کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ وہ اکثریت میں ضَم ہو چکا ہے لیکن کسی سفید فام امریکی کو یہ شبہ ہرگز نہیں ہوتا۔اور ان کے دل میں اقلیت کے لیے نرم گوشہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

جب اقلیت کے لیے لباس اور زبان کی تبدیلی کافی نہیں پڑتی تو وہ رفتہ رفتہ اپنی اقدار اور مذہب کو فرسودہ سمجھنے لگتے ہیں۔

> ''جہاں پہلے نبیوں کے بتائے ہوئے فلاح کے گُر زندگی کے فیصلوں پر حاوی تھے، وہاں اب ہیومن رائٹرز کا خیال رہتا ہے۔ اکثریت میں گم ہونے کی خواہش ہر قسم کی رکاوٹ ختم کرتی ہے۔ پچھلی قدریں چھوڑ کر صرف کام کی اخلاقیات باقی رہ جاتی ہیں۔ اقلیتی فرد صرف کام کے سہارے زندہ رہنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کام کے سامنے ہر قدر ماند پڑ جاتی ہے۔ اصلی قدریں جعلی دستاویزیں نظر آتی ہیں۔ رشتے ناطے بھوسی بن جاتے ہیں۔ بوڑھے بڈھا ہاؤس میں، بچے بے بی کیئر میں پہنچ جاتے ہیں۔''(۱۶)

دیارِ غیر میں اقدار کی شکست و ریخت کا سامنا زیادہ تر عورت کو کرنا پڑتا ہے۔ آبائی معاشرے میں، خصوصاً پاکستان میں عورت کا کردار روایتی رہا ہے۔ گو یہاں بھی اس میں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں لیکن اس کی رفتار اتنی تیز نہیں ہے۔ روایتی معاشرے میں عورت اپنے خداداد فرض سے بندھی ہوئی تھی۔ بچہ عورت کا مستقبل تھا۔ اس کی پرورش اس کا فطری تقاضا اور اس کی زندگی تھا۔ اگر بچہ بوجہ زندگی میں فیل ہو جاتا تو پھر عورت کے لیے کوئی بھی کامیابی نہ رہتی۔ لیکن اب عورت نے بچے کو پسِ پشت ڈال کر اپنا مستقبل بنانے، اپنی شناخت تلاش کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ قدرتی، فطرتی اور حیاتیاتی مقصدِ حیات ختم ہو جانے کے باعث وہ مشرق و مغرب میں اندر سے کھوکھلی ہو رہی ہے۔ اب وہ ڈپریشن اور فرسٹیشن کا شکار ہو کر اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ مغرب اور امریکہ میں یہ صورتِ حال اور بھی شدید صورت اختیار کر گئی ہے۔

> ''پھر تمہارے لیے یہ کافی نہیں؟...... وہ تمہاری کفالت میں پورا اترتا ہے...... ہے ناں؟''
>
> ''نہیں...... وقت بدل چکا ہے ابو۔ اب مرد کو اور جہتوں پر بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اسے گھر پر بھی پوری مدد کرنی چاہیے۔''
>
> ''وہ کیوں؟...... کیا وہ کافی پیسے نہیں دیتا......''

''پیسے کی بات نہیں ہے ابو۔ پیسے تو کافی ہیں،لیکن میں سارا دن کیا کروں۔ مجھے بھی اپنی شناخت چاہیے۔ بلال ابھی بھی آپ کے زمانے میں رہ رہا ہے بلکہ دادا جی کے وقتوں میں زندہ ہے۔ اب عورت پاؤں کی جوتی نہیں۔ مرد نہا تا دھوتا گھوڑا نہیں ہوا کرتا آج کل۔ عورت کا اب سسرال سے جنازہ ہی نہیں اٹھتا وہ اپنی مرضی سے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے......'' وہ بڑبڑاتی چلی جاتی ہے۔ گھر پر کوئی موجود نہیں۔ میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔ شاید دادی اگر زندہ ہوتی تو مختلف قسم کا نظریہ رکھتی،اس کے نزدیک اگر مرد کمانے جوگا ہو،تو پھر اس سے کچھ بھی اور مانگ نہیں سکتے۔ اس کی کفالت ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ٹھہرتی ہے۔ (۱۷)

مشرق ومغرب کا معاشرتی تضاد

مشرقی معاشرے کی روایتی اقدار پر نظر دوڑائی جائے تو وہاں ہمیں سرِ فہرست محبت کی اقدار نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ وفا، ایثار اور قربانی کی اقدار وابستہ ہیں۔ مشرقی معاشرے میں لوگ آج بھی محبت کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ رشتے ناطے احساسات و جذبات میں گندھے ہوئے ہیں۔ بچھڑ جانے والوں کی یاد مدتوں دل میں بسی رہتی ہے۔ مغربی معاشرہ کی آزادی نے فلسفۂ محبت کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔

''ترقی کی دوڑ اور اس سے وابستہ مسائل نے محبت کے عیسائی فلسفے پر سب سے کاری ضرب لگائی ہے۔ Free will کی زندگی طاقتور لوگوں کا مسلک ہے۔ مرضی اور اختیاری ارادہ انسان کو جہاں ترقی کا سبق پڑھاتا ہے، وہیں محبت سے آزادی حاصل کر کے انسان پُراعتماد ہو کر نفرت کرنے کو بھی اپنے بنیادی حقوق میں شامل کر لیتا ہے۔ جب تک حضرت مسیحؑ کا سکہ چلتا تھا، کسی سے نفرت کرنے کے بعد لوگ احساسِ جرم میں مبتلا رہتے تھے۔ پادریوں کے آگے دست بستہ confession کر کے اپنے آپ کو پاک کرتے رہتے تھے، لیکن اب محبت کی صلیب سے اتر کر اپنی مرضی کو کسی کی خاطر قربان کرنا آج کے سفید فام معاشرے کا شیوہ نہیں۔ ایسے عمل سے آزادی تلف ہوتی ہے اور محبت اور آزادی میں بنیادی

تضاد ہونے کی وجہ سے امریکہ کے معاشرے نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے اور محبت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔''(۱۸)

مشرق اور مغرب میں محبت کے فرق پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مصنّفہ لکھتی ہیں:

''مغرب اور مشرق اسی لیے کبھی نہیں مل سکتے کہ ہماری سوچ مختلف ہے۔ امریکہ خاص طور پر اور سفید فام مغربی معاشرہ عام طور پر محبت سے بچھڑ چکا ہے۔ سفید فام لوگوں نے جان لیا ہے کہ محبت کا سفر دراصل صحرائی لوگوں کو راس آ سکتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے فرد کے لیے آزادی کا دریچہ کھول کر اسے پہنائیوں میں تنہا اڑنے کی دعوت دی ہے بلکہ اسے تنہائی پر اُکسایا اور ترغیب دی ہے...... ایسے معاشرے میں انسان راضی برضا نہیں رہ سکتا، نہ مزاجِ یار کے تابع رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مشرق کے سفر میں نفس کو ساقط کر کے نروان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مغرب میں شخص کے ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں ہار، منہ میں گلوری دبا کر حواسِ خمسہ کی گاڑی میں بیٹھ کر لذت کا سفر کیا جاتا ہے۔ محبت کا سفر محبوب کی خاطر ہو یا اللہ کے لیے اختیار کیا جائے تو اس میں آنسو، صبر اور ایثار ہی ایثار کا موسم رہتا ہے۔ یہاں شاید خوشی نہیں ملتی لیکن شانتی اور قناعت ضرور ہمرکاب رہتی ہے۔ حدود سے نکلنے کی آرزو نہیں رہتی......''(۱۹)

محبت کی قدر سے خالی ہو کر امریکی معاشرہ بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔ رشتوں کا احترام اور محبت کی گرمی تعلقات کا جوش اور احساسات کی گہرائی سب آزادی، خودمختاری اور مادی ترقی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ محبت کی قدر ختم ہو جانے سے امریکی معاشرہ جس طرح بنجر ہو رہا ہے اس کے متعلق ناول کا کردار ہمایوں کہتا ہے:

''چونکہ مغربی لوگ محبت کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے اس لیے انہوں نے احساسِ جرم تلے خیراتی ادارے کھولے ہیں۔ ویل فیر اسٹیٹ بنا کر بے روزگار، پس ماندہ لوگوں کی مدد کی ہے۔ بوڑھے لوگوں کے ادارے بنائے ہیں۔ جہاں بڈھے موت کے انتظار میں درست دوائیاں، طاقت افزا وٹامن، خوراک، آرام حتیٰ کہ تفریح بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں، لیکن ان بڈھوں سے محبت کوسوں دور رہتی ہے۔ وہ volunteers اور وقت بے وقت آنے

والے مہمانوں کے انتظار میں خالی دن خالی راتیں بسر کرتے ہیں۔ Baby care، day care وغیرہ کے پاس بچہ چھوڑا بھی جاسکتا ہےاور پل بھی جاتا ہے،لیکن نہ اسے ماں کا دودھ ملتا ہے، نہ ماں کی محبت کا شہد آگیں رس اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔اپنے اپنے کاموں کے بعد ساتھی پر کام کی تھکن،اضطراب اور ڈیپریشن نکالنے کا نام شخصی آزادی ہے۔ کام کے بعد دونوں ساتھی کھیں کھیں کر کے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔کوئی بھی تازہ دم کرنے والی محبت پر وقت اور توجہ صَرف کرنے کا قائل نہیں ہوتا۔گھر پر بھی کاموں کی زیادتی منہ کھولے دونوں کو ہڑپ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس اینٹی محبت کا الزام ہم صنعتی انقلاب پر دھریں اور ترقی کی خاطر ان قربانیوں کو درست جانیں جو آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی دے رہا ہے۔مشکل یہ ہے کہ جب محبت حاصل نہیں ہوتی تو آدمی کھاتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔مکان قسطوں پر حاصل کر لیتا ہے،لیکن وقت کی کمی کے باعث مکینوں سے بچھڑ جاتا ہے۔محبت کی تلاش چھوڑ کر جنس کا لڑا ڈانس میں تھرکتا ہے،لیکن روح پیاسی رہتی ہے۔بازاروں کے طواف کر کے زیبائش،آرائش،نمائش کی اشیاء خریدتا رہتا ہے،لیکن ان اشیاء کی قسطیں گننے کے بعد انہیں انجوائے نہیں کرسکتا کیونکہ وقت اور محبت کی قلت اسے نہ تو کسی چیز سے، نہ ہی کسی انسان سے رابطہ قائم کرنے دیتی ہے۔اور نہ ہی اس کمی کے متعلق سوچنے کی مہلت فراہم کرتی ہے۔"[۲۰]

محبت کی جگہ امریکی معاشرے میں غیر شخصی ہمدردی کی قدر نظر آتی ہے۔یہاں خدا ترس، ہمدرد لوگوں کی بھی ایسی کھیپ ملے گی جو بے شمار رفاہی کاموں میں مصروف ہے اور اپنی آمدنی کا خطیر حصہ خیراتی کاموں میں صَرف کرتی ہے۔لیکن یہ ہمدردی،محبت کے جذبے سے خالی ہوتی ہے۔سفید فام لوگوں کا امریکی معاشرہ ہمدردی تو ضرور کرتا ہے لیکن وہ جذباتی طور پر ایسے کاموں میں مشغول نہیں ہوتا جو اس کے دل پر دستک دیں۔سفید فام لوگ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر شخصی ہمدردی تو مصروف زندگی کے ساتھ اور متعصب خیالات کے ساتھ ممکن ہے لیکن دوسرے انسان کے ساتھ ایسی محبت کرنا جیسی اپنی ذات کے ساتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، یہ اس کے لیے ممکن نہیں کیونکہ وہ ترقی کے راستے کا مسافر ہے۔وہ انسان کی تلاش کا سفر اختیار نہیں کرسکتا۔ ہمایوں جب امریکہ آیا تو اس کا خیال تھا کہ برسوں بعد وہ اس محبت کو محسوس کر سکے گا جو بچوں کے

بچھڑنے اور بیوی کی وفات کے بعد اُس کی زندگی میں نہ رہی تھی۔لیکن امریکہ پہنچ کر وہ سخت مایوس ہوا۔

''میں بھی آزادی کی تلاش میں ارجمند کے گھر آیا تھا۔ یہاں پر ایسی محبت حاصل ہوگی جس کا کئی برسوں سے میں عادی نہ رہا تھا۔ یہاں مجھے نہ آزادی کا احساس ہوا نہ محبت کا۔ ڈاکٹر بلال کا اپنا دائرۂ کار ہے، ارجمند اپنی مصروفیات میں گم رہتی ہے۔ قیصر اور جمشید کے ساتھ پتہ نہیں کیوں میری اچھی Equation نہ بن سکی۔ وہ دونوں بھی اپنے معمول کے تابع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے میرے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ابھی سے کمپیوٹر کے اردگرد رہتے ہیں...... جب جی چاہتا ہے فریج کھول کر کچھ نہ کچھ نکال کر کھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے معاملات میں ابھی سے آزاد ہیں۔ انہیں نہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے نہ انفورم کرنے کی۔ اس طرح ارجمند پر ان کی پرورش کا بوجھ کم ہوتا ہے۔ لاتعلقی بڑھتی تھی تو یہ بھی اس کی ضرورت تھی، کیونکہ ایسے میں اسے آزادی بھی زیادہ ملتی، لیکن محبت کیے بغیر کسی دوسرے انسان کو نہ کوئی جان سکتا ہے، نہ جان دے سکتا ہے۔ ریستورانوں میں، کلبوں میں، تفریحی پروگراموں میں ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے۔ Infatuation کا روگ لگ سکتا ہے محبت ممکن نہیں۔'' (۲۱)

امریکی معاشرے نے محبت کی بجائے آزادی کی قدر کو اپنایا ہے۔ اس معاشرے کا سب سے بڑا تضاد محبت کی طلب اور آزادی کی خواہش ہے۔لیکن بالآخر فیصلہ آزادی کے حق میں ہوتا ہے۔ آزادی کی یہ خواہش امریکی معاشرے میں ایک بے اطمینانی پیدا کر رہی ہے۔

''امریکہ چونکہ ذات پر انحصار اور اس سے پیدا کردہ ترقی کا داعی ہے، اس لیے وہاں آزادی اوّلین Priority ہے۔ آزادی کے کیک پر تعلق کی آئیسنگ بھی لگی ہو تو بہت خوب، ورنہ پلین کیک ہی چلے گا۔ عام طور پر آزادی کی قینچی سے وہ تمام رسّیاں کٹ جاتی ہیں، جن سے انسان بندھا ہوتا ہے۔ تعلق چلتے ہیں، لیکن تادیر اُن کو نبھانا اور کسی پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ جب اقتصادی، جذباتی، نفسیاتی Dependency ختم ہو جاتی ہے تو تنہائی کا چیتا گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا ہے، تعلق وقتی ہو کر تصنّع اوقات میں بدل جاتے ہیں اور

مصروف انسانوں کو اندر کی زندگی سیراب کرنے کے لیے نت نئے چشمے نکالنے پڑتے ہیں۔
پھر امرد پرستی کا جنون چلتا ہے۔ ہم جنسوں کی شادیاں بھی قانونی ٹھہرتی ہیں۔ لوگ Punk بنتے ہیں، گروہی ناچ گانا، انفرمیشن، ٹیلی وژن، انٹرنیٹ، دوسرے ممالک کے سفر، مختلف ریاستوں میں مختلف قسم کی روزگار کی تلاش، اضطراب دراضطراب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور گہرے تعلق کا نعم البدل تلاش کرنے میں وقت بھٹکتا رہتا ہے۔" (۲۲)

امریکی معاشرے میں آزادی کی قدر نے تعلقات کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ تعلقات سے وابستہ توقعات کی زنجیر ختم ہو چکی ہے۔ وہاں کا بچہ بہت جلد سمجھ جاتا ہے کہ ماں ایثار و قربانی دے کر اور اپنی شخصی آزادی تج کر اس کی پرورش نہیں کر سکتی۔ وہ رونا چھوڑ کر ماں سے وابستہ توقعات کو بھی بھولتا جاتا ہے۔ بوڑھے ماں باپ بھی یہ توقع نہیں رکھتے کہ ان کی اولاد اپنی آزادی اور جوانی ان کی خاطر قربان کر دے گی۔ اسی طرح عمر بھر کا ساتھی جس سے بیماری، تنگ دستی، موت اور زندگی کے سفر میں ساتھ نبھانے کا عہد باندھا گیا تھا اگر اس کا تعلق بوجھ بننے لگتا ہے تو اسے طلاق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

"میں نے سوچا دراصل آج کا عہد نہ سپیس ایج ہے نہ میڈیا oriented ہے...... یہ وہ عہد ہے جب آزادی اور تعلق کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ فلاح کا عہد رخصت ہو رہا ہے۔ ترقی کا دور آگے بڑھ رہا ہے۔ ترقی جس کا علم آزادی ہے اور فلاح جو تعلق کا پھریرا لے کر چلتی ہے۔ میں اس ترقی کے جھنڈے کو غور سے دیکھتا ہوں، اس پر صرف ایک تیر بنا ہے جو آگے ہی آگے جاتا ہے۔ چیرتا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔
امریکہ نے اور اس کی دیکھا دیکھی تمام ترقی پذیر ممالک نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے...... کرنے مرنے کی آزادی...... ہر قسم کے تعلق سے نکل جانے کا عہد، اپنی ذات کو سربلند ثابت کرنے کا عزم۔" (۲۳)

امریکی معاشرہ لبرل معاشرہ ہے۔ وہاں وہی شخص پھل پھول سکتا ہے جو لبرل ہو۔ امریکہ میں لبرل اس شخص کو سمجھا جاتا ہے جو تعلقات کی تمام زنجیروں کو توڑ چکا ہو۔ وہ وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نہ ہو، کسی خاص مذہب، مسلک، رسم و رواج کا پابند نہ ہو۔ وہ آسانی سے دوسرے کے سانچے میں ڈھل سکتا ہو اور اس کا ضمیر اسے اس تبدیلی پر لعن طعن نہ کرتا ہو۔ لبرل ازم کا فلسفہ دراصل امریکی معاشرے کی معاشی و مادی ترقی کی ضرورت ہے۔

''ان لوگوں میں دوسرے ''Ethnic Group'' کے ساتھ افہام وتفہیم پیدا کرنے کے لیے کچھ تبدیلی کی اشد ضرورت تھی ان لوگوں نے، جو اکثریت میں تھے اور ترقی کے خواہاں تھے، اپنے فائدے کے لیے بھاری جنگلوں کو کاٹنے، ریل کی پٹریاں بچھانے، عمارتیں اسارنے، سڑکیں بچھانے، انڈسٹری کو چلانے کے لیے جن کالے براؤن لوگوں کو درآمد کیا، ان کے ساتھ سوشل جسٹس کی خاطر نہیں بلکہ زیرِ دام لانے کی پالیسی کے تحت بڑی فراخ دلی دکھائی۔ اپنے لوگوں کو Racist ہونے سے روکنے کے لیے ضروری تھا کہ مذہب سے وابستگی کو Bulldozer سے ہموار کیا جائے۔ اب امریکن ہولے ہولے اپنے اعتقادات اور عیسائی Doctrine کے اصولوں کو نرم کرتے کرتے اور دوسرے مذاہب کے لیے گنجائش پیدا کرتے ہوئے اس قدر ترقی پسند ہو گیا ہے کہ اس کا ایمان ہی مذہب سے اٹھ گیا۔ دراصل لبرل انسان کے پاس ایمان جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔'' (۲۴)

مادی ترقی کے حصول کے لیے امریکی معاشرے نے کام کی قدر کو اپنا لیا ہے۔ اس معاشرے میں عزت اسی انسان کی ہے جو کام میں پورا اُترتا ہے۔ یہاں کی ساری اخلاقیات کام کی اخلاقیات کے بعد آتی ہیں، اسی لیے یہاں وقت بہت اہم ہے۔ یہاں لوگ ڈالر نہیں بچاتے، وقت بچاتے ہیں۔ مغربی لوگوں کا خدا کام ہے، اس کی اخلاقیات میں سرِ فہرست محنت کی اخلاقی قدر رہے۔ وہ کام میں چوری نہیں کرتا۔ اپنے آجر کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ محنت کی اخلاقیات نے اسے مشینی بننے میں مدد دی ہے۔ اسی لیے بالآخر اسے کام سے بریک درکار ہوتی ہے اور وہ پورے پانچ دن مشین بنا ہفتے کے آخر کا انتظار کرتا ہے، جب اس کے جسم کو تفریح اور آرام کی گریس دی جا سکے۔

''نہ تو کوڑا اٹھانے والے نہ گھاس کاٹنے والے نہ ہی شیشے صاف کرنے والوں کو کام کرنے میں کوئی دِقت پیش آتی ہے۔ اپنے اپنے وقت پر آتے اور کام کرنے کے بعد پھُر سے اُڑ جاتے...... پرندوں کی طرح۔ یہاں نہ داروغۂ صفائی تھا، نہ کوئی ایسا میٹ جو کام کروائے۔ مکھی کے چھتّے کی طرح سارے کارکن پابندِ کار تھے۔ ان روبوٹوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ یہ کیسی دنیا ہے، کیسا نظام ہے...... جہاں کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی شخص روڑا بنتا ہے، نہ ہی کسی دوسرے کو رکاوٹ بننے پر آمادہ کرتا ہے......سب کا رشتہ کام سے گہرا ہے اور

فرد کا فرد سے رشتہ ناطہ ذاتی اغراض کے باعث نہیں، بلکہ ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔ یہاں سب کام کی اہمیت کے لیے جڑنے کو کوشش کرتے ہیں...... بلال میرا داماد ہے......ایک مدت سے اس کی زندگی مشینی ہے۔ وہ عقل کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ ہم دونوں پہلے ناشتہ کرتے ہیں، میری بیٹی اور اس کے دونوں بیٹے ذرا لیٹ جاتے ہیں۔ بلال کے ساتھ میری بے تکلّفی نہیں ہے۔

کبھی تم نے سوچا بلال؟......

جس قدر کام تم اور ارجمند یہاں کرتے ہو اس کا تصور بھی پاکستان کے نوجوان نہیں کر سکتے...... پہلے دفتروں میں پستے ہو پھر گھر آ کر گھریلو ملازم بن جاتے ہو...... یہ بھی کوئی زندگی ہے......کوئی فراغت نہیں آرام نہیں......گھڑی بن گئے ہو گھڑی۔

ٹھیک ہم کام کے عادی ہو گئے ہیں ابا جی۔ آپ فکر نہ کریں۔ کام ہماری زندگی، خوشی، سکون ہے...... یہاں کام مشقت نہیں لگن ہے لگن......

وہ اپنا بریف کیس لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے۔ اسے ہسپتال تک پہنچنے کے لیے آدھ گھنٹہ درکار ہے۔ چار پانچ جملے بول لینے میں اس کا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کی پاداش میں اسے گاڑی تیز چلانی پڑتی ہے......Stress میں جانا پڑتا ہے۔'' (۲۵)

امریکی معاشرے کا نصب العین مادی ترقی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی مشکل ہے۔ اسی ترقی نے محبت کی بجائے آزادی کو رواج دیا ہے۔ اسی کے حصول کی خاطر رشتے اور تعلقات بے معنی قرار دے دیے گئے ہیں۔ وقت اہم اور انسان غیر اہم ہو چکا ہے۔ کام امریکی معاشرے کی بنیادی قدر بن چکا ہے، کیونکہ اس کے بغیر مادی ترقی ممکن نہیں ہے۔

''آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے لیے اصول ان کے برعکس ہیں۔ اسراف اسی ترقی کا سنگِ بنیاد ہے۔ خواہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔ روپیہ پیسہ گھر سے بازار تک آتا جاتا رہے، مسابقت وہ تیل ہے جو ترقی کی مشینی گراریوں میں پڑتا رہے تو مشین چلتی ہے۔ یہاں صبر توکل نام کا دِیا نہیں جلتا۔ جو کچھ ہونا ہے ابھی اسی وقت اسی لمحے کی گھنٹی بجاتا ہے، اس بے کلی سے رفتار پیدا ہوتی ہے، سڑکوں پر ٹریفک جیم تیار ہوتا ہے،

سیڑھیاں متروک ہوتی ہیں، لفٹیں اوپر نیچے آتی ہیں، گھڑی بار بار دیکھنا اور کار میں دروازہ کھلنے والے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر سفر کرنے کا رواج بڑھتا ہے۔ انسان بے قرار نہ ہو تو ترقی نہیں کر سکتا۔ دوسرے کو مار گرانے کا جوڑ و کراٹے نہ آئے تو آگے نہیں بڑھ سکتا۔ روپے سے محبت پیدا نہ ہو سکے تو ترقی کا تصور حاصل نہیں کر سکتا۔ اسراف، مسابقت، خواہشات کا پٹا تیزی سے چلتا رہے تو زمانے کی پٹڑی پر ترقی فل سپیڈ چلتی ہے۔'' (۲۶)

امریکہ میں مذہب کا اجتماعی نظام موجود نہیں کیونکہ یہاں بہت سی قومیں، مذاہب، نسلیں مستقلاً ایک دوسرے سے بھڑتی رہتی ہیں۔ جھگڑے اور تصادم سے بچنے کے لیے اور اکثریت کی خواہشات کو مدِّ نظر رکھ کر امریکی شہریت مذہب کو ذات سے جوڑ کر ہیومن رائٹرز کے نظام پر چلتی ہے۔ امریکی شہری نظام کا پابند ہوتا ہے، لیکن حکومت شخصی آزادی پر پہرہ نہیں بٹھاتی۔ نظام کے پابند اس معاشرے میں ذاتی زندگی آزاد ہونے کے باعث معاشرہ مشکلات سے دوچار ہو جاتا ہے۔ طمانیت، سکون اور شانتی کی کمی ہو جاتی ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں بڑھنے لگتی ہیں۔ طلاق کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شلٹر ہومز بڑھنے لگتے ہیں۔ فرد کو سہارا دینے والا خاندانی نظام نہ ہونے کی وجہ سے وہ تنہائی کے روگ کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہمایوں کو امریکی معاشرے کی آزادی پسند طبیعت کے مقابلے میں محبت کے بندھن میں جڑے مشرقی لوگ یاد آتے ہیں۔ اسے اپنی ماں شدت سے یاد آتی ہے جو آزاد نہیں، محبت کی غلامی میں رہنا چاہتی تھی۔

''اماں چولہے کے پاس بیٹھ کر شاہد بھائی کا انتظار کرتی رہتیں۔ ان کے نزدیک محبت میں تکلیفیں سہنا، ایثار کرنا اور دوسرے کے آرام کی خاطر اپنی ذات کو تلف کرنا دلیلِ محبت تھی۔ شاہد بھائی کے لیے وہ اس طرح کنڈی کھولتیں کہ ذرا سا شور بھی نہ ہوتا۔ چپاتی یوں پکائی جاتی کہ رتّی بھر کھڑاک نہ گونجتا۔ پھر اماں ستّر پوش اتنی زیادہ تھیں کہ ابا تک یہ رپورٹ کبھی نہ پہنچتی کہ رات شاہد دیر سے آیا...... اس محبت نے شاہد بھائی کو بے باک کر دیا۔ انہیں وقت بہ وقت کج راہ ہونے پر آمادہ کیا، اس بات کا اماں کو نہ احساس تھا، نہ ادراک، وہ تو بس اپنی توڑ نبھانے کی فکر میں تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے کوئی توقع نہ رکھی...... نہ اپنے بچوں، نہ اپنے شوہر نہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار سے...... وہ صرف اپنا لیکھا صاف رکھتی تھیں۔ ماں کو صرف اپنی دس انگلیوں پر اعتماد تھا۔ جو اس کی سروس میں ہمہ وقت رہتیں...... اماں کی اسی

بے جان ناتواں محبت نے شاہد بھائی کے گرد ایسا حصار باندھ رکھا تھا جس سے نکل کر وہ کبھی دور نہ جا سکے۔ جس طرح مہارانی سیتا کی کٹیا کے باہر مہاراجہ رام نے ایک لکیر کھینچ دی تھی جس سے باہر نکلنے کا آرڈر نہ تھا۔ ایسے ہی اماں کی شب بیداریوں نے شاہد بھائی کی شاعر مزاجی کو پابند کر لیا تھا۔ وہ لمبی اُڑانوں پر جانے کی آرزو تو رکھتے تھے لیکن وہ کولمبس نہ بن سکے اور کسی نئی دنیا کا انکشاف ان کا مقدر نہ ہو سکا۔''(۲۷)

اماں کے بعد ہمایوں کی بیوی مشرقی اقدار میں گندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ محبت، صبر اور ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے۔ وہ ان مشرقی بیویوں میں شامل تھی جو شوہر کو مجازی خدا مان کر اس کے ہر حکم کو درست سمجھ کر اس کی نافرمانی نہیں کرتیں۔ اس کی عادتیں، سوچ، رہنا سہنا اور مذہب سے وابستگی اوسط سطح کی تھی۔ نہ اس میں کبھی آزادی کی خواہش جاگی اور نہ کبھی اس نے اپنی ذات کو دوسرے پر مسلّط کیا۔ روایتی مشرقی لڑکیوں کی طرح شادی اس کا خواب تھا اور اس خواب نے اس کی سائیکی پر کوئی بوجھ نہ ڈالا تھا۔ میاں بیوی میں محبت نہ ہونے کے باوجود وہ شادی کے مقدس رشتے کو بخوبی نبھاتی رہی۔ اس نے خود کو رشتے اور تعلق کی زنجیروں سے باندھ رکھا تھا۔ یہ شادی کا روایتی مشرقی فلسفہ ہے کہ شادی سے پہلے کی محبت نہ ہونے کے باوجود میاں بیوی رشتے کے احترام اور ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھاتے ہیں۔ اصغری نے کبھی فکروں اور فرمائشوں کا بوجھ ہمایوں پر نہ ڈالا، نہ ہی ان دونوں کے درمیان عام میاں بیوی جیسی چخ چخ ہوا کرتی۔ نہ وہ ہمایوں کے ماضی سے حسد کرتی اور نہ ہی ہمایوں نے کبھی اس کی پہلی منگنی کا ذکر کیا جو چار سال سسک سسک کر ٹوٹی تھی۔

''اصغری سائبان سی عورت تھی، ہر وقت سایہ کرنے، دینے، ہونے کے مرحلوں میں رہتی۔ گھر پہنچ کر میں بھی بچوں کی طرح آزاد ہو جاتا، آرام دہ بیوی مجھے اسیری کا محتاج بنا دیتی، میں اسی اسیری کا عادی ہو گیا جو اچھی عورت پیدا کر دیا کرتی ہے۔''

ہمایوں اپنی بیوی کی سکھ بھری رفاقت کو یاد کر کے اس مشرقی شادی کا موازنہ مغربی رشتۂ ازدواج سے کرتا ہے تو اسے ناکام شادیوں کی وجہ آزادی کی طلب میں نظر آتی ہے۔

''مغرب میں خود انحصاری کے حصول نے، آزادی کی طلب نے شادی جیسے مضبوط نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب جنس، روزی، تفریح، رفاقت ذاتی مسئلہ ہے۔ کسی ایک کنویں سے پانی پینے کا عمل نہیں۔ اور اتنی خود مختاری حاصل ہونے کے بعد کسی ایک شخص سے بندھے

رہنا، دست نگر ہونا بہت بڑا وبال بن جاتا ہے۔اصغری اور مجھ میں کئی ضرورتیں سانجھی تھیں۔ میں بُری طرح اس سایہ دار درخت کی چھاؤں کا عادی تھا۔ وہ اوراس کے بچے میری کفالت کے بغیر بہت ساری مشکلوں کا شکار ہو جاتے...... اسی لیے زیادہ اڑچنوں کے بغیر ہماری پارٹنر شپ نبھ گئی۔ہم ایک دوسرے کی ضرورت بنے رہے۔'' (۲۸)

ہمایوں امریکہ میں اپنی بیٹی ارجمند اور داماد کی زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے افسوس ہوتا ہے۔ارجمند مشرقی عورت کی تمام صفات بھلا کر روایتی مشرقی بیوی کی بجائے امریکہ کی خودمختار اورآزادی پسند عورت کا روپ دھار چکی ہے۔ان کی ازدواجی زندگی اس سکون اور اطمینان سے خالی ہے جو شادی شدہ زندگی میں ہمایوں کو حاصل رہا تھا۔شاہدہ اور ارجمند دونوں بدلتے سماجی پس منظر میں اقدار کی تبدیلی کی مظہر ہیں۔ یہ دونوں مادی ترقی کی خواہش میں اپنے آبائی روایتی پس منظر اور اقدار و روایات کو بھلا کر شخصی آزادی اور خودمختاری کی طلب گار ہیں۔ یہ بیک وقت محبت کی طلب اور آزادی کی خواہش کے درمیان پس رہی ہیں۔

''جب ارجمند نے سر جھکا کر کہا تھا......'' آپ کو معلوم نہیں ابا، میری زندگی امریکہ میں کتنی مشکل ہے۔ میرا شوہر مجھے نہیں سمجھتا۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں لیکن وہ مجھ میں...... میرے وجود میں...... میری ذات میں رتّی بھر دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمارے گھروں میں مرد کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا سکھایا ہی نہیں جاتا...... وہاں...... بڑی مشکل ہے ابا جی۔ بلال کو میری مدد کرنی چاہیے لیکن نہیں کرتا...... میں کماؤں بھی اور گھر بھی رکھوں...... بچے بھی پالوں......ارجمند کیا کیا کرے ابا جی......کیا کچھ کرے؟''

میری بیٹی بھی آزادیٔ نسواں کی ویسی ہی علمبردار تھی......وہ بھی جب مجھے گھر سے اکھاڑنے اور امریکہ میری پیوند لگانے کے درپے ہوئی تو اس کی ساری منطق شاہدہ جیسی تھی۔ وہ اپنے ڈاکٹر شوہر کے خلاف ویسے ہی پٹ سیاپا میں مبتلا تھی جیسا شاہدہ نے اپنے گھر والوں میں جہانگیر کے خلاف کیا ہوگا......'' (۲۹)

ارجمند اور شاہدہ اپنے اپنے شوہروں سے بہت شاکی ہیں۔وہ ہمیشہ یہ چاہتی ہیں کہ شوہر ان کی مرضی کے آگے سر جھکا دے، لیکن وہ خود ایثار و قربانی کے جذبے سے بالکل عاری ہیں۔وہ کسی بھی طرح اپنی ذات کی نفی کر کے شوہر میں دلچسپی

پیدا نہیں کر سکتیں۔

''آپ کو معلوم نہیں ابا جی! ڈاکٹر صاحب کتنے پتھر دل ہیں۔ ان کے پاس تو میرے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہسپتال سے آ کر سیدھا ٹیلی وژن، فٹ بال، فٹ بال، فٹ بال...... کھانا پینا اور کھٹ بستر...... صبح شام وہی روٹین...... میرا تو وہ نوٹس ہی نہیں لیتے سرے سے۔''

''ٹیلی وژن پر کیا دیکھتا ہے......''

''فٹ بال میچ، پہلوانی کے دنگل اور سائنس فکشن۔''

''تم بھی پاس بیٹھ کر ٹیلی وژن دیکھ لیا کرو......''

''مجھے ایسے پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہیں ابا...... مجھے کشتی دیکھ کر قے آتی ہے۔''

''اور فٹ بال میچ......؟''

''اس میں کیا پڑا ہے۔ پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا، ابا کچھ ہاؤس ورک کرنا ہوتا ہے۔ بچوں کو ہوم ورک کرانا پڑتا ہے، ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں کام کر کر کر کے۔''

''تمہارے شوہر کی معقول آمدنی ہے، نوکری چھوڑ دو اور گھر بیٹھو آرام سے۔''

''اور سارا دن کیا کروں، مکھیاں ماروں...... انتظار کروں شوہر کا...... بچوں کا۔''

میں نے کہنا چاہا کہ یہ دونوں مشغلے ہڈیاں تڑوانے سے بہتر ہیں۔ پھر کام کا رنڈی رونا بھی ختم ہو جائے گا۔ ہاؤس ورک سے دل لگا رہے گا...... اس کے بعد مجھے علم ہوا کہ ڈاکٹر کی داستان بھی جہانگیر سے کچھ کم ناخوشگوار نہیں تھی۔ ارجمند بھی اپنی طرز کی شاہدہ ہی تھی۔''(۳۰)

مغرب میں عورت کی معاشی آزادی نے اُسے مرد کی کفالت سے آزاد کر دیا ہے۔ وہ اب برابری کی دعویدار ہے۔ اس پر بھی کام کا بوجھ مرد سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس کی مصروفیات اسے چڑچڑا اور بے باک بنا دیتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے رشتے میں بندھے رہنے کے لیے مجبوری اب ختم ہو چکی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عورت کا اب سسرال سے جنازہ اٹھنا ضروری نہیں ہے۔ وہ جب چاہے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے۔ اسی لیے جدید میاں بیوی کی زندگی تلخی کا شکار ہو رہی ہے۔

''ارجمند اس انفرمیشن سے نہ صرف بور ہوتی ہے بلکہ بچ جاتی ہے، آرام سے کار چلاؤ بلال۔

یہ امریکن ہسٹری بیان کرنے کا کون سا وقت ہے......

بچوں کوانفرمیشن دیناماں باپ کا فرض ہے...... بلال غرایا۔

یہ کونسی جگہ اور وقت ہے......تم بار بار غلط Over take کررہے ہو، سڑکیں بدل رہے ہو اور پھر بچے اتنی پیچھے ہیں کہ تمہاری آواز بھی وہاں تک نہیں جارہی۔

جو کچھ بھی ہے...... میرے پاس صرف یہی وقت ہے...... میں انہیں جاہل نہیں دیکھنا چاہتا......سکول میں بہت کومپی ٹیشن ہے۔

گھر پرتو تمہیں سوائے فٹ بال دیکھنے کے کوئی وقت ہی نہیں ملتا...... یہاں ساری کسر نکال رہے ہو۔

اب وہی بحث چل نکلتی ہے جو آج کے ماڈرن میاں بیوی کی زندگی میں زہر گھولتی رہتی ہے۔

دونوں اپنے آپ کو Misunderstood, under over worked appreciated لیکن نیک دل سمجھتے ہیں۔''(۳۱)

مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہی ہے۔اگر خاندان طاقتور، امیر اور عزت والا ہوتو کبھی کبھی یہ مافیا کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔فرد معاشرے کے تابع، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند رہ کر اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔لیکن سفید فام لوگوں اور خصوصاً امریکی معاشرہ خاندان کی زنجیریں کاٹ چکا ہے۔ یہاں فرد نظام کا تابع ہوتا ہے، خاندان اور اقدار وروایات کا نہیں۔اس معاشرے میں فرد اپنے ذاتی فعل اور ذاتی زندگی میں اس قدر خودمختار اور آزاد ہے کہ وہ کیسا ہی بے راہرو کیوں نہ ہو جائے، یہ اس کا ذاتی مسئلہ سمجھا جائے گا اور کوئی خاندان پوچھ گچھ کے لیے حاضر نہ ہوگا۔حقہ پانی بند کرنے کا تصور امریکی معاشرے میں موجود نہیں ہے۔

شخصی آزادی اور خودمختاری کے سبب امریکی معاشرہ روحانی اور اخلاقی زوال میں گر چکا ہے۔قدروں کی پاسداری ختم ہو جانے سے اس معاشرے میں طرح طرح کی نفسیاتی و اخلاقی بے راہرویاں پیدا ہو چکی ہیں۔مشرق کا حساب ابھی بھی مغرب سے مختلف ہے۔اس معاشرے میں فرد پابند اور شہری آزاد ہے۔ یہاں ابھی خاندان سے منفی اور مثبت دونوں طرح سے فرد وابستہ ہے۔ یہاں کے رسم ورواج، لین دین، محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر بہتے ہیں۔ خاندان حقہ پانی بند کر دیتا ہے۔شخصی آزادی پر کڑے پہرے ہیں۔مشرقی لوگ شخصی زندگی میں رسم ورواج، کلچر اور مذہب کے پابند ہیں۔ذات پات کی بندش کو فرد قبول کرتا ہے۔والدین ابھی ادب کے درجے پر ہیں۔ بچے کی وجہ سے ناکام شادی

کو نبھایا جا سکتا ہے۔ اس معاشرے میں محبت، مروّت اور یگانگت کے رشتے ابھی بھی موجود ہیں جو فرد کو مضبوط سہارا فراہم کرتے ہیں۔ اسی کے باعث نفسیاتی مسائل کم اور تنہائی کم تر اور سکون اور طمانیتِ قلب وافر ملتی ہے۔

مشرق میں خاندانی زندگی اقدار کی منتقلی کا مضبوط اور ٹھوس ادارہ ہے۔ گھر کے بزرگ باتوں باتوں میں ان اقدار و روایات، رسم و رواج کو بچوں کے ذہن نشیں کراتے رہتے ہیں۔

> ''یہ دادی کے مرنے سے پہلے کی بات ہے۔ دادی ٹمپل روڈ والے گھر میں ہم سے بچھڑی۔ اس کے سارے بال سفید، دانت پان زدہ کیسری رنگ لیے ہوئے، جسم تڑا مڑا، آواز میں خرخر اور چال میں اب گری کہ اب گری والی کیفیت تھی، لیکن ذہنی طور پر دادی چوکس تھی۔ اسے ہر وقت علم رہتا کہ کون کدھر ہے اور کیا کرتا ہے؟ کونسی چیز مذہب سے وابستہ ہے اور کون سی رسم و رواج سے۔ وہ اُلو کی سی دانائی اور بلی کی سی چوکس نظروں سے سارے گھر کو دیکھا کرتی، خاص کر اسے اماں سے ہمیشہ خدشہ رہتا کہ وہ کہیں پوتے پوتیوں کو خراب نہ کر دے، اپنی خاندانی روایات سے علیحدہ کوئی نئی پنیری نہ لگا دے۔'' (۳۲)

مشرق میں یہ رواج عام رہا ہے کہ ماں باپ بچوں کی پرورش میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ ماں گھریلو کام کاج میں مصروف رہتی اور باپ کفالت کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں لگا رہتا، لیکن گھر کے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہی روایت کو بچوں تک پہنچانے کے ضامن بھی تھے اور بسا اوقات جہالت بھی ان ہی کے توسط سے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں منتقل ہو جاتی۔ ان کے ساتھ ہی وہ اقدار جن کی اثاث مذہب ہوتا خواہ ان پر ایمان بھی بہت کڑا نہ ہوتا لیکن دادے کی یہ وراثت بھی اگلی نسل تک پہنچ جاتی۔

> ''دادا خود ریڈ لائٹ کا رسّیا، شراب کا عاشق، جوئے کا دلدادہ ہوتا لیکن اپنے پوتے کو اِن برائیوں سے روکنے کا خود کو نہ صرف مجاز ہی سمجھتا بلکہ اصرار بھی کیے جاتا کہ من کنم شما حذر کنید۔ یہی تربیتی ادارہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ نہ کچھ چھت سے رِسنے والا پانی بنیادوں میں ایمان صورت بیٹھ ہی جاتا تھا......'' (۳۳)

> ''دادی کے پاس قدروں کی وراثت تھی۔ وہ اقدار، رسم و رواج، مسلک، روزمرّہ کی کامن سنس کا خزانہ تھی۔ وہ اپنی وراثت تیسری پود کو منتقل کرنے کی خواہاں بھی تھی......

''السّلام علیکم......'' منہ تھتھا کر ظفر بولا۔

''ادھر بیٹھو......''

ظفر میں ابھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ بیٹھنے سے انکار کرتا۔ دادی نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا......''یہ کیا ہے؟''

''چھڑی ہے جی شہتوت کی......''

''اور تو اس چھڑی سے زمین کو کیوں مار رہا ہے......؟''

ظفر چپ رہا......

''تو نے دھرتی کو کیوں پیٹا نالائق......''

ظفر نے کسمسا کر کہا......''بس ایسے ہی جی''

''سن رہا ہے ہمایوں......ایسے ہی ہوا میں بڑک بڑک کر زمین کو پیٹتا ہے کوئی جب تک بات نہ ہو......''

''ابھی اس نے مجھے گرایا تھا......دادی جی۔''

''اس نے کیسے گرایا تجھے۔ اچھل کر تیرے سامنے آ گئی بول بتا؟ ہاتھ پاؤں ہیں اس دھرتی کے کہ ٹھوکریں لگاتی پھرے تجھے......''

''اونچ نیچ تھی جی مجھے نظر نہ آئی...... یہ دیکھئے میری کہنی چھِل گئی ہے ساری۔'' ظفر بولا۔

''یہ کہہ ناں...... یہ بتا کہ چہرے پر آنکھیں ہونے کے باوجود تو اندھوں کی طرح چلتا ہے اور پیٹ رہا ہے زمیں کو......ساری عمر کیا ایسے ہی بے انصاف رہنے کا ارادہ ہے......قصور اپنا ہو گا اور سزا دوسروں کو دے گا؟......لگا اس کے دو تھپڑ ہمایوں......لگا......لگا''

میں نے دادی کو بچھی ڈال کر کہا،''چلئے معاف کر دیجیے دادی......''

مجھے ظفر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ نظر آئی۔

''معاف کر دیجیے کتنا معاف کروں تم سب کو......تمہارا دادا زندہ ہوتا تو ساروں کو سدھ کر دیتا......وہ رفعت کی بچی مدھو بالا بنی پھرتی ہے......الو کے پٹھے شاہد کو نہ پڑھائی کا فکر نہ

روزی کمانے کا۔شاعر بن رہا ہے کم بخت......اور یہ شیطان کی ٹوٹی اور سنو بچو اسی زمین میں دھنسنا ہے آخر کو......اس پر تو پاؤں بھی پولا پولا دھرنا چاہیے۔جو یہ پھل فروٹ کھاتے پھرتے ہوناں...... یہ اسی دھرتی ماں نے بھیجے ہیں۔ پر تم کو پروا...... ماں سارا دن انارکلی میں گھسی پھرتی ہے، دیکھتی پھرتی ہے نت نئی چیزیں...... باپ کو سیکرٹریٹ ہو گیا......تربیت کون کرے؟ نیک و بد کون سمجھائے ان بلونگڑوں کو......؟ کون بتائے انسان کیوں آیا ہے یہاں، کیا ذمہ داری ہے اس کی۔'' (۳۴)

بانو قدسیہ کہتی ہیں، دراصل مشرق اور مغرب کا اصل فرق طرزِ فکر کا فرق ہے۔ایک زمانہ تھا جب مشرق مغرب سے روحانی طور پر زیادہ ترقی یافتہ تھا لیکن اب ترقی کا تصور بدل گیا ہے۔اب ترقی دنیاوی، مادی اور مال کی ہے۔ مشرق اس ترقی کا تصور بھی ٹھیک طور پر نہیں کر سکتا۔ایک زمانہ تھا جب مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی۔ مشرق کے پاس مذہب کا تصور ہے اور مذہب صبر، توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر ابھارتا ہے۔ خواہشات کو دَبانا، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا، فساد نہ پھیلانا نمائش سے گریز، اَنا کی سرکوبی، فلاح کے لیے اہم ہیں۔جبکہ آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے اصول اِن کے برعکس ہیں۔

''اسراف میں ترقی کا سنگِ بنیاد ہے۔خواہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔روپیہ گھر سے بازار تک آتا جاتا رہے، مسابقت وہ تیل ہے جو ترقی کی مشینی گراریوں میں پڑتا رہے تو مشین چلتی ہے۔'' (۳۵)

مغرب اور مشرق کا بنیادی فرق، ترقی اور فلاح کا فرق ہے۔

''فلاح میں انسان تعلق تلاش کرتا ہے۔

ترقی میں ذات پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے، تعلق راستے کا روڑہ بن سکتا ہے۔

فلاح میں انا راستے کا بند پھاٹک ہے۔

ترقی میں انا کی پھن اٹھائے بغیر کسی کو ڈسا نہیں جا سکتا۔فلاح میں اشیاء کی تلاش تعلق کی موت ہے۔

ترقی میں اشیاء لاؤ لشکر کی طرح کوئی دائیں سے حملہ آور ہوتی ہیں، کوئی بائیں سے۔اشیاء کو

میسرا اور میمنا کی طرح سجا کر انسان ترقی کے کارزار میں محفوظ محسوس کرتا ہے۔
فلاح خواہش کی پنیری کو مجاہدے، ریاضت صبر سے نکالتی ہے اور تعلق کے درخت کو تن آور کرتی ہے۔
ترقی خواہشات کے بغیر ایک قدم نہیں چلتی، ان ہی خواہشوں کے پیٹرول سے ترقی کی گاڑی چلتی ہے۔'' (۳۶)

ترقی، تعلق کی دشمن ہے کیونکہ تعلق وقت مانگتا ہے، جو ترقی کا خواہش مند ہے۔ وہ وقت صرف کام پر صَرف کرتا ہے۔ اسی لیے ترقی میں جدائی ہے، تعلقات کا خاتمہ ہے، اضراب، بے چینی اور تنہائی ہے۔

''میں چپ ہو گیا۔ بھلا ان کو ایسی باتوں کی کیا سمجھ تھی...... انہیں تعلق کی کیسے سمجھ آ سکتی تھی۔ انہیں میں کیسے بتا سکتا تھا کہ سانده سے ٹمپل روڈ...... اور ٹمپل روڈ سے ڈیفنس کی رومن Pillars والی کوٹھی تک میں نے کتنا کچھ گنوا دیا۔ میں بھی ان کو اپنے پانچ بہن بھائیوں کی صرف پرانی کہانیاں سنا سکتا تھا۔ آنول تو کبھی کی کٹ چکی تھی۔ کتنے رشتے وقت نہ ملنے کے باعث فل سٹاپ میں بدل گئے۔ اماں ابا تو خیر قبروں میں جا سوئے۔ ہم پانچوں بھی اپنی اپنی راہوں پر اپنے اپنے بچوں میں گم اپنے اپنے ساتھی کی انگل پکڑے زندگی کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ زندگی میں دولت کمانے اور صَرف کرنے کے علاوہ ہمارا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔ پہلے اس کے لیے تگ و دو کرنا پھر اس کو خرچ کرنے یا جوڑے جانے میں مگن رہنا۔'' (۳۷)

ترقی کی ہوا صرف مغربی معاشرے میں نہیں چل رہی بلکہ مشرقی معاشرہ بھی کسی حد تک اس کی لپیٹ میں آ چکا ہے۔ گو ابھی پوری طرح ترقی کے تقاضے پورے نہیں کر پایا لیکن تعلقات میں دراڑیں پڑنا شروع ہو چکی ہیں۔

''لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بہوئیں پوت لے کر چمپت ہو جاتیں۔ رشتہ دار امیر ہونے کے بعد مشورے مانگنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے، کھانے پکانے کی جو ترکیبیں درکار تھیں، ان کا نام بھی بڑھیا نے نہ سنا تھا۔ نہاری، سموسے، پلاؤ، شامی کباب اور ایسے ہی گھریلو پکوان آؤٹ آف فیشن ہو چکے تھے۔ ڈائٹنگ کرنے والی لڑکیاں اب مغربی کھانوں پر سوئچ آن کر چکی تھیں۔ چینی کھانا اِن تھا۔ کپڑوں کے لیے ماڈلز اور بوتیکوں کی طرف رجوع تھا۔

ڈیزائنر کپڑوں کی تلاش جاری رہتی تھی۔ اس لیے بڑی بوڑھی عورت گھٹنوں کے درد، ذیابیطس اور بلڈ پریشر کے چکروں میں کھوگئی تھی۔اب موئے ڈاکٹر ہی ان کی باتیں سنتے اور ان کومشورہ دیتے۔باقی خاندان دوست بچے ترقی کی ہوا اُڑا لے گئی تھی......''(۳۸)

مشرق میں بھی گو خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تک خاندانی نظام مغرب کی طرح پوری طرح بکھرا نہیں ہے۔مغرب میں خاندان مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے نظام مضبوط ہو رہا ہے کیونکہ فرد کا سہارا نظام ہی ہے جبکہ مشرق میں اب بھی فرد کا سہارا اس کا خاندان ہے،اسی لیے یہاں نظام کمزور ہے۔

''میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ مغرب بہتر ہے یا مشرق کی حالت قابلِ رشک۔ میں اپنی سوچ میں یہاں تک سوچ پایا ہوں کہ ازلی تضاد دونوں جگہ موجود ہے۔مغرب میں یہ تضاد فرد کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوا ہے اور مشرق میں اسی تضاد نے حکومتوں کے استحکام کی نفی کی ہے۔مغلیہ بادشاہت کے زوال کی داستان بھی دراصل خاندان کی فتح کی کہانی ہے۔مشرقی مما لک میں جمہوریت کے فیل ہو جانے کا راز بھی خاندان کی مضبوطی میں پنہاں ہے۔

مغرب اور مشرق اسی لیے کبھی نہیں مل سکتے کہ مشرق میں ابھی فلاح کی تلاش جاری ہے۔ فلاح کا سفر فرد سے شروع ہو کر بالآخر معاشرے میں ضم ہوتا ہے۔ترقی کی منزل معاشرے کی فراوانی، آسائش وزیبائش کے بغیر ممکن نہیں......اور تنہائی پر منتج ہوتی ہے۔دونوں طریقے مختلف ہیں۔ایک شمال سے جنوب کا سفر ہے، دوسرا مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے کی مسافت ہے۔کیا جانے نقطۂ اتصال کہاں ہے؟ کیا فلاح اور ترقی بیک وقت ممکن بھی ہے اور کس قدر اور کہاں تک اور کیونکر؟''(۳۹)

ترقی کرنے والوں کے لیے دوسروں سے تعلق اتنا اہم نہیں ہوتا جس قدر کہ اپنی ذات اہم اور ضروری ہوتی ہے۔ جب تک ترقی کا آرزومند اپنی ذات کو اور اپنی خواہش کو مقدم نہیں رکھتا، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔اسی لیے ترقی ہمیشہ تعلقات اور محبت کی قاتل ہوتی ہے۔اور تنہائی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

ہمایوں کی زندگی میں محبت کی پائیداری کی بجائے تعلق کی استواری نظر آتی ہے۔یہ تعلق اصغری اور اقبال کی صورت میں نظر آتا ہے۔اصغری، ہمایوں کی بیوی تھی، اور اقبال، آپیا کی دوست، جس کے ساتھ تعلق کو وہ ساری زندگی سمجھ نہ سکا۔

"تعلق چھتری ہوتی ہے ہمایوں صاحب......زندگی کی کڑی دھوپ میں اس کے پیچھے چھپ جایئے، اداسی ہو تو کھول کر سجا لیجیے۔ ہر طرف بانس کے درختوں کا احساس ہوگا، پہاڑوں کے کمرے میں چڑانے والا بندر آ جائے تو اس چھتری سے بھگا دیجیے، کبھی آپ نے غیر ضروری بندر کو کمرے سے بھگایا ہے...... پہاڑوں پر تو ہم عام طور پر اسی چھتری سے بندروں کو بھگایا کرتے تھے......کسی ایک سے تعلق پیدا ہو جائے تو وافر شرارتی بندروں کو بھگانا بھی تو پڑتا ہے ناں......" یہ بات بھی مجھ کو دن شاعر کے لیے نئی تھی......اقبال بڑی شاعرانہ سی گفتگو کر رہی تھی اور میری جانب ہولے ہولے بڑھتی آ رہی تھی، لیکن آپیا آ گئیں......

"چائنا مین کی مہربانی سے ہم دونوں تعلق کے مدار میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن اس کے مرکز تک پہنچ نہ پائے......"(۴۰)

اقبال اور ہمایوں کے درمیان جو روحانی تعلق قائم تھا، ہمایوں نہ تو کبھی اسے سمجھ سکا نہ ہی اسے کوئی نام دے سکا لیکن تعلق سے عہد ہمیشہ باقی رہا۔

"جس طرح اللہ کی بنیادی ننانوے صفات کو جان کر بھی اللہ کا اِدراک ناممکن ہے، کلی طور پر اس ذاتِ باری تعالیٰ کی ہمیں سمجھ آ جائے یہ خیال خام ہے، ایسے ہی اقبال سے تعلق کو میں سمجھ نہ پایا تھا۔ وہاں سب کچھ تھا اور کچھ بھی "Tangible" نہ تھا۔"(۴۱)

ہمایوں کے لیے تعلق کی عملی شکل اصغری تھی۔ دونوں نے تعلق کو ذمہ داری سے نبھایا۔

"تعلق کا عملی پہلو ذمہ داری ہے۔ جہاں بھی کوئی رشتہ ناطہ ہو وہاں ذمہ داری کا احساس خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے۔ سالوں پر محیط رابطے عام طور پر خیر سگالی اور دُکھ سکھ میں شریک ہونے کے عملی ثبوت ہوتے ہیں۔ دامے درمے سخنے مشکل کی گھڑی میں کام آنے کی روایت تعلق کا عملی پہلو بن کر......اصغری میرے ساتھ رہی......ہم دونوں اصلی معنوں میں شریکِ حیات رہے۔ شادی بیاہ کی رسومات، جنم مرن کے حادثات، گھریلو واقعات میں ہماری سانجھ رہی...... ورق ورق ہم نے ایک دوسرے کو ذمے داری کی عینک سے

پڑھا۔''(۴۲)

جہاں تک اقبال کا تعلق تھا، اُس کے متعلق ہمایوں کا کہنا ہے:

''اقبال مکمل طور پر میری جنت بھی نہیں تھی۔ یہاں بھی میرا تعلق ادھورا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کچھ Share نہیں کیا۔ میری کسی مصیبت میں وہ میرے ساتھ نہ تھی۔ خیال کی حد تک کبھی کبھی میں اس کے گرد کہانیاں بُن لیتا...... لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا...... اور پھر بھی...... اور اسی طرح...... اور کیا کہیں کی حالت میں وہ میرے ساتھ رہی۔ محبت، شفقت، ہمدردی، عشق تر و تازہ ہو تو غم نہیں رہتا۔ لیکن کبھی کبھی اگر سارے رشتے ٹوٹ بھی جائیں اور آئینہ دل میں کوئی شیشہ باقی نہ رہے تو بھی بسا اوقات غم کا پہاڑ اسی تعلق کے بلڈوزر سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔''(۴۳)

اقبال کے ساتھ ہمایوں کا تعلق کسی رشتے کی صورت تو اختیار نہ کر سکا لیکن اس کے دل و دماغ کو اس تعلق کے خیال نے ہمیشہ آسودگی بخشی۔ کسی رشتے کے نہ ہونے کے باوجود یہ اس کے غموں پر پھاہا رکھتا رہا۔ ہمایوں فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر توقع سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس تعلق کو نہ تو توقعات سے بندھنے کی ضرورت تھی نہ اسے عہدِ وفا کا اعادہ چاہیے تھا۔ ناول کے آخر میں اقبال سامنے آتی ہے۔ اس کی ایک ایب نارمل بیٹی ہے جس کے علاج کے لیے وہ امریکہ میں موجود ہے۔ اُردو مرکز کی جانب سے ہمایوں کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا گیا تھا جس کا میزبان نثار احمد صدیقی، اقبال کا شوہر تھا اور اقبال کے کہنے پر ہمایوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ نثار ایکٹروں کی طرح حسین، ڈیزائنر کپڑے پہننے والے ماڈل کی طرح خوش پوش مڈل ایج آدمی تھا۔ اقبال کو زندگی میں وہ سب کچھ ملا جس کی کوئی عورت آرزو کر سکتی ہے۔ لیکن بیٹی کی بیماری نے اقبال کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہمایوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ امریکہ چھوڑ کر واپس چلا جائے۔

''اگر میں آپ سے کہوں کہ پاکستان لوٹ جایئے تو؟......''

''لیکن کیوں اقبال! میرا تو وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تو اصغری بھی لوٹ گئی اپنے خالق کے پاس......''

''پھر بھی لوٹ جایئے......''

''کیوں...... لیکن کیوں لوٹ جاؤں...... وہاں وطن میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔''

''میں اب کسی امید کو اپنے اندر جنم دے کر بھسم نہیں ہونا چاہتی۔ اتنی مدت میں نے ہر صبح مونا کے لیے امید کا دِیا جلایا اور رات کو اسے بجھا کر سوئی۔ میں موت سے پہلے مر چکی ہوں ہمایوں! اب جو بھی مجھے پھونک مار کر زندہ کرے گا...... میرا دشمن ہوگا...... میں سلیپنگ بیوٹی نہیں ہوں۔ مجھے کوئی پرنس چارمنگ درکار نہیں۔''

''کیا نثار......؟ نثار تمہیں زندگی کی طرف نہیں کھینچتے......''

''جس شخص میں اتنی ساری خوبیاں ہوں، جو سارا وقت اپنی پرستش میں لگا ہو...... لوگ اس کی پوجا کرتے ہوں، اس کے پاس دوسروں کے لیے وقت کہاں؟ کامیاب انسان دوسروں کو بھی کامیاب ہی سمجھتا ہے۔ وہ ناکامی کو سمجھ نہیں سکتا۔ مایوسی کی زبان نہیں جانتا۔ میرا جھگڑا نثار سے نہیں، میں تو روزِ ازل سے بی بی حوا کی طرح آدم کی روح کی متلاشی ہوں...... میرا تو حساب کتاب ہی الٹا ہے۔ میں تو وہی چیز مانگ رہی ہوں جو اللہ کی اپنی امانت ہے۔ پھر...... ایسی صورت میں مجھے زندگی سے کیا مل سکتا ہے...... نہ نثار سے نہ کسی اور سے۔''

''میرے اندر ایک صحرا ہے ہمایوں! مجھے محبت نہیں چاہیے، شاید میں کسی کا خدا بننا چاہتی ہوں۔ ایب نارمل مونا کے ساتھ رہ کر میں نارمل نہیں رہی۔ خدا کے لیے چلے جاؤ...... اگر تم نے امریکہ نہ چھوڑا تو میں کسی اور جگہ چلی جاؤں گی...... اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی۔''

''ایک بار وجہ بتا دو صاف صاف الفاظ میں...... میں جاننا چاہتا ہوں آپیا کی خاطر۔''

''میں آپ کو بتاؤں یہاں آنے سے پہلے مونا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں تلملایا کرتی تھی۔ میں نے مونا کے بڑے علاج کیے، ایلو پیتھک، بائیوکیمیک، حکیمی علاج، ہومیو پیتھک۔ میں...... مونا کو اپنی Retarted بچی کو لے کر میں کہاں کہاں نہ گئی۔ پھر جب علاج سے مایوس ہونے لگی تو میں نے تعویذ گنڈے، صدقات، وظیفے، پیر فقیر پکڑ لیے۔ درگاہوں پر حاضریاں دیں۔ میں معجزے کے انتظار میں رہتی اور وہ ہو ہی نہ چکتا۔ میں پاؤں جلی ایک روز ایک درگاہ پر جاتی، دوسرے دن کسی اور ڈیرے پر...... میرے آنسو نہ رکتے تھے......

ایک بابا جی نے میری بے قراری دیکھ کر کہا،''بیٹا اب تلاش بند کر دے......علاج سے منہ موڑ لے، راضی برضا ہو جا......'' میں نے چیخ کر کہا...... کیوں؟ کیوں بابا جی! میں تو آخری سانس تک مونا کے لیے جدوجہد کروں گی'' ......''میں جو کہتا ہوں تجویز چھوڑ دے بی بی...... بس تجویز چھوڑ دے......'' بابا جی بولے، میں چلاّتی رہی......'' کیوں تجویز نہ کروں، کیوں، کیوں کیوں؟''

''ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں بیٹا...... پہلے مان لو...... پھر اللہ نے چاہا تو جان بھی جاؤ گی۔'' بابا جی بولے۔

اقبال چپ ہو گئی۔

یہ چپ کا وقفہ ہم دونوں کے لیے بھاری تھا۔

''آپ پلیز جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں...... میں اب کسی امید کے حوالے نہیں ہونا چاہتی۔ پلیز مان جائیے۔ مان جائیے پلیز۔''

میں خاموشی سے اُٹھ گیا۔ اقبال نے آہستہ سے خدا حافظ کیا۔ میں ارجمند تک پہنچا اور اسے بتایا کہ میں باہر کار میں اس کا انتظار کروں گا، نثار صاحب سے معافی مانگ لینا۔''

''آپ کی طبیعت خراب ہے تو واپس چلتے ہیں انکل۔'' بلال نے کہا۔

وہ طبعاً بھی ڈاکٹر ہے۔ کسی کو علیل دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے...... میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' مان لینے کے بعد مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔ (۴۴)

ہمایوں نے پاکستان واپسی کا پلان بنا لیا، ارجمند اس تجویز پر بہت جُز بُز ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ہمایوں انتہائی خودغرض باپ ہے۔ لیکن وہ سوچتا رہا کہ انتظار فلاح کے راستے کا بڑا قیمتی ٹکٹ ہے۔ جو لوگ صحراؤں کا سفر کرتے ہیں لیکن مان کر سر جھکا کر چلتے ہیں، موت کی راہ تکتے ہیں لیکن امید کے ساتھ۔

''وہ منتظرِ کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں نہ تاویلوں میں۔ جنہیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ حکم ماننے کے لیے کسی قسم کا لالچ

درکار ہوتا ہے۔ نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ کا عذاب......ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں......فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔'' (۴۵)

''اقبال کے ساتھ کسی قسم کا مرئی رشتہ نہ تھا، لیکن اس کی بات مان لینے کے بعد یہاں وہاں کچھ باقی نہ رہا تھا......میں کسی کو کیا بتاتا کہ بابا آدم جب اماں حوا کی بات مان چکے تو ان کے پاس جلاوطنی کے علاوہ کوئی چوائس نہ تھی!'' (۴۶)

بانو قدسیہ کہتی ہیں، مغربی معاشرے میں اختیار کی قدر پروان چڑھتی ہے جبکہ مشرق کی روحانیت اطاعت کو پرورش کرتی ہے۔ ترقی کے لیے خوداعتماد اور بااختیار ہونا بہت ضروری ہے۔ دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کے مواقع کم ہوں تو احساسِ کمتری بڑھنے لگتا ہے۔ مذہب، قانون، ماں باپ، استاد، رسم و رواج کسی قسم کی بھی اطاعت ہو تو انسان تابع کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے۔ اُسے فیصلوں کے لیے اپنے اندر کے بجائے باہر کی آواز حق پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ ماننے والے پر سے فیصلے کی ذمہ داری اُٹھ جاتی ہے۔ اس بوجھ کے اٹھتے ہی وہ صاحبِ اختیار بھی نہیں رہتا اور اسی لیے اپنے پر بھروسہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ ترقی کے لیے اپنے فیصلے پر اعتماد کرنا انتہائی اہم ہے۔ اسی خوداعتمادی کے سہارے مغربی معاشرے میں ترقی کا پہیہ جام نہیں ہوتا۔ مصنّفہ کہتی ہیں، مشرق میں صبر کے ساتھ اطاعت کے راستے پر چلا جاتا ہے۔ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔

''میں نے سوچا کہ ترقی کرنے والے یہ لوگ پہلے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مانتے ہیں۔ جو باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں وہ انہیں شیلف کر دیتے ہیں اور وہ ریگستانی لوگ پہاڑوں کی گپھاؤں میں سمادھی لگانے والے لوگ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں، پھر بیکار تجسّس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔ راستہ طے کرنا ہی ان کی منزل بن جاتی ہے۔ خوف و حزن ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ وہ تبدیلی سے پہلے اپنے خیال میں تبدیلی سے خوفزدہ نہیں رہتے......بس صبر ہی ان کی ڈھال ہے۔'' (۴۷)

تارکِ وطن، جس نے مادی ترقی کے حصول کی خاطر امریکہ میں قدم رکھا تھا جب اپنا سب کچھ اس کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے تو پھر احساسِ زیاں اسے کچوکے لگانے لگتا ہے۔ اپنے لباس اور زبان سے بیوفائی اسے اندر ہی اندر پژمردہ رکھتی ہے۔

اقلیت کی اکثریت میں ضَم ہونے کی خوشی اور خواہش اور اپنی شناخت قائم رکھنے اور قائم کرنے کی آرزو مسلسل رسّہ کشی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسے بی کلاس سٹیزن کے ہیومن رائٹس تو ملتے ہیں لیکن مساوات نہیں ملتی۔ ایسے میں اقلیت کبھی کبھی اقلیتی گروہوں کی صورت میں بٹ جاتی ہے۔ ایسے گروہ اپنے مذہب اور کلچر کی پاسبانی کے لیے اٹھتے ہیں۔

جب اقلیتی گروہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اکثریت سے کٹ کر عزتِ نفس کی خاطر مدافعت پر آمادہ ہوجاتا ہے تو یکدم اکثریت اس قدر خائف ہو جاتی ہے کہ پھر خاص طور پر مسلمانوں کو فنڈامنٹلسٹ اور دہشت گرد کی مہذب گالی دی جاتی ہے۔

''خبر آئی کہ اس دن مصروف رہتے ہیں۔ جمعہ کی نماز وہ اسلامک سنٹر میں ادا کرتا ہے۔ دن پر دن اسلام کی طرف راغب ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بھی سنا کہ شاہدہ کو اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں ایک دن بیٹھے بٹھائے جہانگیر حجاب پہننے پر اصرار نہ کر بیٹھے۔ امریکہ جیسے ملک میں اسے ہر قسم کی آزادی تھی، روپے پیسے کی کمی نہ تھی...... لیکن یہ فکر اسے اندر ہی اندر پریشان رکھتی۔ شاہدہ کو اسلام کی ساری باتیں پسند تھیں لیکن وہ تعدادِ ازدواج اور حجاب سے اس قدر خوفزدہ تھی کہ اسے جہانگیر بھی بنیاد پرست نظر آتا۔'' (۴۸)

اقلیتی گروہ اپنے کلچر کی بازیافت کے لیے نکلتا ہے تو عورت کے سر پر حجاب آجاتا ہے۔ مرد مسجدوں میں نماز پڑھنے لگتے ہیں۔ گھروں میں میلاد، مجلسیں، روزہ کھلائی کی محفلیں، آمین اور شادی کی رسومات وطن کی طرف لوٹ جانے کا خواب ہوتی ہیں۔ ڈرگز، جنسی بے راہروی، آزادی سے حاصل کردہ جرائم سے خوفزدہ ہو کر مسلمان تارکین ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ انہیں فنڈامنٹلسٹ کہتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کو نہ تو پردیس میں عزت ملتی ہے اور نہ اپنوں میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب اقلیتی گروہ روٹھے بچوں کی طرح احتجاج پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اقلیت کے لیے مستعار مور پنکھوں کے ساتھ اپنی عزتِ نفس برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا۔

''اسے اپنے خام خیالوں کی دنیا سے نکل کر شعوری اور لاشعوری طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ جو راستہ اس نے ترقی کی خاطر چنا، اس میں کیا کچھ کھویا اور کس قدر پایا...... اسے آہستہ آہستہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب کے احکامات ہر صورت میں ہیومن رائٹرز سے بہتر تھے۔ دینِ الٰہی ہزار بار Liberal ہو اور وہ مہاراج ادھیراج اکبر کے سنگھاسن کو راجپوت اور مرہٹہ طاقت

سے بچانے کے لیے اعلیٰ نسخہ ہو، اس نسخے پر کوئی دین دار تا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ترقی کے لیے اپنی شناخت چھوڑی نہیں جا سکتی۔ مذہب کا پرچم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اب ایک بار پھر اقلیت رُجعت کا سفر اختیار کرتی ہے...... سفر یہاں بھی لباس، زبان، رہن سہن، کلچر، وطنیت سے ہی شروع ہوتا ہے۔ قائداعظم فرانس کے سِلے سوٹ اتار کر اَچکن، شلوار اور جناح کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ افریقہ کا خوش پوش گاندھی دھوتی اور کھادی کی چادر کو اپنی شناخت بنا لیتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں ایران کی عورتیں چادر، عرب والیاں عبائیں اور پاکستانی خواتین کے سروں پر دوپٹے آ جاتے ہیں۔'' (۴۹)

ہمایوں نے جو عرصہ امریکہ میں گزارا، وہ تقابلی سوچوں میں بسر ہوا۔ وہ مغرب اور مشرق کے تضاد کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ ترقی اور فلاح کے تضاد کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ انسان ترقی کی خواہش میں اپنا سکون، اطمینانِ قلب اور خوشی سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہے۔ اس کی بیٹی ارجمند نے ترقی کی خاطر، اپنی آزادی اور خودمختاری کے شوق میں اپنی زندگی کو عذاب میں ڈال رکھا ہے۔ وہ مشرق کی تمام اقدار و روایات کو بھلا کر ترقی کی دوڑ میں شامل ہو چکی ہے، لیکن جو کچھ اسے حاصل ہوا وہ اس سے بھی مطمئن نہیں ہے۔

''ارجمند ایک یہودی امریکن ڈاکٹر کی Receptionist ہے۔ جو بظاہر لبرل آدمی ہے، لیکن صبح روانگی کے وقت ارجمند کے چہرے پر جو ملال ہوتا ہے اس کا کوئی نام نہیں...... جو صرف اسی وقت چہرے پر آتا ہے جب کوئی شخص آپ کو نہ سمجھے اور آپ کو کمتر جانے۔ ارجمند بروقت پہنچنا چاہتی ہے لیکن عموماً بچے اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ گھر سے نکلتے ہی آوازوں میں بدل جاتی ہے اور ارجمند نہیں رہتی۔ وہ یہودی امریکی ڈاکٹر کے خوف سے ناشتہ نہیں کھاتی، ہاتھ میں سینڈوچ رکھتی ہے اور ڈرائیو کرتے ہوئے کھاتی جاتی ہے۔ راستے میں ہی بال برش کرتی ہے اور کار کے آئینے میں لپ سٹک لگا لیتی ہے۔'' (۵۰)

''اگر تم دو منٹ میں نہیں آئے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی......''

''......This is hell''

یہ آوازیں بچوں کے لوڈ ہونے تک آتی رہتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے اندر پروگرام ہو

جاتی ہیں۔ایک روز میں نے ڈرتے ڈرتے ارجمند سے کہا......

''تم اس قدر پریشان جو ہوتی ہوتو نوکری چھوڑ دوناں......''

''ہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔یہی نوکری تو میری اپنی ہے...... باقی میرے پاس اپنا کیا ہے؟انسان کے پاس اپنا کچھ ہونا چاہیے،ابا چاہے ہتھوڑی کا دستہ ہی کیوں نہ ہو......''

''تو کیا تمہیں بلال کافی رقم نہیں دیتا......''

''پیسے تو دیتے ہیں،لیکن یہ ہزار میرے اپنے ہیں،میری اپنی کمائی ہے،ان دس انگلیوں کی، مجھے ان پیسوں سے آزادی کا احساس ہوتا ہے،انہیں میں جہاں چاہوں خرچوں......''

''ہر وہ آدمی جو Male Chauvanism پر یقین رکھتا ہے ایسے ہی سمجھتا ہے ابو کہ مرد مظلوم ہے اور عورت اب آپے سے باہر ہو رہی ہے...... یہ عورت سے بے انصافی ہے، سراسر بے انصافی۔عورت سو جوتیاں بھی کھا رہی ہے اور سو پیاز بھی۔''

''لیکن اپنی مرضی سے اپنی چوائس سے۔''میں عرض کرتا ہوں۔

''آپ کی سوچ ٹیڑھی ہے ابو......پلیز سیدھا سوچنا شروع کریں......وقت بدل چکے ہیں۔ اب پتھر اور دھات کا زمانہ نہیں۔''

''یقیناً یہ میڈیا، رفتار اور اشیاء کا زمانہ ہے......لیکن اندر سے آدمی جدید نہیں ہو سکا۔بدقسمتی سے وہ گوشت پوست کا بنا ہے......اس کے اندر ایک روح بھی ہے جو اتنی پرانی ہے......اتنی پرانی ہے جتنا انسان خود......اس روح کے سوالات بھی پرانے ہیں اور جواب بھی وہی چلے آتے ہیں۔''

''ابو یہ بحث اس زمانے میں لاگو نہیں رہی......خدا کے لیے اپنی سوچ بدلیں، پرانی جہالت چھوڑ دیں۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم خوش ہو ارجمند؟''میں نے سوال کیا۔

وہ چند لمحے سوچتی رہی۔پھر بولی......''پتہ نہیں؟''

''کیوں؟''

''ٹھیک سے مجھے بھی جواب معلوم نہیں۔'' (۵۱)

جدید ترقی یافتہ معاشرے کی عورت برابری کی دعویدار ہے۔اس نے اپنی آزادی اور خود مختاری کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ وہ اندر سے نا آسودہ اور تنہا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ پرانی اقدار کو فرسودہ کہہ کر انہیں رَد کرتی چلی جاتی ہے لیکن اسے خوشی اور اطمینان کہیں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

''ہندو عورت نے اپنے ماتھے کی بندی، مانگ کا سیندور، اپنا ساڑھی بلاؤز چھوڑ دیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی نہایت بوسیدہ سی جینز، جوگرز اور بغیر آستینوں کی بلاؤز میں گیراج کی صفائیاں کرتی، گروسریز اٹھاتی، چھوٹے بچے کو پش چیئر میں لاتی لے جاتی نظر آتی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تھکن ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرنے والے چہروں کا محاصرہ کر لیا کرتی ہے۔ وہ سڑک پر آنے جانے والوں کو وِش کرنے میں پہل کرتی ہے اور گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ کہتے ہوئے نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ لیتی ہے۔ اس کے چہرے کی تھکاوٹ پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کی بدلی چھا جاتی ہے...... وہ پردیس میں اپنا Image درست رکھنا چاہتی ہے...... وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی جلد، مذہب اور وطنیت کے فرق کو بھلا کر اسے اکثریت میں ضَم کر لیں۔'' (۵۲)

تارکینِ وطن ہمیشہ غیر ممالک میں بی کلاس سٹیزن کی زندگی بسر کرتے ہیں جنہیں ہیومن رائٹس تو ملتے ہیں لیکن مساوات اور محبت نہیں ملتی۔ اکثریت میں ضَم ہونے کی جب ہر کوشش ناکام ہوتی ہے تو پھر:

''اسے اپنے خام خیالوں کی دنیا سے نکل کر شعوری اور لاشعوری سطح پر سوچنا پڑتا ہے کہ جو راستہ اس نے ترقی کی خاطر چنا، اس میں کیا کچھ کھویا اور کس قدر پایا۔فلاح کا راستہ جو ترقی ہی کی شاہراہ ہے، بہر طور کچھ اور تھا۔ اس کو چھوڑ کر اس کی زندگی کونسی سیڑھیاں اترتی چلی گئی، اسے آہستہ آہستہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب کے احکامات ہر صورت میں ہیومن رائٹس سے بہتر تھے۔'' (۵۳)

تارکینِ وطن یا اقلیت پر جب اپنے مذہب، کلچر اور اقدار و روایات کو چھوڑ دینے کا پچھتاوا بڑھنے لگتا ہے تو پھر مراجعت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سفر اپنے مذہب اور کلچر کی طرف لوٹ جانے کا سفر ہے۔ لیکن اس وقت خاص طور پر

مسلمان پر فنڈامنٹلسٹ اور دہشت گرد ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔اس پریشان کن صورتِ حال میں اپنی شناخت کے ساتھ رہنااور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

> ''میں قندھار جا رہا ہوں بابا جان......اس قندھار میں رہوں گا جہاں ڈیزی کٹر اور کلسٹر بموں نے میرا بوڑھا دادا......میری برقعے والی بہنیں اور داڑھی والے باپ کو ختم کر دیا...... جب تک میں کسی مذہب، کسی وطن، کسی خاندان کا درد سینے میں نہ بسا سکا، میں یہ نہ جان سکوں گا کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح اپنے وطن، اپنے کلچر، اپنے خاندان سے محبت کرتے ہیں......'' (۵۴)

ترقی کی خاطر کی گئی ہجرت نے انسان کو جدائی کے دکھ اور تنہائی سے دوچار کیا۔ نئے وطن میں جا کر وہ اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ وہ جس آزادی اور خودمختاری کے خواب دیکھتا ہوا امریکہ کی طرف سدھارا تھا، وہ خام خیالی ثابت ہوئے۔اس کی آزادی اور خودمختاری نے اسے ایک اور طرح کی غلامی عطا کر دی، وہ اگر آزاد ہوا بھی تو محبت، رشتوں اور تعلقات سے، میاں بیوی کا رشتہ آزادی اور خودمختاری کی خواہش میں طلاق کی نذر ہو گیا۔ ماں باپ کا بچوں کے ساتھ محبت کا تعلق مصروفیت اور کام کی بھینٹ چڑھ گیا۔جس سکون، اطمینانِ قلب اور خوشی کی تلاش میں وہ اپنا ملک چھوڑ کر نکلا تھا وہ اسے یہاں حاصل نہ ہو سکی۔

مادی ترقی کے حصول کی خاطر کی گئی ہجرت کے ساتھ ساتھ ناول میں ذہنی و روحانی ارتقاء کا سبب بننے والی ہجرت کی داستان بھی نظر آتی ہے۔

بدھ فکری ارتقاء اور روحانیت کا استعارہ ہے۔ کپل وستو کے راجہ شدودھن نے اپنے بیٹے سدھارتھ کو دُکھوں کی زندگی سے بچانے کے لیے بڑھاپا، بیماری اور موت کے مناظر کو محل کے اندر آنے سے روک دیا۔کسی مرجھائے ہوئے پھول کو ٹہنی پر رہنے کی اجازت نہ تھی، کانٹوں کو شاخوں سے اتار دیا جاتا لیکن زندگی کا منفی پہلو جب اس کے سامنے آیا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔جس منفی سوچ کو راجہ نے محل سے نکالا تھا وہی سوچ سدھارتھ کے تخیل میں جا بسی۔شدودھن کی خودساختہ جنت سے بدھا کا دل اچاٹ ہو گیا۔حضرت آدمؑ کی کہانی ایک بار پھر دہرائی گئی اور ایک رات سدھارتھ انتیس برس کی عمر میں رانی یشودھرا اور اپنے بیٹے کے پہلو سے نکلا اور جنت کی خوشیوں سے دبے پاؤں غم سے بوجھل زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

بدھا جاننا چاہتا تھا کہ زندگی کیا ہے؟ دکھ کو کس طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے، دکھ کا حاصل کیا ہے؟ اور دکھ

انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جب یشودھرا اور بچے کو چھوڑ کر سدھارتھ نکلا تو اس نے وہ تمام غم راجہ شدودھن کے محل میں ہی چھوڑ دیے جن میں عام آدمی سلگتا رہتا ہے۔ اس ہجرت سے بدھا نے اپنے غم خود ایجاد کیے۔ ان غموں کو نروان کے راستے ختم کرنے کا ارادہ بھی اس کا اپنا تھا۔ اس نے اپنی آزادی کو اس حد تک قبول کر لیا تھا کہ اس نے نہ خدا کو پکارا نہ کسی انسان کو۔

''وہ پہلا وجودی تھا۔ اپنی Free Will پر وہ اس حد تک قابض ہو چکا تھا کہ اس نے اپنی تربیت کو بھی تعلیم میں ڈوب جانے کے بجائے تنہائی کا سبق دیا۔ سدھارتھ کا فیصلہ تھا کہ اگر آپ مکمل طور پر آزاد ہیں تو پھر اپنے نروان کے لیے کوشش بھی نہ کیجیے، دنیاوی ترقی مکمل فلاح کو ختم کر دے گی......''(۵۵)

چودہ سال کی کڑی ریاضتوں کے بعد بدھا پر یہ عرفان ہوا کہ زندگی کی راحت فقط درمیانی راستہ اختیار کرنے میں ہے۔ منفی اور مثبت کے درمیان میں دکھ اور خوشی کے وسط میں۔ بدھا نے واپسی کا سفر اختیار کیا تو ایک نئے مسلک کی بنیاد ڈالی۔ اس کا ذہنی و روحانی ارتقاء ایک نئی طرزِ فکر اور نئے طرزِ احساس کو جنم دینے کا باعث ہوا لیکن کیا اس کا فلسفہ مطلق سچ اور حق پر مبنی تھا؟ کیا انسان نے اس کے بعد تلاش کا سفر ختم کر دیا؟ ایسا نہیں ہوا۔ اس روحانی ارتقاء نے جس فلسفۂ فکر کو جنم دیا اُس کے آگے کتنے ہی سوالیہ نشان موجود ہیں۔ بدھا نے ہجرت کے راستے پر چلتے ہوئے چودہ سال تک سخت ذہنی و جسمانی مشقت اٹھائی۔ ہجرت کے اس سفر میں پیچھے رہ جانے والوں نے دکھ کے ساتھ صرف انتظار کی اذیت کو برداشت کیا۔

''اس کے باپ شدودھن پر محل میں کیا گزری؟ یہ دوسری کہانی ہے...... یشودھرا اور بچے نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کرنے والے کا انتظار کیسے کیا؟ یہ تیسری کہانی ہے۔ جس پر لوگوں کی توجہ اس لیے نہیں جا سکی کہ جو لوگ انسانیت کے لیے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ ایسے ہاتھیوں کے پیروں تلے کچھ بونے، ادنیٰ رسومات، ناکارہ مسلک پس بھی جاتے ہیں، لیکن پھاوڑا جب دھرتی کا کلیجہ پھاڑ کر نئی فصل کاشت کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو اسے علم نہیں ہوتا کہ زیرِ زمین میں بسنے والے کیڑے مکوڑے، جڑی بوٹیاں، گھاس پھوس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہی ارتقاء لانے والے بڑے آدمی کی قسمت اور چھوٹی مخلوق کی قربانی ہے۔ جس کے تحت بنی نوع انسان آگے سے آگے، آگے سے اور آگے ارتقاء کرتا چلا

جاتا ہے۔''(۵۶)

جہانگیر ایسا ہی ایک بدھا تھا جسے اپنے باپ ہمایوں سے یہ گلہ تھا کہ اس کی پرورش ادھوری ہے۔ ایسی ہی ادھوری پرورش کا ذمہ دار راجہ شدودھن بھی تھا۔

''کپل وستو کے محل میں مہارانی مایا نے جب گوتم کو جنم دیا تو راجہ شدودھن کو علم نہ تھا کہ بیٹے کی پرورش کیسے کی جاتی ہے؟ راجہ شا کیا قبیلہ کا سردار تھا۔ اسے حکومت، سیاست اور ظلم کا علم تو ضرور تھا لیکن پرورش، مہربانی اور آنسوؤں کی تاثیر سے وہ نابلد تھا۔''

مرنے سے پہلے مہارانی مایا نے شدودھن کی گود میں سدھارتھ کو دے کر کہا...... ''راجہ جی اس کا منہ تو دیکھئے بھلا...... یہ چت چور تو بڑے گہرے دھیان میں لین ہے......اس کا من کیسے لگے گا اس سنسار میں۔''

''راجہ کی ممتا زمحل جاتے جاتے جملہ ادھورا چھوڑ گئی...... پر راجہ راج پاٹھ کے چلن بھول گیا......اب اسے ایک ہی کارگزاری سے غرض تھی کہ بہت سوچنے اور دھیان کرنے والے چہرے پر اُداسی کی چھاپ نہ ہو......گوتم کشٹ نہ جھیلے، نہ اندر نہ باہر......گیان دھیان کی چنتا کسی طرح گوتم کے چہرے کی پرچھائی نہ بنے۔''(۵۷)

ہمایوں اور اصغری نے جہانگیر کی تربیت میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مشرقی اقدار و روایات کے ماحول میں اس کی پرورش ہوئی۔ اسے ڈاکٹر بنانے میں اصغری اور ہمایوں نے سخت محنت کی لیکن جہانگیر کے خیال میں وہ خود اعتماد اور بااختیار نہ بن سکا۔ اسے آزادی درکار تھی۔ ویسی ہی آزادی جس نے سدھارتھ کو اپنی جنت چھوڑنے پر مجبور کیا۔

''بیچاری امی نے میری تربیت ٹھیک نہیں کی۔ انہوں نے مجھے اتنا ٹوکا، اس قدر راہیں بند کیں میری کہ اب میں آج کی ماڈرن مسابقت بھری زندگی کے قابل نہیں رہا......کوئی رات باہر نہ گزارنے دی......اب یہ حال ہے کہ کسی نئے ماحول میں جاؤں تو ہاتھوں میں پسینے آ جاتے ہیں۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں، کوئی کام کروں لگتا ہے غلط کر رہا ہوں......''

''لیکن سی ایس ایس کر کے کیا ہوگا...... وہاں بھی تو اتنی تنخواہ ہوگی جہانگیر......ڈاکٹر اور سی ایس ایس افسر کا گریڈ ایک ہوتا ہے......'' جہانگیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں

مزید نہ بول سکا، میرے اندر ڈاٹ لگ گیا......

''یہ آپ کی سوچ تھی ابو جس نے مجھے مروا دیا۔ یہی آپ کی قناعت پسندی تھی جس نے مجھ سے میری ترقی کے خواب چھین لیے......آپ اور امی تو اتنے قابض تھے میرے جسم پر...... میری روح پر......کہ میں سانس بھی آپ کو خوش کرنے کے لیے لیتا تھا......آپ کا بس چلتا تو مجھے روئی میں لپیٹ کر پالتے......فیڈر سے اب تک......دودھ پلاتے......خود نہلاتے...... منہ میں چوسنی ڈالے اپنے سامنے رکھتے......ابو...... یہ محبت نہیں ہے جو آپ نے مجھ سے کی...... پر قینچ پرندہ...... ہوں میں زخمی پرندہ......آپ نے شہباز کے ناخن کاٹ دیے ہیں اور اب اس سے شکار کرنے کی امید رکھتے ہیں......ایسے نہیں چلے گا......ایسے چل نہیں سکتا......میں دیوانہ ہو جاؤں گا......''

''شروع شروع بازار میں دوکان چلانا کوئی برائی نہیں جہانگیر......''

''یہی تو آپ کی مشکل ہے ابو......نہ آپ Status کو سمجھتے ہیں نہ دولت کو نہ ماڈرن لائف کو......آپ ابھی ایک اور عہد میں جی رہے ہیں۔ جہاں دولت ہوتی ہے لیکن معیارِ زندگی نہیں ہوتا......سچ بتائیے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے مجھے یوں لڑکیوں کی طرح پالا؟ کیا آپ نے مجھے شریف بناتے بناتے خصی نہیں کر دیا؟......مجھ سے میری مردانگی چھین لی......؟ میں مرد ہوں؟ مردوں کی یہ ہمت ہوتی ہے۔ مرد ایسے بزدل ہوتے ہیں اپنی بیوی سے ڈرنے والے......''

''میں بھی ساری عمر دوکان سے گھر اور گھر سے دفتر جاتا رہا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ کانٹوں سے محفوظ رہنے، اندر اور باہر کے شر سے پناہ حاصل کرنے کا مجھے اور کوئی طریقہ بھی نہ آتا تھا۔ اسی گر کے ساتھ میں نے جہانگیر کی پرورش کی۔ یہی وہ آخری جنگ تھی جو سعادت مند جہانگیر نے مجھ سے لڑی اور عین اس لڑائی سے تیسری رات جب میں اور اصغری داتا دربار گئے ہوئے تھے، وہ اپنے بیٹے ہارون اور شاہدہ کو لے کر اپنے سسرال چلا گیا اور سی ایس ایس کی تیاری کرنے لگا......''(۵۸)

جہانگیر ذہنی سفر پر نکلا تو پہلے اس سے ماں باپ اور ان کا گھر چھٹا۔ وہ ترقی کی خاطر سسرال میں جا کر رہنے لگا اور پھر وہاں سے امریکہ کی طرف ہجرت کر گیا۔

''بہن کی نقل میں یا اپنی آزادی کی تلاش میں جہانگیر امریکہ چلا گیا۔ اسے بھی شاید کسی بودھی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے بیٹھ کر وہ راحت اور غم دونوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا......''(۵۹)

جہانگیر کے امریکہ جانے کے بعد اُس کی جدائی کا دُکھ سہتے سہتے اصغری اس جہان سے چلی گئی اور ہمایوں تنہا رہ گیا۔ نئے زمانے کے سدھارتھ کے چلے جانے کے بعد آج کے راجہ شدودھن کی زندگی جدائی کے کرب اور تنہائی کی اذیت میں گزرنے لگی۔

''اب نہ مجھے نام یاد رہتے، نہ لوگوں کے چہرے دیکھ کر کوئی شناخت ابھرتی۔ پل بھر پہلے کا واقعہ ذہن سے محو ہو جاتا۔ صرف پرانی یادیں گھیرا ڈالے بیٹھی رہتیں...... جب میں جہانگیر کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس لوٹا تو مجھے پتہ چلا کہ اتنے بڑے شہر کی اداسی کیا ہوتی ہے اور رونق کے دل میں تنہائی کا چٹاخ کیسے بڑھتا چلا جاتا ہے......''(۶۰)

اچانک ایک دن جہانگیر امریکہ سے وارد ہو گیا اور ہمایوں کو ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ وہاں باپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ ہمایوں جانے سے انکار کر دیتا ہے۔

''بات یہ ہے کہ نروان حاصل کرنے کے لیے تمہیں اکیلے ہی نکلنا ہوگا...... میں نے جہاں تک ممکن تھا، تمہیں راحت میں پالا...... کوشش کی کہ تمہیں کوئی غم کوئی محرومی کوئی تکلیف نہ ہو لیکن......''

''میں آپ کو یہاں چھوڑ کر وہاں کیسے خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہوں...... میں اتنا Stress کیسے برداشت کروں گا ابا جی......''

''میں سمجھ گیا ہوں، ہر انسان کے لیے گرم سرد کٹھالیوں میں سے گزرنا ضروری ہے۔ میں تم کو صرف راحت کا سبق دینا چاہتا تھا، لیکن غم بھی تو انسان کا استادِ مکرم ہے۔ ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہو سکتی، اوپر اٹھ نہیں سکتی۔ تم تو ماڈرن آدمی ہو جانتے ہو، جب تک

راکٹ کے نیچے دہکتی آگ نہیں جلتی تب تک اس کا خلائی سفر شروع نہیں ہوتا...... گھبراؤ نہیں، واپس لوٹ جاؤ...... نروان حاصل کرنے کے لیے کپل وستو چھوڑنا پڑتا ہے شاکیا منی...... ہجرت بنیادی اصول ہے آگاہی کے لیے۔ وہاں تمہیں اپنا راستہ مل جائے گا...... جب تک تم مجھ سے فارغ نہ ہوئے قدآور درخت نہیں بن سکو گے، ہمارے لیے فراق ضروری ہے۔'' (۶۱)

ہجرت اور فراق کی آگ میں جلتے ہوئے جہانگیر نے امریکہ میں ترقی کا سفر طے کیا۔

'' مجھے چھوڑ کر جہانگیر چلا گیا۔ پھر جہانگیر کی اطلاع کم کم ملتی رہی۔ میرا بَن باس اور جہانگیر کا نروان شروع ہو گیا۔ ہم دونوں آگہی کی مختلف منزلوں میں بھٹک رہے تھے۔'' (۶۲)

آگہی کی منزل غم اور جدائی سے عبارت رہی۔ شاہدہ اور جہانگیر آزادی اور خودمختاری کی جس منزل کو حاصل کرنے امریکہ گئے تھے، اس کے ساتھ تنہائی کا درد جڑا ہوا تھا۔

تصورِ فلاح

ناول کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ بانو قدسیہ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ مادی ترقی کے راستے پر صرف خسارہ ہی انسان کا مقدر بنتا ہے۔ مادی ترقی کے رستے پر چلنے والا انسان کبھی سکون، اطمینانِ قلب اور حقیقی مسرت کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ مادی ترقی کے مقابلے میں بانو قدسیہ فلاح کا تصور پیش کرتی ہیں جس کے پسِ پشت مذہب کے احکامات اور صوفی نظریات موجود ہیں۔ مصنّفہ سمجھتی ہیں کہ یہی انسان کی حقیقی ترقی ہے اور اسی میں اس کے لیے سکون اور اطمینانِ قلب کا نسخہ موجود ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی نے انسان کے اندر آزادی اور خودمختاری کو جنم دیا ہے۔ لیکن یہ انسان کے اندر منفی رویوں کو جنم دینے کا باعث بنتی ہیں جو آزادی اور خودمختاری مادی ترقی کی پیدا کردہ ہے۔ وہ محبت اور تعلقات کے خاتمے کا باعث بنتی ہیں اور انسان کو تنہا کر دیتی ہے۔

آزادی اور خودمختاری کا دوسرا تصور فلاح پیش کرتی ہے۔ یہ مادی ترقی کی بجائے روحانی ترقی پر زور دیتی ہے۔ اس میں مذہب، اقدار، رشتے اور تعلقات اہم ہوتے ہیں۔ محبت اس کی بنیادی قدر رہے۔

مادی ترقی سے حاصل ہونے والی آزادی اور خود مختاری کا انداز یہ ہوتا ہے:

''آزادی کے تصور سے ہمکنار ہونے کے بعد سفید فام لوگ سب سے پہلے توقعات کی سیڑھی پر اُترنا چڑھنا بند کرتے ہیں۔ جب تعلق کا گرم کمبل جسم سے اترتا ہے تو ہر ٹھٹھرتے آدمی کو خود ہی جوگرز پہن کر جوگنگ کر کے اپنے وجود کی حرارت کو برقرار رکھنے کا فن آجاتا ہے۔ پھر آزاد بندہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظر بن جاتا ہے۔ غم بھی اس کی خود ساختہ قرنبیق سے نکلتے ہیں اور آنسو بھی اسے اپنے ہی گیلے رومال میں جذب کرنا ہوتے ہیں۔ بالآخر وہ اپنے وجود میں اس قدر تنہا رہ جاتا ہے کہ اس کے ہر عمل کی ذمہ داری اس کے اپنے کندھوں پر آپڑتی ہے۔ وہ نہ کسی کو الزام دے سکتا ہے نہ کسی سے کسی قسم کی توقع رکھ سکتا ہے۔ اپنی تقدیر کا خالق اور اپنی Free Will کا آلۂ کار عام طور پر ترقی کی سنہری پوستین حاصل کرنے میں عمر بِتا دیتا ہے...... سزا و جزا کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد آزاد منش کو آنسو پی جانے کے علاوہ غم سے نپٹنے کا اور کوئی طریقہ بھی سوجھ نہیں سکتا۔ تعلق کی بیساکھی پھینک دینے کے بعد مجبوری پھر بھی رہتی ہے، لیکن کسی کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے Self کی لاٹھی کے سہارے چلنا پڑتا ہے۔''(۶۳)

فلاح کے رستے پر چلنے والا انسان بھی تعلق اور توقع کو توڑ کر آزادی حاصل کرتا ہے لیکن یہ آزادی اپنی ذات کی نفی سے حاصل ہوتی ہے جبکہ مادی ترقی کی آزادی اُنا پرستی کا دوسرا نام ہے۔

''مشرق میں جب کوئی راہب، صوفی، جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدی پر بٹھانے کے لیے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق ہر توقع توڑ کر جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک اور تضاد کا بکھیڑا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ جوق در جوق اس سے تعلق پیدا کرنے کے لیے حاضری دیتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ تعلق کے پھندے میں بھی پھنستے نہیں اور اپنی Free Will صرف اللہ کے امر کے سامنے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تعلق کے سمندر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن قطرہ پھر بھی کشتی

کے اندر نہ آنے پائے۔ اپنے غموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ تعلق کی رسّی پانیوں میں پھینکنے کے بجائے اوپر کی طرف اچھالتا ہے۔ اور تعجب اِس بات پر ہے کنڈی اوپر لگے نہ لگے، وہ فلاح کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں تعلق کے جھنڈے کی بھی اسے ضرورت نہیں رہتی۔ اب اسے غم بھی قید نہیں کر سکتا۔ وہ تعلق اور توقع سے فارغ ہو کر ایک ایسی آزادی سے آشنا ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی ذات کو ارپن کرنے کا فن ہے۔ نہ آزادی کا شوق باقی رہتا ہے نہ تعلق کا......'' (۶۴)

ناول میں بانو قدسیہ نے ہمایوں اور اقبال کے درمیان ایسے ہی تعلق کو واضح کیا ہے۔ ہمایوں فراق کی زنجیر میں اقبال سے بندھا ہے۔ تعلق کا کوئی جھنڈا ان کے پاس نہیں ہے۔ ہمایوں ہر تعلق اور توقع کو توڑ کر آزادی کے ایسے تجربے سے گزر رہا ہے جو نفی ذات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے راضی برضا ہونے کا فن سیکھ لیا ہے۔ وہ ایک ایسی آزادی سے آشنا ہو چکا تھا جسے اب غم بھی قید نہیں کر سکتا۔

ترقی کا ایک بڑا راز تبدیلی میں پوشیدہ ہے۔ تبدیلی اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان میں خواہش پیدا ہو۔ تبدیلی بہتر سے بہتر کی تلاش میں مدد دیتی ہے اور ترقی یافتہ معاشرے میں خواہشات کو اُبھارنے کے لیے بازاروں کے جنگل ہیں، ابلاغ ہے، ذرائع آمد و رفت کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے، بدلتی خواہش انسان کو ترقی کے زینوں پر اوپر چڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

''وہ وفا کو بہ شرطِ استواری استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ بیوفائی سے زندگی میں تازگی رہے، درست علاج ہو نہ ہو، درد کم سے کم رہے۔ وہ ماں کا دن مناتا ہے...... باپ کا ڈے مناتا ہے، بوڑھے لوگوں کا سال celebrate کرتا ہے......لیکن انہیں اپنے پر سوار نہیں کرتا۔'' (۶۵)

بانو قدسیہ سمجھتی ہیں کہ ترقی کی خاطر تبدیلی کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کہ انسان فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ اس رستے پر چلتے چلتے وہ مکمل طور پر مادیت میں ضم ہو جائے گا، جو نہ تو اس کی فطرت کا تقاضا ہے اور نہ ہی مشیّت کی منشا۔ کیونکہ وہ گوشت پوست کا بنا ہے۔ اس کے اندر ایک روح ہے جس کے تقاضے جسمانی تقاضوں سے مختلف ہیں۔ ترقی اور تبدیلی کا راستہ اس کی روح کو مکمل طور پر راس نہیں آتا۔

فلاح کے رستے کو بانو قدسیہ استقامت اور استواری کا رَستہ کہتی ہیں۔

''فلاح کے راستے پر اپنی خواہش بدلنا نہیں پڑتی بلکہ اسے ایک ہی سمت میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس بظاہر جامد خواہش کے باوجود فلاح پانے والا تبدیلی سے آشنا رہتا ہے لیکن بقدرِ ضرورت، ہروقت کی اُکھاڑ پچھاڑ اُس کا پیچھا نہیں کرتی۔'' (۶۶)

فلاح کے اندر دنیا کی اصل حقیقت کو سمجھنے کا شعور موجود ہے۔ یہی شعور اسے تبدیلی کی بے معنویت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ مذہب اسے مابعد کی دنیا کا درس دے کر اس دنیا کے پیچھے دیوانہ وار بھاگنے سے روکتا رہتا ہے۔

''عام انسان کو مذہب کی اصلیت سے چاہے آگاہی ہو نہ ہو، وہ قبر پرستی، تعویذ گنڈے، پیر حضوری میں دن گزارتے ہوئے ہولے ہولے غلاظت کے ڈھیروں میں گزرتے ہوئے مست اور مجذوب کے مرحلوں سے واقف، جسم پر رنگ برنگ منکوں کی مالائیں سجائے فقیر کو دیکھ کر مشرقی انسان کو اپنی تمام تر بدنصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ دنیا دارالمحن ہے۔ یہاں انسان کا امتحان مقصود ہے اور اصلی حیات مابعد سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی سفر آسان نہیں کر سکتی۔ کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پُرسکون، قناعت پسند، مسرت آشنا نہیں بنا سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا۔'' (۶۷)

فلاح انسان کی خواہشات کو دَباتی ہے، مذہب اسے صبر، توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر اُبھارتا ہے۔ خواہشات کو دَبانا، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا، فساد نہ پھیلانا، نمائش سے گریز، اَنا کی سرکوبی فلاح کے لیے اہم ہیں۔ فلاح کی یہی اقدار انسان کو حقیقی مسرت اور اَبدی سکون کی طرف لے جاتی ہیں۔

ہر انسان پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ خود کو ذہنی دباؤ اور غم سے نکال کر طمانیتِ قلب، سکون اور شانتی سے ہمکنار کر سکے۔ وہ مادی ترقی میں ان روحانی کیفیات کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دولت، آزادی اور خودمختاری سے اپنی روح کے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ مادی ترقی کے ساتھ انہیں حاصل کرتا چلا جاتا ہے، اس کی تنہائی بڑھتی جاتی ہے۔

ترقی کے خواہش مند انسان کی زندگی مصروفیت میں گزرتی ہے۔ اس کا وقت قیمتی ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحے اسے سونے میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے پاس تفکر کے لیے وقت نہیں ہے۔ نہ وہ خود کو پہچانتا اور جانتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوشش کرتا ہے۔

''انسان جب کام کاج چھوڑ کر ٹانگیں پھیلائے، سر کے پیچھے ہاتھوں کی کنگھی سے سہارا دے کر مندی مندی آنکھوں سے نیلگوں آسماں کو دیکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے شعور اور لاشعور کا درمیانی دروازہ کھلتا ہے۔ پھر وجدان کی پریاں اشارہ پا کے اسے تحت الشعور کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ تخلیق کے پرندے پھڑ پھڑاتے ہیں۔ صدیوں کی گم گشتہ آرچی ٹائپ شبیہیں ملتی ہیں۔ ماضی اور مستقبل کے اسرار و رموز سے شناسائی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو Hyonotise کرنے کی قوت سے شناسا ہو جاتا ہے۔ تحت الشعور یادوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ ان سلجھی گتھیوں کا پنڈورا باکس ہے۔ یہیں سے عرفانِ ذات کا علم ملتا ہے۔ مصروف انسان کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی۔''(۶۸)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ عرفانِ ذات حاصل کیے بغیر انسان کو اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔

انسان نے دافعِ غم کے لیے بہت سی خوشیاں بنا لی ہیں۔ جس طرح وہ صحت کے لیے ادویات ایجاد کرتا چلا جاتا ہے، ایسے ہی وہ غم سے نپٹنے کے لیے میڈیا، بازار، ہوٹل، سفر وغیرہ کو استعمال کر رہا ہے۔ خوشیوں کا بازار پھیلا ہے۔ ان میں وہ اپنے مطلب کی خوشی تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی خوشی دیرپا نہیں ہوتی۔

امریکہ نے غم سے نپٹنے کے لیے یہ طریقہ اپنایا ہے کہ وہ غم کو مسئلے کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور پھر مسئلے کا علاج ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ غم کو مسئلہ بنا کر سلجھاؤ کی طرف قدم اٹھانے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ ساری انڈسٹری اور ٹیکنالوجی غموں کا مداوا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے۔ مختلف قسم کے مسائل کو سلجھانے کے لیے اتنا بڑا مارکیٹ تیار ہو چکا ہے کہ اب سمجھ نہیں آ سکتی کہ یہ سارا بازاری نظام علاج ہے کہ مسئلہ کا ایجاد کرنا؟

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ غم کا اصل علاج صبر سے ممکن ہے۔

''فلاح کی راہ پر چلنے والے غم سے نپٹنے کے لیے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ جہاد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹونا کام میں نہیں لاتے۔ صبر کا دارو پینے والے شرم و حیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کوئلوں کو دَم پخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں غم کی بوٹی کو گھاس سے چننے کا رواج نہیں، بلکہ بغیر آکسیجن دیے غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔''(۶۹)

مادہ پرست معاشرے نے غم کے علاج کے لیے جو طریقے ایجاد کیے ہیں، جہاں جہاں وہ فیل ہو جاتے ہیں وہاں صرف صبر کام آتا ہے۔ بانو قدسیہ کہتی ہیں، صابرین کے ساتھ خدا کی رحمت موجود رہتی ہے۔ ان کا کہیں نہ کہیں کوئی سچا تعلق ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کی موجودگی میں غم کی کاٹ باقی نہیں رہتی۔ یہ سچا تعلق شہ رگ کے ساتھ رہنے والے سے بھی ہو سکتا ہے اور کسی انسان کے ساتھ بھی۔

''یہ تعلق کسی سائیکالوجسٹ، سائیکی ایٹ رسٹ سے اس لیے بھی بڑا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت شہ رگ کے ساتھ رہتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالنے کا عزم کرنے کے بعد نسچنت ہو جاتا ہے۔ مسائل پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن علاج عموماً ایک ہی رہتا ہے...... تعلق!'' (۷۰)

جو خدا کے ساتھ سچا تعلق قائم کرتے ہیں اور غم کی حالت میں خدا کو پکارتے ہیں وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتے۔

''ابدی سکون کو چاہنے والے یہاں وہاں، ہر مقام پر اسے حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ہی نروان، سکون، فلاح حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔'' (۷۱)

جدید معاشرے کے انسان کی بیماریاں نفسیاتی ہیں، جنہیں دوا سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ڈیپریشن بیماری نہیں بلکہ اللہ کا عذاب ہے جو ناشکر گزار لوگوں کے دلوں پر اُترتا ہے۔

''ڈیپریشن بیماری نہیں حالت ہے...... یہ کبھی کبھی راتوں رات غائب ہو جاتی ہے کبھی سائیکو تھیرپی، Psychoanalysis اور ڈرگز سے بھی کچھ فائدہ نہیں......

......لیکن ایک وجہ مجھے اور بھی معلوم ہو گئی ہے چاچا جی، وقت کے ساتھ...... تجربے کے ساتھ...... ڈیپریشن ناشکر گزاری کی قلبی بیماری ہے......'' (۷۲)

نفسیاتی بیماریاں مایوسی اور ناشکر گزاری کی پیدا کردہ ہیں۔

''پیارے بیٹے جہاں تک تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا سکا ہوں...... یہ تمہاری بیماری نہیں، صرف قلب کی حالت کا بیان ہے۔ اور قلب کچھ بیماریوں کا شکار ہوا کرتا ہے، شرک، ناشکر گزاری اور تکبر، بلکہ یوں سمجھو تکبر ہی ناشکر گزاری کو جنم دیتا ہے۔ اگر ترقی والوں کی مدد

سے اس کا علاج کرو گے تو گولیاں پھانکو گے۔کبھی Psychoanalysis کراؤ گے، کبھی
سائیکوتھرپسٹ کے پاس جاؤ گے۔''(۷۳)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ نفسیاتی بیماریاں، جنہیں وہ قلبی بیماریاں کہتی ہیں، ان کا علاج خدا سے لَو لگانے میں ہے۔ وہ روحانیت میں ان قلبی حالتوں کا علاج تلاش کرتی ہیں:

''ایک علاج فلاح والوں کا بھی آزما دیکھو......اپنے قلب کو ذکر اللہ کے حوالے کرو......اللہ
کے ذکر کے علاوہ اطمینانِ قلب ممکن نہیں......''

مصنّفہ کا خیال ہے کہ انسان کی منفی سوچیں اسے بیماریوں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ اگر وہ مایوسی سے نکلنا چاہتا ہے تو اسے خدا پر ایمان کو پختہ کرنا ہوگا۔ اس کی حدیث نفس اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے جب وہ خدا کے ذکر اور اس کی یاد کو دل میں بسائے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ مادی فائدے کے لیے فکر مند رہتے ہیں، راحت، عافیت اور اطمینان ہمیشہ ان سے دور رہتے ہیں۔ جدید ترقی یافتہ معاشرے کے افراد خود کو لبرل کہتے ہیں۔ وہ خود کو کسی خیال، مسلک، مذہب، ملک، خاندان سے وابستہ نہیں کرتے، حتیٰ کہ وہ خدا سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ لبرل انسان کے پاس ایمان جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ ہر راستے کا مسافر ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ کا خیال ہے کہ لبرل ازم کا فلسفہ دراصل خود غرضی پر مبنی ہے۔ امریکی معاشرے کو ترقی کے راستے پر چلنے کے لیے دوسرے مذاہب اور نسل کے لوگوں کی بھی ضرورت تھی۔ ان نسلی، لسانی اور مذہبی گروہوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے اور اپنے نظام کو چلانے کے لیے اس نے بڑی فراغ دلی دکھائی۔ بظاہر یہ سوشل جسٹس کے نام پر تھا لیکن حقیقت میں یہ زیردام لانے کی پالیسی تھی، اس نے مذہب میں گنجائش پیدا کی اور آہستہ آہستہ وہ اس قدر ترقی پسند ہو گیا کہ مذہب سے اس کا ایمان ہی اٹھ گیا۔ بانو قدسیہ مذہب سے ایسی آزادی کو انسان کے لیے انتہائی خطرناک سمجھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اصل لبرل ازم یہ ہے کہ انسان کا ایمان پختہ ہو، وہ ایک راسخ خیال پر چلنے والا ہو۔ وہ نہ تو اپنا راستہ چھوڑنے والا ہو اور نہ دوسرے کے اعتقادات کو غلط جانتے ہوئے ان پر تنقید کرنے والا ہو۔ مصنّفہ کا خیال ہے کہ کسی مسلک کا پابند ہوئے بغیر انسان آزاد نہیں رہ سکتا۔ پابندی اور آزادی کے تضاد کو حل کیے بغیر انسان خوش نہیں رہ سکتا۔

''نہیں بابا جان......انسان دورُخا ہے......وہ ہر جگہ ہر لمحہ دوئی کا شکار ہے۔ کوئی شخص پابند
ہوئے بغیر آزاد نہیں رہ سکتا......زندگی دن رات کا اکٹھا سفر ہے، حق و باطل کی جنگ سدا بہار
ہے۔ میں چاہوں نہ چاہوں، لیکن اتنا ضرور مان گیا ہوں کہ زندگی پنڈولم کا سفر ہے......

انسان زندگی اور موت کی دوئی کے درمیان......اگر کہیں وسط میں پنڈولم روک سکے تو وہ لبرل ہوسکتا ہے۔ اگر وہ بندھا ہوا بھی ہو اور آزاد بھی رہے تو وہ خوشی محسوس کر سکتا ہے......''(۷۴)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ حدوداور آزادی کی تشریح اگر مذہب کے حوالے سے کی جائے تو ان دونوں کا تضاد حل کر کے وسط کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ وسطی راستہ ہی فلاح کا راستہ ہے اور اسی راستے پر چل کر انسان راحت وسکون حاصل کر سکتا ہے۔

''تم بیک وقت حدود اور آزادی کو ٹٹول رہے ہو، ان دونوں کی Interpretation اگر مذہب سے کشید کرو گے تو فلاح پاؤ گے اور اگر اِن دونوں کی سمجھ بوجھ ہیومن رائٹرز سے اخذ کی تو آگے پھر دوئی کا سفر ہے، تضاد کا جال ہے۔ ہیومن رائٹرز پنڈولم کا سفر تیز کر دیتے ہیں۔اسے وسط میں لانے کا کرشمہ نہیں کر سکتے۔''(۷۵)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مذہب وہ پیمانہ ہے جس پر عمل کی سچائی پرکھی جا سکتی ہے۔ جب تک مذہب کے اصول، اعتقادات پر ایمان لا کر اسے پیمانہ اور معیار نہ مانا جائے، انسان وہم وگماں اور شکوک وشبہات کا شکار رہتا ہے۔اس کی سوچ متذبذب اور عمل ڈانواڈول ہو جاتا ہے۔مذہب اسے خیال کی پختگی اور عمل کی استقامت عطا کرتا ہے۔

''یہی تو سوچنے والی بات ہے جانِ من......انسان پیمانہ نہیں، نبی پیمانہ ہے......اسی پر عمل تولا جا سکتا ہے، اسی پر لبرل ازم کو جانچا جا سکتا ہے، وہی سوچ کی درستگی کا ضامن ہے...... بغیر نبی کے انسان کو پَرکھنے، جانچنے، ناپنے کے لیے اپنی اپنی عقل درکار ہوگی اور تم جانتے ہو ہر انسان کی عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہر معمولی انسان کی عقل یونیورسل پیمانہ نہیں بن سکتی اور تم یہ بھی سمجھ لو اسی لیے نبی کا اُمّی ہونا بھی ضروری ہے۔اس کے پاس انسانی علم نہ ہو، کوئی ڈگری کوئی تعلیم نہ ہو، وہ کسی علم کی طرف پہلے سے راغب نہ ہو، اس کی ہوٹ لائن رب سے ڈائریکٹ ہو اور وہ اسی علم کے مطابق تعلیم دے اور اسی قدر اور وہی تعلیم دے جس کا امر ہو......''(۷۶)

مصنّفہ مذہب میں جاننے کی بجائے ماننے کو اہم سمجھتی ہیں۔ان کے نزدیک راضی برضا ہونا، مان کر سر جھکا دینا اور

صبر سے انتظار کے رستے پر چلتے رہنا مذہب کے روحانی پہلو کے سنہری اصول ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ صاحبِ اختیار ہونا، یعنی اپنی مرضی کو خدا کے احکامات کے خلاف استعمال کرنا، شیطانی فعل ہے۔ اسی طرح خدا کی رحمت سے مایوس ہونا، نفس کی غلامی ہے۔ بانو قدسیہ حضرت آدمؑ اور ابلیس کی کہانی کے ذریعے اختیار اور اطاعت کے فلسفے کو بیان کرتی ہیں:

''جب خالقِ حقیقی نے کھنکھناتی مٹی سے بابا آدم کو بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک کر ابلیس سے کہا کہ لے اب تو آدم کو سجدہ کر تو ہمایوں...... روایت تو یہی تھی کہ جو اللہ حکم دیتا فوراً مانا جاتا، لیکن بغاوت نے پہلی بار بہشت میں جنم لیا۔ ابلیس نے سوچا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، اسی لیے اُس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلی نافرمانی سے عرش کے کنگرے ہل گئے......اور باری تعالیٰ نے کہا...... لے ابلیس نافرمانی کی ایک ہی سزا ہے، اب تو صاحبِ اختیار ہے۔ تجھ کو میں نے ماننے والوں میں سے نہ پایا۔ یہ پتلا ماننے والوں میں سے ہوگا۔ اب تک میں نے جو کچھ تخلیق کیا میرے ماننے والے ہیں۔ ابلیس چونکہ نافرمانی کا مرتکب ہو چکا تھا، اب صاحبِ اختیار بھی گردانا گیا، اسی وقت تکبر کا شکار ہوا، کہنے لگا، باقی سارے اختیار تو میں نہیں مانگتا، بس اتنا اختیار دے کہ میں تیرے اس لاڈلے کو تیری رحمت سے مایوس کر سکوں۔ جا تجھے روزِ قیامت تک مہلت ہے۔ اللہ نے ایک نافرمانی کے بدلے ابلیس کو صاحبِ اختیار کر دیا......'' اب ابلیس تاک میں رہنے لگا کہ کیسے بابا آدم کو ورغلائے اور اللہ کی رحمت سے مایوس کرے......انہوں نے حضرت آدم میں تخلیق کی خواہش جگائی، نفس کی چنگاری جلائی۔ اماں حوا کی دوئی سے مدد لے کر حضرت آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ سے کھانے پر مجبور کیا۔ حضرت آدمؑ ماننے والوں سے نہ رہے۔ وہ بھی اسی نافرمانی کے مرتکب ہوئے جو ابلیس کر بیٹھا تھا۔ اب باری تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور مائی حوا سے کہا، نیچے اتر جاؤ۔ آج سے تم صاحبِ اختیار ہو۔ پہلے تم ماننے والے تھے، تمہارے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ اب تمہارے اندر دو ہیں، باہر دو ہیں۔ تم زوج اور متضاد کا شکار ہوئے۔ اب تمہارے اندر ایک راستہ رب کی اطاعت ہے، دوسری راہ ابلیس کی ہے۔ وہ تم میں ایسی خواہشات جگائے گا جن کا پورا ہونا ناممکن ہوگا......تم انتظار کی صعوبت برداشت نہ کر سکو گے۔ صبر کی ڈھال لے

کر نہ چل سکو گے...... ایسے میں تم مجھ سے مایوس ہو جاؤ گے...... پھر ابلیس تم کو اپنے گروہ میں شامل کرے گا...... آج کے بعد تم صاحبِ اختیار ہو۔ تمہارے اندر دونوں راستے ہوں گے۔ جو لوگ اللہ کے ماننے والے ہوئے نبی کے آگے جھکنے اور اس کی حدود کو پار نہ کرنے والے ہوں گے، وہ ابلیس کے اغوا سے محفوظ رہیں گے اور جو بار بار اپنے نفس کے آگے جھکے اپنی خواہشات کی رسّی سے بندھے، وہ ابلیس کے یاروں میں سے ہوں گے...... تم آج کے بعد ابلیس کی طرح صاحبِ اختیار ہو...... یا اللہ کا راستہ چن لو یا ابلیس کا، تمہیں اختیار ہے......''(۷۷)

انسان کے اندر اور باہر کا تضاد ہر وقت اس کے اختیار کو آزماتا ہے۔ ایک طرف فلاح کا راستہ ہے جو صبر، امید اور انتظار سے آراستہ ہے۔ اس راستے میں محبت اور تعلق کی چھتری انسان کے لیے سایہ بنتی ہے۔ وہ صاحبِ اختیار ہوتے ہوئے بھی اپنے اختیار کو خدا کی مرضی میں ضَم کر دیتا ہے۔ اسے صاحبِ اختیار ہونے کی قیمت نہیں چکانی پڑتی۔ اور اسے دنیا میں ہی راحت وسکون، اطمینانِ قلب اور شانتی حاصل ہو جاتی ہے۔

مشرق کے روایتی خاندان میں ماننے کی یہی قدر آج بھی رائج ہے۔ بزرگوں کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دیا جاتا ہے۔ ان کی مرضی میں نوجوان اپنے اختیار سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اگر وہ راضی برضا ہو کر ان کے فیصلوں کو دل سے تسلیم کر لیتا ہے تو پھر کشمکش سے چھوٹ کر سکون حاصل کر لیتا ہے۔

میں چپ چاپ اٹھ کر اندر گیا تو امّاں نے مجھے بلا کر کہا...... ''میں تیری منگنی اصغری سے کرنا چاہتی ہوں...... تیرا کیا خیال ہے؟''

میں چپ رہا۔

''تو نے اسے دیکھا ہے ناں......''

ایک نوکرانی صفت مسکین سی چھچھوندر میں نے کبھی کبھی گھر میں رینگتی دیکھی تھی۔

''آپا سعیدہ کی نواسی ہے۔ بڑے سکھ دینے والی ہے۔''

''جی ٹھیک ہے، جیسا آپ مناسب سمجھیں...... میں ماننے والوں میں سے ہوں۔''

امّاں بھی ٹھیک تھیں۔ اصغری نے مجھے بڑے سکھ دیے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے وہ خوشی نہ

دے سکی، جس کی میں خواہش رکھتا تھا۔ میں نے اقبال کی مان لی۔ یہ فیصلہ بھی سکھ دینے والا تھا......ایک بار پھر مان کر میں شانتی بھون میں داخل ہو گیا۔'' (۷۸)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ صبر اور اطاعت فلاح کا اصل جوہر ہیں۔ مادہ پرست انسان اطاعت سے خوفزدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے اختیار کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا اور پھر فیصلہ کی ذمہ داری اٹھا کر اس کی قیمت بے اطمینانی اور ناآسودگی کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ مادی ترقی کا خواہش مند انسان ماننے سے پہلے جاننے کی کوشش کرتا ہے اور جسے جان نہیں سکتا اسے مان بھی نہیں سکتا۔ فلاح کے رستے پر چلنے والا جاننے سے پہلے مان لیتا ہے۔

''وہ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں۔ پھر بیکار تجسّس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔ راستہ طے کرنا ہی ان کی منزل بن جاتا ہے......خوف و حزن ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ وہ تبدیلی سے پہلے اپنے خیال میں تبدیلی سے خوفزدہ نہیں ہوتے......بس صبر ہی ان کی ڈھال اور انتظار ہی ان کا واحد وسیلہ بن جاتا ہے......'' (۷۹)

بانو قدسیہ کے نزدیک ''مان لینا'' زندگی کے رنج و الم سے نپٹنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اسی سے زندگی کی کڑی مسافت آسان ہوتی ہے۔

''جو لوگ صحراؤں کا سفر کرتے ہیں، لیکن مان کر سر جھکا کر چلتے ہیں، موت کی راہ تکتے ہیں، لیکن امید کے ساتھ......جنہیں مسیح موعود کا انتظار ہوتا ہے، لیکن انتظار سے زیادہ وہ کچھ نہیں سوچتے...... وہ جن کو علم ہوتا ہے کہ ان کا ہیرا من طوطا انہیں کبھی مل نہیں سکتا اور پھر بھی وہ آہٹ سن کر دروازے کی جانب دیکھتے ہیں اور شانت رہتے ہیں......وہ منتظرِ کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں نا تاویلوں میں۔ جنہیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے نہ حکم ماننے کے لیے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے، نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ کا عذاب......ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔ نہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ستاتی ہے نہ کہیں لمبے راستے پر منزل نہ پانے کی آرزو غمزدہ کرتی ہے۔ ایسے لوگ......فلاح کے راستے پر کتنی آسانی سے چلا کرتے ہیں۔ انتظار بھی ان

کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، نہ سخت دل بناتا ہے، نہ مایوس کرتا ہے۔ فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔''

بانو قدسیہ نے ہمایوں اور اقبال کے تعلق کو اس مثالی تعلق کا استعارہ بنایا ہے جو فلاح کے راستے پر چلنے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہمایوں اور اقبال کے درمیان ایک تعلق پیدا ہوا۔ یہ اس تعلق سے بہت مختلف تھا جو جدید دَور کے نوجوان عاشقوں میں پایا جاتا ہے۔

''آپ نے امریکہ کی پارکوں، بازاروں، ایئرپورٹوں، بسوں، ہوٹلوں میں ایسے جوڑے دیکھے ہوں گے جن کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو پاتے، جن کے بدن بیلوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے جاتے ہیں۔ اس محبت میں اس درجے کا اعلان ہے جس کی توفیق آزاد عاشقوں کو کم ملتی ہے۔''(۸۰)

ہمایوں اور اقبال کے درمیان بے نام تعلق تھا جسے فراق کی زنجیر نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ بانو قدسیہ ایسے تعلق کا راز فاش کرتی ہیں جس میں عاشق اور محبوب ہر توقع اور تعلق سے آزاد ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا دشوار نہیں ہوتا۔ مصنفہ مثالی اور علامتی عاشقوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''ایک بات جو اِن عاشق زادوں کی مجھے سمجھ آئی کہ ان میں ایک دوسرے پر جذباتی Dependency کا یہ عالم تھا کہ محبوب کے بغیر زندگی صرف چھلکا تھی، خالی کھوکھا، بلکہ بِن آکسیجن کے مستعار سانس۔ صحرا میں تلاش ہو یا تنہا نہر کھودنے کے صعوبت، کچے گھڑے کا سفر ہو یا اپنے ہی جسم کے کباب بنا کر کھلانے کا عمل۔ یہ سارے تعلق اپنی جان سے گزر جانے والے تھے...... ایسے تعلق سے غالباً فلاح کی دیوی بھی خائف رہتی ہے۔''(۸۱)

بانو قدسیہ جس تعلق کی بات کرتی ہیں وہ محبت کا آزاد تعلق ہے۔ یہ وہ آزاد تعلق نہیں جو جدید ترقی یافتہ معاشرے میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں عاشق اپنی آزادی کو محبوب کی مرضی پر قربان نہیں کر سکتا بلکہ یہ وہ تعلق ہے جو محبوب کی مرضی پر اپنی رضا قربان کر کے، عاشق غلام ہو کر آزاد ہو جاتا ہے۔ ہمایوں نے اقبال کے ساتھ ایسا ہی تعلق استوار کر رکھا تھا جس میں انتظار کے سوا کچھ نہیں ہوتا، عاشق کو علم ہوتا ہے کہ اس کا ہیرا من طوطا اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی وہ امید کے

ساتھ انتظار کرتے ہیں اور شانت رہتے ہیں۔

’’ارجمند اور بلال کو جاپان گئے پورا ویک اینڈ گزر گیا۔ غالبًا اقبال نے آنسرنگ مشین نہیں سنی تھی۔ اس طرف سے نہ کوئی آیا نہ ہی کسی نے فون کیا۔ پھر بھی میرے کان فون کی گھنٹی پر لگے تھے۔‘‘ (۸۲)

’’اقبال کے فون کا انتظار رہا۔ لیکن مجھے انتظار کے سوائے کچھ نہ ملا۔ بچے کچھ دیر بعد سو گئے۔ ان کے پاس اپنا اپنا سہارا ٹیڈی بیئر اور باربی ڈول کی صورت میں موجود تھا۔ میں فقط ایسے چونگے کے سہارے سونے کی کوشش کر رہا تھا جس سے سوکھے نلکے کی سائیں سائیں کے علاوہ کوئی آواز نہ آتی تھی۔‘‘ (۸۳)

’’پتہ نہیں کیوں میرے سارے پروگرام امریکہ پہنچنے کے بعد آنٹی اقبال کے تابع ہو گئے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ آنٹی اقبال چھلاوہ تھی اور میں اس کے پیچھے بھاگنے والا۔‘‘ (۸۴)

امریکہ میں ہمایوں کو اقبال مل گئی لیکن ملتے ہی حکم ہوا کہ امریکہ چھوڑ کر پاکستان چلے جائیں۔ ہمایوں اُن منتظرِ کرم میں سے تھا جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، جنہیں نہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے نہ ماننے کے لیے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے۔ ہمایوں نے امریکہ چھوڑ دیا۔ اسے فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی مل چکی تھی۔

ہمایوں اور اقبال کا تعلق ’’جذباتی Dependency‘‘ سے ماوراء تھا۔ یہ جان سے گزر جانے والا نہیں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کے رستے پر چلنے والا ہے۔ جہاں امید ساتھ نہیں چھوڑتی اور مان کر سر جھکا کر راستہ طے کرنا ہی عاشق کے لیے راحت و سکون اور اطمینانِ قلب کا باعث بنتا ہے۔

مشرقی معاشرے میں اطاعت اور فرمانبرداری کی تربیت بچپن ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچہ بڑوں کا حکم مان کر اخلاقی تربیت حاصل کرتا ہے۔ اطاعت اور فرمانبرداری کی یہ خوبی ہی اقدار کی منتقلی کا باعث بنتی ہے۔ مغربی معاشرے میں فیملی سسٹم کے خاتمے کی ایک بڑی وجہ اطاعت اور فرمانبرداری کا نہ ہونا ہے۔ بچے آزادی اور خودمختاری کا درس بچپن ہی میں حاصل کر لیتے ہیں اسی لیے خاندان اقدار کو نئی نسل تک منتقل کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکا ہے۔

بانو قدسیہ کا نظریہ اقدار

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ ہجرت کے موضوع کو پیش کرتی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مادی ترقی کے حصول کے لیے انسان جو ہجرت اختیار کرتا ہے، اس کا انجام خسارہ ہے۔ وہ ہجرت کے عمل سے اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کے تناظر میں انسان پر پڑنے والے منفی اثرات کو بھی سامنے لاتی ہیں۔

بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ آج کا انسان جو معاشی و مادی ترقی کی خاطر ترقی یافتہ معاشروں کا رُخ کر رہا ہے۔ اسے مادی ترقی کی منزل تو ضرور حاصل ہو جاتی ہے لیکن روحانی و اخلاقی لحاظ سے وہ تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مادی ترقی اپنے ساتھ بے اطمینانی، نا آسودگی اور تنہائی بھی لے کر آتی ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ اپنے وطن سے نکل کر انسان جب دیارِ غیر میں پہنچتا ہے تو سب سے پہلے، وہاں پہنچتے ہی اسے اپنے اقلیت ہونے کا احساس گھیر لیتا ہے۔ اپنے وطن میں وہ کبھی اس سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اجنبی ماحول، انجانے لوگ، مختلف کلچر اسے پریشان کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے اقلیت ہونے کی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اس احساس سے نکلنے کے لیے وہ اکثریت میں ضم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنّفہ کہتی ہیں کہ یہ اس کی سب سے بڑی بھول ہوتی ہے کیونکہ اقلیت کبھی بھی اکثریت میں ضم نہیں ہو سکتی۔ لیکن تارکِ وطن اپنے آپ کو نئے معاشرے کے مطابق ڈھالنے کی ہر کوشش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنا لباس، زبان اور طریقِ زندگی بدل کر اکثریت میں ضم ہوا جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنا طرزِ زندگی اور طرزِ فکر بدلنے لگتا ہے۔ وہ نیا چولا پہن کر اکثریت کا روپ دھارنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں وہ اپنا تشخص کھو بیٹھتا ہے، لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ نئے نظامِ زندگی کا حصہ بننے کے لیے سب سے زیادہ عورت نقصان اٹھاتی ہے۔ عورت کی فطرتی اور حیاتیاتی قدر پرورش ہے۔ وہ پرورش کے عمل میں مصروف رہ کر ہی خوش ہو سکتی ہے لیکن جدید معاشرے میں وہ اپنا یہ کردار بدل لیتی ہے۔ وہ آزادی اور خود مختاری کے راستے پر چل نکلتی ہے۔ وہ اپنے روایتی کردار کے ساتھ وابستہ توقعات پر پورا نہیں اتر سکتی۔ کیونکہ اب اسے دو محاذوں پر بیک وقت جنگ کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف گھر تک محدود نہیں رکھتی بلکہ نئے نظام کا حصہ بننے کے لیے اور ترقی کی خواہش میں گھر کو خیر باد کہہ دیتی ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ ترقی کی سب سے بڑی قیمت تعلقات کے خاتمے کی صورت میں چکانی پڑتی ہے۔ امریکی معاشرے کی سب سے بڑی قدر محنت اور کام ہے۔ عورت اپنی بنیادی پرورش کی قدر کو بھلا کر گھر سے باہر کام کی قدر کو اپنا لیتی

ہے۔ وہ بچوں کو day care centre میں چھوڑتی ہے جہاں بچہ ماں سے دور اجنبی عورتوں کی گود میں پلتا ہے۔ نہ اسے ماں کی شفقت اور محبت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی ماں اس کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتی ہے۔

مصنّفہ کہتی ہیں کہ چونکہ ترقی حاصل کرنے کے لیے عورت کو آزادی درکار ہوتی ہے اس لیے وہ بچوں کو بھی خودمختاری کی تربیت دیتی ہے۔ بچے اپنے معاملات خود ہی سنبھالنا سیکھ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی ضرورت کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے، توقعات ختم ہونے لگتی ہیں۔ عورت اور بچے آزاد اور خودمختار تو ہو جاتے ہیں لیکن تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان ایک ایسی تنہائی میں چلا جاتا ہے جس کا کوئی علاج مادی ترقی کے پاس نہیں ہے۔

دوسری طرف عورت، بیوی کی حیثیت سے بھی اپنے روایتی اور فطری کردار کو نبھانے سے قاصر رہتی ہے۔ اپنی پرانی اور روایتی اقدار کو خیر باد کہہ کر اس نئے تصور کی وجہ سے جو امریکہ آ کر اسے حاصل ہوتا ہے۔ وہ شوہر سے برابری کی دعویدار بن جاتی ہے۔ بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ عورت کی آزادی اور خودمختاری کا نعرہ سب سے زیادہ نقصان عورت ہی کو پہنچاتا ہے۔ وہ اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کے لیے تیار رہتی ہے۔ خودانحصاری اور آزادی کی طلب نے شادی جیسے مضبوط نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ عورت اب کفالت کے لیے مرد پر انحصار نہیں کرتی اس لیے وہ شادی کے رشتے سے کسی بھی وقت دستبرداری کا اعلان کر سکتی ہے۔ عورت پہلے صرف اپنے خدائی مقصد سے بندھی ہوئی تھی۔ بچہ اس کا مقصد اور مستقبل تھا، لیکن اب وہ اپنی شناخت تلاش کرنے کا عزم کر چکی ہے۔

بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ عورت کا قدرتی اور فطرتی حیاتیاتی مقصد ختم ہو جانے کے باعث وہ بھی مرد کی طرح کھوکھلی ہو رہی ہے۔ اپنے اصل کردار کو چھوڑ کر وہ ڈیپریشن، فرسٹیشن، تنہائی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔

روایتی بیوی کی اقدار، ایثار و قربانی، وفا شعاری اور تعلقات کو ساری عمر نبھانا تھا لیکن اب وہ ان سب کو چھوڑ کر جن مادی اقدار کو اپنا رہی ہے، اس میں اس کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ ترقی یافتہ معاشرے میں آ کر تارکِ وطن اپنی روحانی اور اخلاقی اقدار کو چھوڑ کر اپنے تشخص سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ دیارِ غیر میں وہ بی کلاس سٹیزن بن کر رہتا ہے۔ اسے برابر کے حقوق تو شاید مل جاتے ہیں لیکن وہ محبت نہیں مل پاتی جو اپنے وطن میں اسے حاصل تھی۔ اس کی انا اور خودداری کو ٹھیس لگتی ہے۔ لیکن مادی ترقی کی خواہش میں وہ اپنی عزت و وقار اور تشخص کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ وہ اپنے لباس کو بدل لیتا ہے تاکہ اکثریت میں گم ہو کر وہ احساسِ کمتری سے بچ سکے، لیکن وہ پوری طرح اپنی شناخت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زبان کو چھوڑ دیتا ہے، لیکن یہ بھی کافی ثابت نہیں

ہوتا اور پھر اسے اپنے مذہب کے احکامات بھی فرسودہ نظر آنے لگتے ہیں۔ آخر کار وہ اس سے بھی اپنا دامن چھڑا لیتا ہے۔ لیکن افسوس مادی ترقی کے حصول کے بعد اس پر کھلتا ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر تنہا ہو چکا ہے۔ اس سے اطمینانِ قلب اور راحت و سکون کوسوں دور ہوتے ہیں۔

ناول میں بانو قدسیہ مشرق اور مغرب کے تضاد کو سامنے لا کر مادی ترقی اور فلاح پر بحث کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مادی ترقی کے حصول کے لیے کی جانے والی کوئی بھی ہجرت انسان کو روحانی سکون اور اطمینانِ قلب سے آشنا نہیں کر سکتی۔ مشرق کا انسان ترقی کی خاطر مغرب کا رُخ کرتا ہے۔ اسے مادی ترقی تو حاصل ہو جاتی ہے لیکن اس کی روح تنہا رہ جاتی ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ انسان کو مادی ترقی کی خاطر ہجرت کرنے کی بجائے تفکر کرنا چاہیے کہ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر اسے حقیقی سکون اور راحت و مسرت نصیب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ دکھاتی ہیں کہ ہر ہجرت آخر میں دکھ، تنہائی اور پچھتاوے کا کرب ثابت ہوتی ہے۔

مصنّفہ انسان کو فلاح کے راستے پر چلنے کی دعوت دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی کی اقدار محنت، کام، آزادی، خودمختاری، بےتعلقی، بیوفائی، معاشرتی انصاف اور لبرل ازم ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ بظاہر یہ اقدار سنہری نظر آتی ہیں، کیونکہ ان کے ساتھ نظام چلتے ہیں، ترقی کا پہیہ چلتا ہے، انسان مادی منزلوں میں ارتقاء کے مرحلے طے کرتا ہے۔ لیکن روحانی اعتبار سے وہ بالکل دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ وہ اخلاقی قدروں کو چھوڑ کر پستی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ چونکہ وہ آزاد ہوتا ہے اس لیے نہ تو معاشرہ اور نہ ہی مذہب اور خاندان کے سامنے وہ اپنی اخلاقی پستی کے لیے جوابدہ ہوتا ہے۔ سماجی، مذہبی اور اخلاقی قدروں سے آزاد ہو کر وہ ایسی تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے جس کا علاج نہ تو طبّی ماہرین کے پاس ہوتا ہے اور نہ ہی نفسیاتی و معاشرتی مسائل کے ماہرین اس کا روگ دور کر سکتے ہیں۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں، مذہب اور اقدار و روایات کو چھوڑ کر انسان جن روحانی و نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہوا ہے، ان کا علاج بھی مذہب کے اندر ہی ہے۔ مذہب کی اخلاقی اقدار میں شفایابی کا معجزہ موجود ہے۔ بانو قدسیہ آزادی و خودمختاری کی قدر کو منفی قرار دیتے ہوئے محبت کے تعلق اور اطاعت و فرمانبرداری کی مثبت اقدار کو انسان کے تمام تر دُکھوں، تنہائیوں اور مایوسیوں کا علاج قرار دیتی ہیں۔

مصنّفہ کا کہنا ہے کہ آزادی اور اختیار دراصل ابلیسی اقدار ہیں۔ مغربی دنیا میں آزادی کے معنی Free Will کے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے تعلق اور توقعات سے آزاد کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ تعلق اور توقعات سے بندھا ہوا انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جدید انسان نے ''Move Over'' کا فن سیکھ لیا ہے۔ آزادی کی منفی قدر کے سامنے وہ محبت کی مثبت قدر کو ٹھکرا دیتا ہے۔ وہ تعلق کا روگ نہیں پالتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے اس کے لیے اسے اپنی مرضی قربان کرنا پڑے گی۔ وہ اپنے اختیار کی خاطر ہر رشتہ چھوڑنے پر تیار نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ اختیار دراصل نافرمانی سے جنم لیتا ہے۔ کسی دوسرے کی نافرمانی کر کے ہی آپ صاحبِ اختیار ہو سکتے ہیں۔ جدید معاشرے کا ترقی یافتہ انسان اپنے فیصلے کی ذمہ داری کا بوجھ خود اُٹھاتا ہے۔ وہ اکیلا اپنے دُکھ اٹھاتا ہے اور اکیلا ہی اپنے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ جب اقتصادی، جذباتی اور نفسیاتی انحصار ختم ہو جاتا ہے تو پھر تنہائی کا چیتا گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا ہے۔ مصروف انسان کو اندر کی زندگی سیراب کرنے کے لیے نت نئے چشمے نکالنے پڑتے ہیں۔

> ''پھر امرد پرستی کا جنون چلتا ہے۔ ہم جنسوں کی شادیاں بھی قانونی ٹھہرتی ہیں۔ لوگ Punk بنتے ہیں۔ گروہی ناچ گانا، انفرمیشن، ٹیلی وژن، انٹرنیٹ، دوسرے ممالک کے سفر، مختلف ریاستوں میں مختلف قسم کی روزگار کی تلاش، اضطراب در اضطراب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں......'' (۸۵)

ترقی یافتہ معاشرے کا انسان، ترقی کی خاطر تمام مذہبی و اخلاقی اقدار کو روند ڈالتا ہے۔ پھر وہ روحانی اعتبار سے تنزلی کی انتہائی پستیوں میں گرتا چلا جاتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ پسماندہ ملک کا باشندہ جب ترقی یافتہ ملک میں پہنچتا ہے تو وہاں کی مادی ترقی اسے حیران کر دیتی ہے۔ اسے اپنا آبائی کلچر، اقدار و روایات، رسم و رواج سب فرسودہ نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ انہیں اپنی ترقی کے راستے میں حائل سمجھتا ہے۔ وہ جلد ہی اپنی پرانی اقدار کو خیر باد کہہ دیتا ہے تاکہ جلد سے جلد نئے نظام کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے وہ ترقی حاصل کر سکے۔ لیکن یہ اقدار جو اب اس کے لاشعور کا حصہ بن چکی تھیں، انہیں چھوڑتے ہوئے وہ کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس کی مذہبی و اخلاقی اقدار ہوتی ہیں اور دوسری طرف جدید معاشرے کی مادی اقدار۔ یہ صورتِ حال تصادم قدر کو جنم دے کر اسے ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کا شکار کر دیتی ہے۔

امریکہ میں بسنے والا مسلمان جب اپنے تشخص کی خاطر اور مذہبی اقدار کے مطابق پردے کا اہتمام کرتا ہے، اپنے

مذہبی احکامات کی پابندی کو اپنا شعار بنانا چاہتا ہے تو اس پر فنڈا منٹلسٹ اور دہشت گرد کی مہذب گالی کسی جاتی ہے۔ایک طرف اس کے مذہبی احکامات اور دوسری طرف مادہ پرست معاشرے کے تقاضے اور دباؤ سے وہ سخت ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔اکثریت اس سے خوفزدہ ہونے لگتی ہے۔وہ خود کو مضبوط کرنے کے لیے اقلیت کے اندر اقلیتی گروہ بنانے لگتا ہے۔ یہ ایسے گروہ ہیں جنہیں امریکی معاشرہ آسانی سے قبول نہیں کرتا۔حالانکہ وہ خود کو لبرل معاشرہ قرار دیتا ہے۔لیکن اس کے لبرل ازم میں تضاد موجود ہے۔وہ اتنا لبرل نہیں ہے کہ کسی دوسرے مذہب کے پیروکاروں کو آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی اقدار پر چلنے کی اجازت دے سکے۔وہ دل سے انہیں قبول نہیں کرتا اور ہمیشہ شک اور خوف کی نظر سے دیکھتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں اقلیتی گروہ کا عزتِ نفس کے ساتھ رہنا محال ہو جاتا ہے۔عدم مطابقت کا باعث وہ ذہنی دباؤ میں رہتا ہے اور وہ سکون،راحت وخوشی حاصل نہیں کرسکتا جس کی خاطر اس نے اپنے ملک سے ہجرت اختیار کی تھی۔

مصنّفہ کہتی ہیں کہ انسان بنیادی طور پر اطمینانِ قلب،سکون اور شانتی ہی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے لیکن وہ اسے مادی فوائد اور معاشی ترقی کے ساتھ منسلک کر دیتا ہے۔وہ اس کی خاطر ہجرت اختیار کرتا ہے لیکن حاصل گھاٹ پر اسے یہ روحانی دولت میسر نہیں آتی۔

بانو قدسیہ مذہب اور روحانیت میں انسانی دُکھوں کا علاج ڈھونڈتی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ مذہبی اور روحانی اقدار کی پاسداری ہی اطمینانِ قلب،سکون اور شانتی کا اصل سرچشمہ ہے۔وہ مادی ترقی کی بجائے روحانی ترقی کو انسان کی فلاح کا اصل نسخہ قرار دیتی ہیں۔

مصنّفہ کہتی ہیں کہ راحت ومسرت مادی ترقی کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔جو انسان اسے ترقی کے راستے کی منزل سمجھتے ہیں وہ بے راہروی کا شکار ہو کر بھٹک جاتے ہیں۔صرف وہی لوگ فلاح پانے والے ہوتے ہیں جو صبر کے ساتھ انتظار کرتے ہیں،جو ساری زندگی پُر امید رہتے ہیں اور راضی برضا ہو کر حکم ماننے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ اطاعت،فرمانبرداری،صبر،شکر،محبت اور امید کو اعلیٰ واَرفع اخلاقی اقدار سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ جو انسان ان اقدار کے حامل ہوتے ہیں وہی اطمینانِ قلب،سکون،شانتی اور راحت ومسرت کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔وہ لوگ جنہوں نے ان اقدار کو جھٹلایا وہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔

بانو قدسیہ کے فکر کی تشریح وتوضیح سورۃ العصر کے ذریعے ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۳۶

۲۔ ایضاً، ص ۶۰-۶۱

۳۔ ایضاً، ص ۶۱

۴۔ ایضاً، ص ۳۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۶۔ ایضاً، ص ۲۷۲

۷۔ ایضاً، ص ۲۷۳

۸۔ ایضاً، ص ۴۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۳-۲۰۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۱۸۔ ایضاً،ص۱۶۶

۱۹۔ ایضاً،ص۱۷۱

۲۰۔ ایضاً،ص۱۶۹-۱۷۰

۲۱۔ ایضاً،ص۱۶۸-۱۶۹

۲۲۔ ایضاً،ص۸۰-۸۱

۲۳۔ ایضاً،ص۸۰

۲۴۔ ایضاً،ص۳۱۳

۲۵۔ ایضاً،ص۳۰-۳۲

۲۶۔ ایضاً،ص۴۳

۲۷۔ ایضاً،ص۱۷-۱۸

۲۸۔ ایضاً،ص۲۱۶

۲۹۔ ایضاً،ص۲۲۴

۳۰۔ ایضاً،ص۲۴۴-۲۲۵

۳۱۔ ایضاً،ص۲۹۸-۲۹۹

۳۲۔ ایضاً،ص۲۰۶-۲۰۷

۳۳۔ ایضاً،ص۲۱۱

۳۴۔ ایضاً،ص۲۰۸-۲۰۹

۳۵۔ ایضاً،ص۴۳

۳۶۔ ایضاً،ص۹۷

۳۷۔ ایضاً،ص۸۹

۳۸۔ ایضاً،ص۹۲-۹۳

۳۹۔ ایضاً،ص۲۷۹

۴۰۔ ایضاً،ص۷٦

۴۱۔ ایضاً،ص۷۷

۴۲۔ ایضاً،ص۷۸

۴۳۔ ایضاً،ص۷۷

۴۴۔ ایضاً،ص۳۲٦-۳۲۷

۴۵۔ ایضاً،ص۳۳۴

۴٦۔ ایضاً،ص۳۳٦

۴۷۔ ایضاً،ص۳۳۲-۳۳۳

۴۸۔ ایضاً،ص۱۴٦

۴۹۔ ایضاً،ص۱۹۸-۱۹۹

۵۰۔ ایضاً،ص۴۷

۵۱۔ ایضاً،ص۴۸-۵۱

۵۲۔ ایضاً،ص۲۷۰

۵۳۔ ایضاً،ص۱۹۸

۵۴۔ ایضاً،ص۲۸۹

۵۵۔ ایضاً،ص۸۳-۸۴

۵٦۔ ایضاً،ص۱۴۳-۱۴۴

۵۷۔ ایضاً،ص۱۵۳

۵۸۔ ایضاً،ص۱۴۰-۱۴۲

۵۹۔ ایضاً،ص۱۵۴

٦۰۔ ایضاً،ص۱۴۸

٦۱۔ ایضاً،ص۱٦۱

٦۲۔ ایضاً،ص۱٦۳-۱٦۴

۶۳۔ ایضاً،ص۸۲

۶۴۔ ایضاً،ص۸۳

۶۵۔ ایضاً،ص۱۲۹

۶۶۔ ایضاً،ص۱۳۰

۶۷۔ ایضاً،ص۱۳۱

۶۸۔ ایضاً،ص۱۹۱

۶۹۔ ایضاً،ص۲۳۹

۷۰۔ ایضاً،ص۲۴۰

۷۱۔ ایضاً،ص۲۲۱

۷۲۔ ایضاً،ص۲۵۰

۷۳۔ ایضاً،ص۲۵۵

۷۴۔ ایضاً،ص۲۸۹

۷۵۔ ایضاً،ص۲۸۹-۲۹۰

۷۶۔ ایضاً،ص۲۹۰-۲۹۱

۷۷۔ ایضاً،ص۳۰

۷۸۔ ایضاً،ص۳۳۱

۷۹۔ ایضاً،ص۳۳۳

۸۰۔ ایضاً،ص۱۶۷

۸۱۔ ایضاً،ص۸۴-۸۵

۸۲۔ ایضاً،ص۸۷

۸۳۔ ایضاً،ص۹۰

۸۴۔ ایضاً،ص۲۹۲

۸۵۔ ایضاً،ص۸۱

باب پنجم

مجموعی جائزہ

پچھلے ابواب میں اقدار کی شکست وریخت کے حوالے سے بانو قدسیہ کے تینوں ناول،''شہرِ بے مثال''، ''راجہ گدھ'' اور'' حاصل گھاٹ'' زیرِ بحث لائے گئے۔ ان تینوں ناولوں کے تناظر میں اِقدار کی اہمیت، فرد اور معاشرے پر اِن کے اثرات، تصادمِ قدر کی صورتِ حال، شکستہ قدروں اور قدروں سے عاری فرد اور معاشرے کے بارے میں بانو قدسیہ کے نظریات کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

تینوں ناولوں کے تحقیقی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بانو قدسیہ اقدار کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ہر معاشرتی گروہ مخصوص اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد اِن اقدار کو شعوری اور لاشعوری طور پر تسلیم کر کے اسے اپنی فطرت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ ایک بڑے معاشرے کے اندر چھوٹے چھوٹے معاشرتی گروہ لسانی، نسلی اور طبقاتی بنیادوں پر وجود میں آتے ہیں۔ ان معاشرتی گروہ کے افراد جب اپنے حلقے اور دائرۂ کار سے باہر نکلتے ہیں تو دوسرے گروہوں کے ساتھ ان کی اقدار ٹکراتی ہیں۔ بعض دفعہ یہ منفی اثرات کا حامل ہوتا ہے اور کبھی یہ ٹکراؤ مثبت نتائج لے کر آتا ہے۔

دیہات اور شہر کا ماحول بھی الگ الگ اقدار و رسم و رواج کو ترویج دیتا ہے۔ دیہات میں پرورش پانے والا فطری طور پر شہری سے مختلف رویوں اور رُجحانات کا اظہار کرتا ہے۔

''شہرِ بے مثال'' میں بانو قدسیہ نے ایسے ہی دو معاشرتی گروہوں کی اقدار کے تصادم کو موضوع بنایا ہے۔ دیہات کی فطری سادگی، معصومیت اور تحیر جب شہر کی جدت، ذہانت اور ہوشیاری سے ٹکراتا ہے تو ترقی کی خواہش میں دیہات سے آئے ہوئے افراد کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ جدید معاشرے کی شہری اقدار انہیں احساس دلاتی ہیں کہ ان کی اقدار فرسودہ اور ناکارہ ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک اپنے پرانے نظامِ اقدار پر ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔

''حاصل گھاٹ'' میں بھی بانو قدسیہ کم و بیش یہی نظریہ پیش کرتی ہیں کہ ہر ملک اور معاشرہ اپنی تہذیبی و اخلاقی اقدار کا سرمایہ رکھتا ہے۔ جب تک کوئی فرد اپنے ملک میں اپنی اقدار و ثقافت کے ساتھ رہتا ہے، وہ احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہ اپنا ملک چھوڑ کر ترقی یافتہ ملک کا رُخ کرتا ہے تو وہاں کی مادی ترقی اسے انگشت بدنداں کر دیتی ہے۔

اسے اپنا معاشرتی نظام، رہن سہن، اقدار و روایات سب فرسودہ اور ترقی کی دشمن نظر آنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک کر کے اپنی شناخت کے یہ تمام عناصر کھو دیتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ ہر معاشرتی گروہ اور تہذیب کا اپنا تشخص ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی اقدار کو چھوڑ کر دوسرے نظامِ اقدار کو اپناتا ہے تو وہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔ تہذیبی شناخت کا گم ہو جانا قوم کے لیے نفسیاتی و روحانی اور بقا کے مسائل کا باعث بنتا ہے۔ ''شہرِ بے مثال'' اور ''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ یہی خیال پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

''شہرِ بے مثال'' میں ایک فرد ہجرت کے عمل سے گزر کر دیہات سے شہر کی جانب آتا ہے اور اپنی اقدار و روایات اس کی نظروں میں فرسودہ ہو جاتی ہیں، جبکہ ''حاصل گھاٹ'' میں پورا مشرقی معاشرہ ہجرت کے عمل سے گزرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہاں بانو قدسیہ مشرقی سوچ کا مغربی طرزِ فکر میں ضم ہونے کا المیہ بیان کرتی ہیں:

> ''آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔ امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں۔ ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے۔ حتیٰ کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں۔''(۱)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مشرق نے مغرب میں ضم ہونے کی جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں، ان کا انجام اندوہناک ہو گا۔ مشرق اور مغرب کا تضاد دراصل اقدار کا تضاد ہے۔ وہ کہتی ہیں:

> ''مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلدادہ ہے۔ مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے، مغرب میں ابھارنے کا......
>
> یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ......
>
> دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے......اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش بھی کی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی......پھر شرمندگی، احساسِ گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہو گا اور مشرقی لوگ۔''(۲)

ان دونوں ناولوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بانو قدسیہ سمجھتی ہیں کہ شخصی اور قومی تشخص کا انحصار

اِقدار پر ہے۔تہذیبی وثقافتی اوراخلاقی ومذہبی اقدار ہی کسی شخص،قوم اور معاشرے کی شناخت ہوا کرتی ہیں۔اگر وہ ان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں تو نہ صرف شخص بلکہ پورا معاشرہ اپنا قومی تشخص کھو بیٹھتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی کے حصول کے لیے اتنی بڑی قیمت چکانا نہ تو انفرادی سطح پر فرد کو راس آتا ہے اور نہ ہی اجتماعی سطح پر معاشرہ ہی اس کا متحمل ہوسکتا ہے۔

''کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کیا ترقی کی اس قدر قیمت ادا کرنا درست ہے؟ کیا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے قرضوں کی طرح معمولی انسان بھی صرف تبدیلی کی قسطیں ادا کرتا فوت ہو جائے گا......نہ ترقی حاصل کر پائے گا، نہ فلاح......نہ حال کی ترقی اس کی ہوگی، نہ مابعد کی۔ہم کیوں نہیں جان سکتے کہ انسان کلی طور پر کبھی بھی مادیت میں ضم نہیں ہوسکتا۔ غالباً یہ مشیّت کی منشا بھی نہیں......''(۳)

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ انفرادی سطح پر فرد کے کردار کی تعمیر وتشکیل اور اجتماعی سطح پر معاشرتی توازن واستحکام اور ترقی میں اقدار اہم کردار ادا کرتی ہیں۔بانو قدسیہ نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کیے ہیں ان کے حوالے سے وہ کہتی ہیں کہ کردار کی عظمت اور زوال کا انحصار مثبت اقدار کی پختگی اور کمزوری پر ہے۔

ظفر کے کردار (شہرِ بے مثال) کے ذریعے بانو قدسیہ نے اخلاقی وروحانی اقدار کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ایک مستحکم ومتوازن شخصیت کا نمونہ ہمارے سامنے لا کر وہ یہ بتاتی ہیں کہ مثبت اقدار کا سہارا انسان کو ہر طوفان سے نپٹنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔اس کی پختہ اقدار کسی خوف اور دباؤ کو قبول کیے بغیر اس کے ارادوں کو مضبوطی اور حوصلوں کو بلندی عطا کرتی رہیں۔اپنی اقدار پر اس کا ایمان ہی اس کے استقلال کا باعث بنا۔اس کردار کے ذریعے بانو قدسیہ یہ پیغام دیتی ہیں کہ اخلاقی اقدار کی بنیادیں اگر پختہ ہوں تو وہ ذات کو کلیت عطا کر کے اسے رفعتوں سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ظفر کی اقدار نے اسے جو صراطِ مستقیم دکھایا اس پر چل کر وہ ذہنی وروحانی ارتقاء حاصل کرتا ہے۔

بانو قدسیہ کا ظفر کی نسبت عظیم ہستیوں سے قائم کرنا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اخلاقی قدریں ہی وہ معیار ہیں جن پر کردار کی عظمت کو پَرکھا جاسکتا ہے۔رشو کے کردار کے ذریعے بانو قدسیہ نے کردار کی ناپائیداری اور بودے پن کے نتائج کو بیان کیا ہے۔اقدار کی ناپختگی نے رشو کے رویوں اور رُجحانات کو ناہموار بنا دیا تھا۔مذہب اخلاقی اقدار کی وجہ سے وہ قوتِ فیصلہ اور ارادوں کی استقامت سے محروم ہو چکی تھی۔

رشو کے کردار کے حوالے سے بانو قدسیہ تصادمِ قدر سے جنم لینے والی ذہنی و روحانی ٹوٹ پھوٹ کے اثرات کو بیان کرتی ہیں۔ رشو کی ذہنی ونفسیاتی کشمکش نے اسے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ schizophrenia کی مریضہ بن جاتی ہے۔ اپنی اقدار سے کٹ جانے کی سزا اسے معاشرتی تنہائی، پچھتاوے اور نفسیاتی بیماریوں کی صورت میں ملتی ہے۔

قیوم (راجہ گدھ) کو بانو قدسیہ نے روحانی واخلاقی اقدار کے زوال کا استعارہ بنایا ہے۔ مردار خوری کو حرام فعل قرار دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں حرام اور حلال کا امتیاز ختم ہو کر مردار خوری انسانی فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ روح اور جسم دونوں کا حرام کھا رہا ہے اور نتیجے میں ذہنی ونفسیاتی بیماریوں کی دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔

بانو قدسیہ رزقِ حرام کو انسان کی جسمانی و ذہنی اور روحانی پراگندگی کا سبب قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ موجودہ عہد میں انسانی روح کا اضطراب اور ذہنی وفکری انتشار اسی ایک منفی فعل کے اثرات ہیں۔

سیمی کی شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کو وہ شکستہ قدروں کا شاخسانہ قرار دیتی ہیں۔ سیمی بچپن سے محرومی کا شکار رہی ہے۔ اس کے خاندان کی منفی اقدار نے اس کی شخصیت کو غیر متوازن بنا دیا تھا۔ لاحاصل آرزوؤں کے تعاقب میں وہ ساری زندگی بھٹکتی رہی۔ بانو قدسیہ کا کہنا ہے کہ لاحاصل آرزوؤں کے حصول کے لیے انسان ہمیشہ غلط راستوں کا انتخاب کرتا ہے، یہی غلط راستے اس سے غلط اور صحیح کی تمیز بھی چھین لیتے ہیں۔

سیمی اور قیوم کا ناجائز جسمانی تعلق، سیمی کی محبت کے لیے تڑپ اور اس شدید جذبے کے سامنے ساری اخلاقی اقدار کو بھلا دینا، عابدہ کا بچے کی خواہش میں قیوم کے ساتھ حرام تعلق اور امتل کی ساری زندگی مردار خوری کی کہانیاں ہیں۔ راجہ گدھ کے کم وبیش تمام کردار حرام فعل کے مرتکب ہوئے۔ ان سب کی زندگیوں میں اضطراب، بے چینی، تنہائی، فکری انتشار اور روحانی کرب اِسی منفی قدر کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ عشقِ لاحاصل، لامتناہی تجسّس اور موت کی آگہی انسانی روح کے ایسے آزار ہیں جو ہمیشہ اسے کربناک رکھتے ہیں۔ یہ تینوں انسانی ذہن کے ارتقاء اور شعور و آگہی کے باعث بن سکتے ہیں لیکن صرف اُسی صورت میں جب انسان روحانی و اخلاقی اقدار کا حامل ہو۔ مصنّفہ کہتی ہیں کہ منفی اقدار کی آمیزش سے انسانی قوتیں ہلاکت خیزی کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ انسان یا تو اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے یا انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

''حاصل گھاٹ'' میں مصنّفہ نے مشرقی اور مغربی اقدار کے تضاد کو دِکھا کر بتایا ہے کہ مشرقی اقدار، جو مذہب اور اخلاقیات سے اخذ کی گئی ہیں، انسان کے اندر مثبت خصائص کو جگا کر اس کے سیرت و کردار کو عظمتوں سے ہمکنار کرتی ہیں۔

''حاصل گھاٹ'' کا مرکزی کردار صبر، اطاعت اور فرمانبرداری کی روحانی اقدار کو اپنا کر حقیقی مسرت اور راحت وسکون حاصل کرتا ہے۔

بانو قدسیہ ''حاصل گھاٹ'' میں روحانی واخلاقی اقدار اور مادی اقدار کا موازنہ کر کے انسانی شخصیت اور اس کی ذہنی وجذباتی زندگی پر ان کے اثرات کا تقابلی جائزہ لیتی ہیں۔ وہ ہمارے سامنے یہ نتیجہ رکھتی ہیں کہ مادی اقدار جو ترقی یافتہ معاشرے کی ضرورت بن چکے ہیں، انسان کو تنہائی سے دوچار کر کے اس کی جذباتی اور روحانی زندگی کو بنجر بنا رہی ہیں۔

بانو قدسیہ نے ہجرت کے حوالے سے اقدار کی شکست وریخت کے المیے کو ''حاصل گھاٹ'' میں بیان کیا ہے۔ مصنّفہ کا کہنا ہے کہ مشرق اپنی روحانی واخلاقی اقدار کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار ہو رہا ہے۔ امریکی معاشرہ جسے مادی ترقی کی علامت سمجھا جا رہا ہے، روحانی واخلاقی قدروں سے دامن چھڑا کر مکمل طور پر مادی اقدار کو اپنا چکا ہے کیونکہ یہ ترقی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔ مشرقی لوگ جب ترقی کی خاطر امریکہ کا رُخ کرتے ہیں تو ان کو اپنی اخلاقی اور مذہبی اقدار ترقی کے راستے میں حائل نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی سماجی اقدار کو اپنے لیے باعثِ شرم محسوس کرتے ہوئے جلد ہی ان سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ آزادی اور محنت کی قدر کو اپنا کر ترقی تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن جذباتی اور روحانی زندگی میں وہ تنِ تنہا رہ جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مشرقی باشندہ جب اپنی اقدار وروایات کو چھوڑ کر امریکی طرزِ زندگی کو اپنا لیتا ہے تو تبدیلی کا یہ عمل اس کے لیے زیادہ دیر تک خوشی کا باعث نہیں بن سکتا۔ کام کی خاطر اور آزادی کی طلب میں رشتے ناطے اور تعلقات ختم ہونے لگتے ہیں۔ انسان کے درمیان ذہنی وجذباتی فاصلے بڑھنے لگتے ہیں۔ اس کی زندگی میں محبت کا جو خلا پیدا ہو جاتا ہے اُسے پُر کرنے کے لیے وہ بے راہروی کا شکار ہوتا ہے۔ منشیات کا استعمال شروع کرتا ہے اور ہم جنسیت میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن افسوس، اسے کہیں بھی ذہنی آسودگی اور قلبی اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ فرد کے لیے اخلاقی وروحانی اقدار کو چھوڑ کر مادی اقدار اپنانے کا عمل خسارے کا باعث بنتا ہے۔

بانو قدسیہ فرد کے لیے حقیقی مسرت، راحت وسکون اور شانتی مذہبی اقدار میں تلاش کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ مذہب ہی انسان کی فلاح کا اصل راستہ ہے۔ روح کبھی بھی مادی ترقی کے راستے پر چل کر سکون اور مسرت کی منزل پر نہیں پہنچ سکتی۔ بانو قدسیہ مذہبی اور روحانی اقدار کی طاقت کو تسلیم کرتی ہیں۔ راجہ گدھ میں وہ روحانی پہلوؤں کو سامنے لاتی ہیں۔

اور خدا کے فضل، اس کی رحمت اور خاص عنایت کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ سیمی کے اندر عرفان کی کھڑکیوں کو کھلتے ہوئے دکھاتی ہیں اور آخر میں افراہیم کا کردار، روحانیت پر اُن کے اعتقاد کو ظاہر کرتا ہے۔

بانو قدسیہ ''راجہ گدھ'' میں جہاں انسان کو اخلاقی و روحانی پستیوں میں گرا ہوا دکھاتی ہیں وہاں وہ انسان کی روحانی بلندیوں کے امکانات کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ یہاں وہ انسان کی ظاہری تبدیلی کے عمل سے آگے بڑھ کر اس کی قلب ماہیت کو دِکھاتی ہیں۔ سیمی کے عشق کی سچائی اور شدت اسے عرفان و آگہی کی منزلوں تک لے جاتی ہے۔ سیمی کے کردار سے مصنّفہ اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ محبت کی مثبت قدر نے سیمی کے مثبت کرداری خصائص کو اُجاگر تو ضرور کیا لیکن اس کی منفی اقدار نے اس کی تمام خوبیوں کو نِگل لیا۔

بانو قدسیہ عورت اور مرد کو مختلف اخلاقی اقدار کا امین سمجھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فطرتی و حیاتیاتی تقاضے سے عورت پرورش کی ضامن ہے اور مرد کفالت کا۔ جب عورت اپنے اس فطرتی اور حیاتیاتی مقصد اور فرض سے انحراف کرتی ہے تو اس کی روح نا آسودگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ جدید معاشرے کی عورت اپنے فطرتی مقصد کو بھلا کر اپنی شناخت کی تلاش کے سفر پر نکل کھڑی ہوئی ہے۔ وہ پرورش کی ضامن نہیں رہی، بلکہ آزادی کی طلبگار ہو چکی ہے۔ مصنّفہ کہتی ہیں کہ آزادی کے نعرے نے عورت کے روایتی کردار کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ اس نے آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن یہ اپنے ساتھ ذہنی دباؤ، فرسٹیشن اور ڈیپریشن جیسی بیماریاں لے کر آئی ہے۔ کیونکہ عورت اپنے فطری تقاضوں کو پورا کیے بغیر خوشی حاصل نہیں کر سکتی۔

دوسری طرف مرد نے کفالت کی ذمہ داری کو عورت کے ساتھ بانٹ لیا ہے۔ اس کی ذات کا فخر و غرور اور عزت و افتخار اس کے ساتھ ہی جاتے رہے ہیں۔ روحانیت اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں سے انحراف نے ان دونوں کے تشخص کو برباد کر دیا ہے۔ عورت میں اب وفا، ایثار و قربانی اور شفقت کی اقدار ختم ہو گئی ہیں اور مرد میں استقامت، جرأت، ارادے کی پختگی اور کفالت کی اقدار عنقا ہو گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان پائیدار تعلق کی اساس ختم ہو چکی ہے۔

بانو قدسیہ سمجھتی ہیں کہ مذہبی اقدار کی طرف رجوع انسان کے مسائل کا بوجھ کم کر سکتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مذہب اور اخلاقیات نے عورت اور مرد کے لیے جو الگ الگ اقدار متعیّن کر دی ہیں، اسی میں ان کی فلاح کا تصور موجود ہے، اپنی اقدار کو اپنا کر وہ اطمینانِ قلب، سکون اور شانتی پا سکتے ہیں۔

بانو قدسیہ محبت کو انسانیت کی سب سے بڑی قدر تسلیم کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ آج کا جدید عہد محبت کی بجائے

آزادی کا طلب گار ہے۔ آزادی کی خواہش نے انسانی تعلقات میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ معاشرہ جس رفتار سے ترقی کی طرف بڑھ رہا ہوگا اُسی نسبت سے تعلق کا خاتمہ ہو رہا ہوگا۔ مادی ترقی کے ساتھ آزادی کی قدر وابستہ ہے اور روحانیت کے ساتھ محبت کی قدر پرورش پاتی ہے۔ محبت کی قدر نے ختم ہو کر ہوس کو جنم دیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو استعمال کر کے ٹشو پیپر کی طرح پھینک رہے ہیں۔ محبت کی اس کمی سے انسان کی روح پیاسی ہے۔ اسے کہیں سکھ چین نصیب نہیں ہو رہا۔ تعلق کے خاتمے اور محبت کی کمی سے نفسیاتی امراض بڑھ رہے ہیں، منشیات کے استعمال، خودکشی کی شرح، شکستہ خاندانوں کی تعداد اور جنسی بے راہروی میں اضافہ کا گراف دن بدن اونچا ہو رہا ہے۔

بانو قدسیہ انسان کی حقیقی مسرت اور راحت وسکون کے لیے مادی ترقی کی بجائے فلاح کا راستہ تجویز کرتی ہیں۔ وہ مذہب کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے زندگی میں ان کی عملداری کے حق میں بھرپور دلائل اور تجزیوں سے کام لیتے ہوئے ہمارے سامنے یہ نتیجہ رکھتی ہیں کہ حقیقی تعلق، جو سچی محبت سے پیدا ہوتا ہے، انسانی دُکھوں کا اصل مداوا ہے۔ لیکن یہ تعلق آزادی کو سلب کرنے والا نہیں بلکہ غلامی میں آزادی کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ صبر روحانی قوتوں کو تیز کرتا ہوا انسان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب سے مالا مال کرتا ہے۔

بانو قدسیہ اطاعت اور فرمانبرداری کو اعلیٰ اخلاقی قدر گردانتے ہوئے انسانی کردار کی تشکیل اور ذہنی تربیت میں اس کی ضرورت کو ناگزیر قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ انسانی کردار کو روحانی سطح پر رفعتوں اور عظمتوں سے ہمکنار کر دینے والی سب سے بڑی قدر ''مان لینا'' ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اختیار کو منفی اور ابلیسی صفت قرار دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فیصلے کا اختیار انسان کو ذہنی و روحانی کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح لاینحل سوالات کی خاطر بے نشان منزلوں کا سفر انسانی روح کو تھکا دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں ایسی صورت میں جاننے کی بجائے ماننا روح کی آسودگی کا باعث بنتا ہے...... وہ کہتی ہیں کہ جاننے سے پہلے حکم سن کر مان لینا ایسی روحانی صفت ہے جو انسان کو خدا کا محبوب بنا دیتی ہے۔ یہی صفت انسانی تعلقات کی استواری کا بھی واحد طریقہ ہے۔

بانو قدسیہ نے ''راجہ گدھ'' اور ''حاصل گھاٹ'' میں روحانی و اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشروں کو موضوع بنایا ہے۔ ''راجہ گدھ'' میں پاکستانی معاشرہ اور ''حاصل گھاٹ'' میں امریکی معاشرے کی روحانی و اخلاقی قدروں کے زوال کو بیان کرتی ہیں۔

''راجہ گدھ'' میں وہ معاشرے کے پست تصورِ اخلاق، طبقاتی امتیاز، منافقانہ مذہبی اقدار پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔ وہ

کہتی ہیں کہ جدید معاشرے میں محبت کی جگہ ہوس نے لے لی ہے۔لوگ محبت طلب کرنے کی بجائے حقوق طلب کرنے لگے ہیں جس سے معاشرے میں نفسانفسی اور مفاد پرستی بڑھ رہی ہے۔زوال پذیر شہری معاشرہ میں مادیت پرستی بڑھنے سے مذہب اوراخلاقیات کی حقیقی شکل بگڑ گئی ہے۔معاشرہ تضادات کی لپیٹ میں ہے۔ایسے معاشرے میں پرورش پانے والے افراد ذہنی کشمکش،تضادات اور فکری پراگندگی کا ورثہ حاصل کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی اقدار نئی نسل تک منتقل نہیں ہو رہیں۔نتیجہ میں اقدار سے کٹی ایسی نسل سامنے آ رہی ہے جو تخلیقی رویوں اور آدرشی زندگی کے نصب العین سے عاری ہے۔یہ نسل معاشرے کی تعمیر میں فعّال کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ مادہ پرست معاشرے کی سب سے بڑی منفی صفت حرص ہے۔اس ایک حرص کی بنا پر معاشرہ کئی طرح کی اخلاقی برائیوں کا شکار ہو رہا ہے۔حرص و ہوس نے آج کے انسان کو لاحاصل آرزوؤں اور خواہشوں کی تمنا میں دیوانہ بنا دیا ہے۔وہ ان کے تعاقب میں ہر جائز و ناجائز راستے پر چلتا رہتا ہے۔اس کی ہر قدر مادی ہو جاتی ہے۔حرام اور حلال کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔وہ کہتی ہیں کہ مردار خوری کی عادت ایسے معاشرے میں جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر مثبت عمل بھی منفی سمت اختیار کر لیتا ہے۔ہلاکت خیزی ایسے معاشرے میں پروان چڑھتی ہے اور انسان خود ہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیتا ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر معاشرے میں شکستہ خاندانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگتی ہے۔روایتی خاندانی اقدار کا زوال خاندانی اکائی کو بُری طرح متاثر کرتا ہے۔ایسے خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے ذہنی و نفسیاتی طور پر معذور ہو جاتے ہیں۔''سیمی'' ایک ایسا ہی کردار ہے جو شکستہ خاندانی زندگی کا شکار ہوا۔وہ غیر متوازن شخصیت کے باعث خودکشی کی مرتکب ہوئی۔وہ کہتی ہیں،اخلاقی لحاظ سے بنجر معاشرے میں پرورش پانے والے حسّاس اور ذہین انسان خود کو ذہنی و جسمانی شکست وریخت سے نہیں بچا سکتے۔

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ مادی ترقی کے کمال پر پہنچے ہوئے امریکی معاشرے کی اخلاقی و روحانی کج روی کو بے نقاب کرتی ہیں۔یہ ناول مشرقی معاشرے کو خبردار کرنے والی ایک آواز ہے۔وہ مشرق کو تنبیہ کرتی ہیں کہ اگر انہوں نے مادی ترقی کی خاطر اپنی اخلاقی و روحانی اقدار کو نظرانداز کر دیا تو اس کا انجام بہت بھیانک ہوگا۔

وہ کہتی ہیں کہ مادی ترقی کے حصول کی خاطر کی گئی ہجرت کا حاصل گھاٹ ہمیشہ تنہائی اور پچھتاوے کا روگ ہوتا ہے۔

''حاصل گھاٹ'' خبردار کرنے والی آواز کے ساتھ فلاح کی طرف بلاوا بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مغربی اور امریکی معاشرہ مادی ترقی کی خواہش میں روحانی واخلاقی قدروں کو روندتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ اب اس کی ہر قدر مادی ہو چکی ہے۔ زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کے بعد اپنی من مانی کو شعارِ زندگی بنا کر محبت، وفا، ایثار و قربانی، درگزر اور شرم وحیا جیسی اقدار وہ ترک کر چکے ہیں۔ اگر مشرقی معاشرہ بھی مادی ترقی کی خاطر ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتا ہے تو اسے اپنے طرزِ فکر واحساس، نظامِ زندگی، تہذیب وثقافت اور اقدار وروایات کی قربانی دینا پڑے گی۔ لیکن اسے علم ہونا چاہیے کہ اپنا تشخص کھو کر وہ کبھی بھی روحانی وقلبی سکون حاصل نہیں کر سکے گا اور دوسری طرف جس مادی ترقی کو وہ حاصل کرے گا وہ بھی ادھوری ہوگی۔ مذہب اور اخلاقیات کی ہر قید سے آزاد مادی ترقی اس کی روح کے لیے کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ فطرتاً مکمل طور پر مادیت میں ضم نہیں ہوسکتی۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں کہ انسان کی اصل تلاش، اطمینانِ قلب، سکون اور شانتی کے لیے ہے لیکن یہ اس کی بھول ہے کہ وہ اسے مادی ترقی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ مادی ترقی کو رَد کرتے ہوئے روحانی ترقی کو شرفِ انسانیت سمجھتے ہوئے، اس طرف دھیان دینے کی تلقین کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ فلاح کا راستہ ہی انسان کو اطمینانِ قلب اور راحت وسکون کی منزل پر لے جا سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی احکامات کو سر جھکا کر مان لینے اور صبر سے راضی برضا ہونے میں ہی انسان کی فلاح پوشیدہ ہے۔ وہ اسے فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی قرار دیتی ہیں۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بانو قدسیہ انسانیت کی فلاح کے لیے مادی ترقی کو یکسر رَد کر کے مذہب اور روحانیت کی طرف رجوع کرتے ہوئے مذہب کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہیں جو دنیاوی ترقی کے لیے انسانی کوششوں کی رہنمائی کر کے اسے مادی ترقی پر اُبھارتے ہیں۔

وہ اختیار کو ابلیسی صفت قرار دے کر اسے مطلق منفی قدر قرار دے دیتی ہیں۔ وہ ذہنی ارتقاء اور کردار کی پختگی میں ''اختیار'' کی مثبت اہمیت کو بالکل نظر انداز کر کے مجہولیت کا درس دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بانو قدسیہ ذہنی آزادی سے انکار کرتی ہیں جس سے دانشورانہ فضا میں گھٹن پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ وہ بزرگی کو ذہانت پر ترجیح دیتی ہیں۔ حالانکہ جتنی بھی ذہنی، علمی اور سائنسی ترقی ہوتی ہے اس کی بنیاد اس وقت تک کے موجود

تمام علم کی نفی یا جز دی نفی پر ہوتی ہے۔

وہ حضرت آدمؑ اور اِبلیس کی کہانی سے فلسفۂ اختیار کی منفی حیثیت تو اخذ کرتی ہیں لیکن ابلیس کے انکار کی مثبت اہمیت کو ماننے سے انکار کر دیتی ہے۔ بانو قدسیہ پرکھوں اور بزرگوں کی عقل، علم اور تجربے کے سامنے مان لینے کی قدر کو اہمیت دے کر تخلیقی فکر اور ذہنی اُپج کا راستہ بند کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

رزقِ حرام کی تھیوری پیش کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ رزقِ حرام جب ایک دفعہ انسانی جینز کو متاثر کر دیتا ہے تو پھر اس کے اثرات نسل در نسل چلتے ہیں۔ یہاں وہ منفی قدروں کے اثرات کو مثبت قدروں کی قوت پر حاوی ہوتے ہوئے دکھاتی ہیں۔ اور انسان کے انفرادی اعمال کو ثانوی حیثیت دے دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں باپ دادا کے گناہوں کی سزا کسی معصوم کو مل سکتی ہے۔

بانو قدسیہ جینز کی Mutation کا نظریہ تو پیش کرتی ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں وہ کوئی ایسا نسخہ تجویز نہیں کرتیں جو مذہب اور روحانیت کے تناظر میں، انسانی نسلوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے نسلِ انسانی کو رزقِ حرام کے اثرات سے باہر نکال سکے۔ اس کے برعکس وہ افراہیم (راجہ گدھ) کا کردار سامنے لاتی ہیں، جس کے باعث روحانیت کی طرف ان کا جھکاؤ عمل کی معنویت کو ختم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''حاصل گھاٹ'' میں بانو قدسیہ مثالیت کا شکار نظر آتی ہیں۔ وہ مشرق میں سب اچھا ہے، کے فلسفے کا پرچار کرتے ہوئے مغربی فکر، طرزِ احساس اور اقدار و روایات کو مادی کہہ کر اخلاقی زوال کا باعث قرار دیتی ہیں۔ وہ مشرقی فکر کی اس حد تک پرستار ہیں کہ معاشرتی انصاف، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی قابلِ قدر اقدار کو بھی یہ کہہ کر درخورِ اعتنا نہیں سمجھتیں کہ ان کی بنیاد شخصی محبت کی بجائے غیر شخصی ہمدردی اور مفاد پرستی پر مبنی ہے۔

وہ اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین کرتے ہوئے اس کے منفی پہلوؤں سے آنکھ بچا جاتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشرق کے اکثر ممالک میں زندگی کا رویہ آمرانہ اور حاکمانہ ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ جابرانہ شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے پسِ پشت وہ مشرقی طرزِ فکر ہے جس میں ہمیشہ اطاعت کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ اطاعت خدا سے شروع ہو کر حاکمِ وقت تک کے لیے درست سمجھی جاتی ہے۔ اور اِن دونوں کے درمیان باپ، شوہر اور بزرگوں کی اطاعت کو یقینی بنایا جاتا ہے۔

مشرقی فلسفۂ فکر میں بزرگوں اور پرکھوں کی عقل، علم اور تجربے کی نفی سے روکا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ بھی اسی فکر کو

اپنے ناول میں جگہ دیتی ہیں۔ وہ جاننے سے پہلے ''مان لینے'' کو افضل ترین رویہ سمجھتی ہیں۔ لیکن اس میں یہ قباحت نظر آتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کسی سوچ اور نظام کی پابندی کرنا اور اس کے سامنے سر جھکا دینا تخلیقی فکر اور ذہنی اُپج کی راہیں مسدود کرنے کے مترادف ہوگا۔

بانو قدسیہ کی فکر پر خانقاہی فکر وفلسفہ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کے متوازن ارتقاء کا تصور موہوم ہے۔ وہ روحانی ارتقاء کی تبلیغ کرتے ہوئے مادی ترقی کو جملہ گناہوں میں شمار کر لیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں مادہ و روح اور مشرق ومغرب کے امتزاج سے تخلیق پانے والی توانا زندگی کی روح نظر نہیں آتی۔

بانو قدسیہ فلاح وترقی کے ملاپ سے جنم لیتا ہوا کوئی ایسا متوازن نقطۂ نظر سامنے نہیں لاتیں جو مشرق کے مادی زوال اور فکری پس ماندگی کو کم کر کے، روحانی اقدار کے ساتھ مادی ترقی کی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے بالغ نظری اور عزم وحوصلہ عطا کر سکے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلاح اور ترقی کے درمیان کوئی وسطی راستہ موجود ہے؟ کیا انسان اس دنیا میں تضادات کے درمیان پنڈولم کی طرح ہی گھومتا رہے گا؟ وہ تضاد جو اس کی ذات میں روزِ ازل رکھ دیا گیا تھا، کیا اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ موجود ہے؟ اس دنیا میں انسان کی ساری تگ ودو، اس کی فکری کاوشیں، صوفی نظریات، فلسفیانہ موشگافیاں اور مذہبی نظامِ فکر، اسی دوئی کے تضاد کو حل کر کے ابدی خوشی کی تلاش کا سفر ہے۔ بانو قدسیہ بھی اسی راستے کی ایک مسافر ہیں۔

مجموعی طور پر بانو قدسیہ کی فکر کا احاطہ کیا جائے تو ایک بڑے لکھاری کی طرح زندگی، معاشرے اور اِقدار کے بارے میں ان کے ہر ناول میں غور وفکر کی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے ہاں تلاش کا سفر بھی موجود ہے اور عرفان وآگہی کی منزلیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے فکری اور قلبی تجربے سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جن سے اختلاف واتفاق کی دونوں صورتیں موجود ہیں اور ایک بڑے فن پارے میں یہ دونوں موجود رہتی ہیں جو اس کی ہمہ جہتی کا ثبوت ہوتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، ''شہرِ بے مثال''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۳-۱۲۴

۲۔ بانو قدسیہ، ''حاصل گھاٹ''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۱-۱۳۲

۳۔ ایضاً، ص ۱۳۲

کتابیات

بنیادی کتب

۱۔ بانو قدسیہ، ’’حاصل گھاٹ‘‘، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۲۔ بانو قدسیہ، ’’راجہ گدھ‘‘، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۳۔ بانو قدسیہ، ’’شہرِ بے مثال‘‘، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

ثانوی کتب

۱۔ احسان اکبر، ’’پاکستانی ناول- ہیئت، رجحان اور امکان‘‘، مشمولہ ’’پاکستانی ادب‘‘ تنقید، مرتّبہ: رشید امجد، فاروق علی، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۰ء

۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ’’ادبی تخلیق اور ناول‘‘، کراچی: مکتبہ اُسلوب، ۱۹۶۳ء

۳۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ’’اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ‘‘، لاہور: اُردو اکیڈمی، ۱۹۵۱ء

۴۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ’’ناول کیا ہے‘‘، کراچی: الکتاب، ۱۹۶۵ء

۵۔ ارشد رضوی، ’’عمرانیات‘‘، لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۸۳ء

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ’’نئے جائزے‘‘، لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ’’ادب، کلچر اور مسائل‘‘، کراچی: رائل بک کمپنی، ۱۹۸۶ء

۸۔ حسرت کاسگنجوی، ’’بیسوی صدی میں اُردو ادب‘‘، کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء

۹۔ خالد بشیر احمد، ’’جدید کتابِ شہریت‘‘، لاہور: عزیز پبلشرز، ۱۹۹۳ء

۱۰۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، ’’انفرادی اور معاشرتی نفسیات‘‘، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۱۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر (مرتّب)،''پاکستانی ادب ۱۹۹۰ء، انتخاب نثر''، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء

۱۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر (مرتّب)،''پاکستانی ثقافت''، اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۹ء

۱۳۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر،''عصری ادب اور سماجی رجحانات''، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء

۱۴۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر،''تہذیب وتخلیق''، مکتبہ جدید ادب، ۱۹۶۶ء

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر،''پاکستان میں اُردو ناول سال بہ سال (سالانہ ادبی جائزے)''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر،''داستان اور ناول''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۱۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر،''ناول نگاری''، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۶ء

۱۸۔ سیّد حسین جعفری (مرتّب)،''پاکستانی معاشرہ اور ادب''، کراچی: اہتمام پاکستان سٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، س۔ن

۱۹۔ شہزاد منظر،''پاکستان میں اُردو ناول کے پچاس سال''، مرتّبہ ڈاکٹر نوازش علی، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۰۲ء

۲۰۔ صالحہ زریں،''اُردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)''، لکھنؤ: نصرت پبلشرز، ۲۰۰۲ء

۲۱۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر،''رشید امجد کے افسانوں کا فنّی وفکری مطالعہ''، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء

۲۲۔ عبدالحمید تگہ، پروفیسر،''عمرانی اصول''، ملتان: اسماعیل برادرز پبلشرز، ۱۹۸۴ء

۲۳۔ عبدالسّلام، ڈاکٹر،''اُردو ناول بیسویں صدی میں''، لاہور: اُردو اکیڈمی، س۔ن

۲۴۔ عبدالسّلام، ڈاکٹر،''ناول کی تاریخ وتنقید''، لاہور: اُردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

۲۵۔ عبدالسّلام، ڈاکٹر،''ہمارا اُردو ناول منزل بہ منزل''، لاہور: قمر کتاب گھر، ۱۹۸۵ء

۲۶۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر،''اُردو ناول میں تانیثیت''، ملتان: شعبۂ اُردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء

۲۷۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر،''اُردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر''، لاہور: مطبع جامع پنجاب، ۱۹۶۶ء

۲۸۔ فیض احمد فیض (مرتّب)،''ہماری قومی ثقافت''، کراچی: پرنٹنگ پریس محل، ۱۹۷۶ء

۲۹۔ محمد اقبال،''عمرانیات''، لاہور: عزیز پبلشرز

۳۰۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر،''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۳ء

۳۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''اُردو ناول کے چند اہم زاویے''، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۳ء

۳۲۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۹۷ء

۳۳۔ ممتاز مفتی، ''اوکھے لوگ''، لاہور: یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء

۳۴۔ نیلم فرزانہ، ''اُردو ادب کی خواتین ناول نگار''، لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲ء

۳۵۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، ''بیسویں صدی میں اُردو ناول''، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۲۰۰۰ء

مقالہ جات

۱۔ بشریٰ پروین، ''پاکستانی ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء)''، اسلام آباد: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

۲۔ صادق حسین، ''پاکستانی ناول پر جدید تحریکات کے اثرات''، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

۳۔ ظہور احمد، ''پاکستان میں اُردو ناول (۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۰ء)''، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

4. "Exploring Intergeneration Changes in Family Values", Farwa Dawood, Islamabad: Quaid-i-Azam University, 2008

انسائیکلوپیڈیا

۱۔ انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز

English Books

1. Donald Light Suzane Keller, Craig Calhown, "Sociology", 5th ed, New York: Alford A. Knoph, 1989

2. Elliot and Merrill, "Sociology Disorganization", edited by Edgar F. Borgatta, 4th ed, New York: Harper and Row Publishers, 1961

3. Emory S. Bogardus, "Sociology", The Mac Millan Company, 1966

4. Floyd L. Ruch, "Psychology and Life"

5. Francis E. Merrill, "Society ad Culture", Prentice Hall, 1983

6. Francis J. Brown, "Education Sociology", 2nd ed. Tokyo: Charles E. Tuttle Company

7. John F. Cuber, "Sociology"

8. John M. Shepard, Harwin L. Voss, "Social Problems", New York: Mac Millan Publishing Company, Inc, 1978

9. John W. Santruck, "Child Development", 7th ed.

10. Kingsley Davis, "Human Society", Delhi: Surjeet Publication, reprint 2007

11. Krech David, "Theory and Problem of Social Psychology"

12. Lewis A. Cose, Bernard Rosenberg, "Sociological Theory", New York: The Mac Millan Company, 1966

13. Micheal Hughes, Carolyn J. Kroheler, James W. Vander Zander, "Sociology: The Core", 5th ed., New York: McGraw Hill College, 1999

14. Paul B. Horton, Chester L. Hunt, "Sociology" 5th ed, McGraw Hill Book Company, 1964

15. Paul Henry Mussen, John Jane Way Conger, "Child Development and Personality", 2nd ed, New York: Harper and Row, Tokyo: John Weather Hill, Inc, 1965

16. Pitiram A. Sorokin, "Society, Culture and Personality", New York: Cooper Square Publishers, Inc, 1962

17. R. M. Maciver, "Society", London: Mac Millan and Company Ltd, 1962

18. Ralph Linton, "The Study of Man", London: Peterowen, 1965

19. "Social Psychology, Readings and Perspective", Chicago: Rand Mc Nally and Company, 1969

20. "Society Today", CRM Books, California: Del Mar, 1971

21. Sumner, "Folk Way", Grin and Company, 1940

22. Thoules, "General and Social Psychology"

Internet

1. www.health.state.ny.us/nysdoh/provider/death.htm

2. www.washingtonpost.com/wp-dyn/content/article/2005/04/30/AR2005043000108.html

3. www.dailymail.co.uk/femail/article-392846/Traditional-families-hit-declining-morals-say-mothers.html

4. http://en.wikipedia.org/wiki/Value (personal and cultural)

5. www.library.com